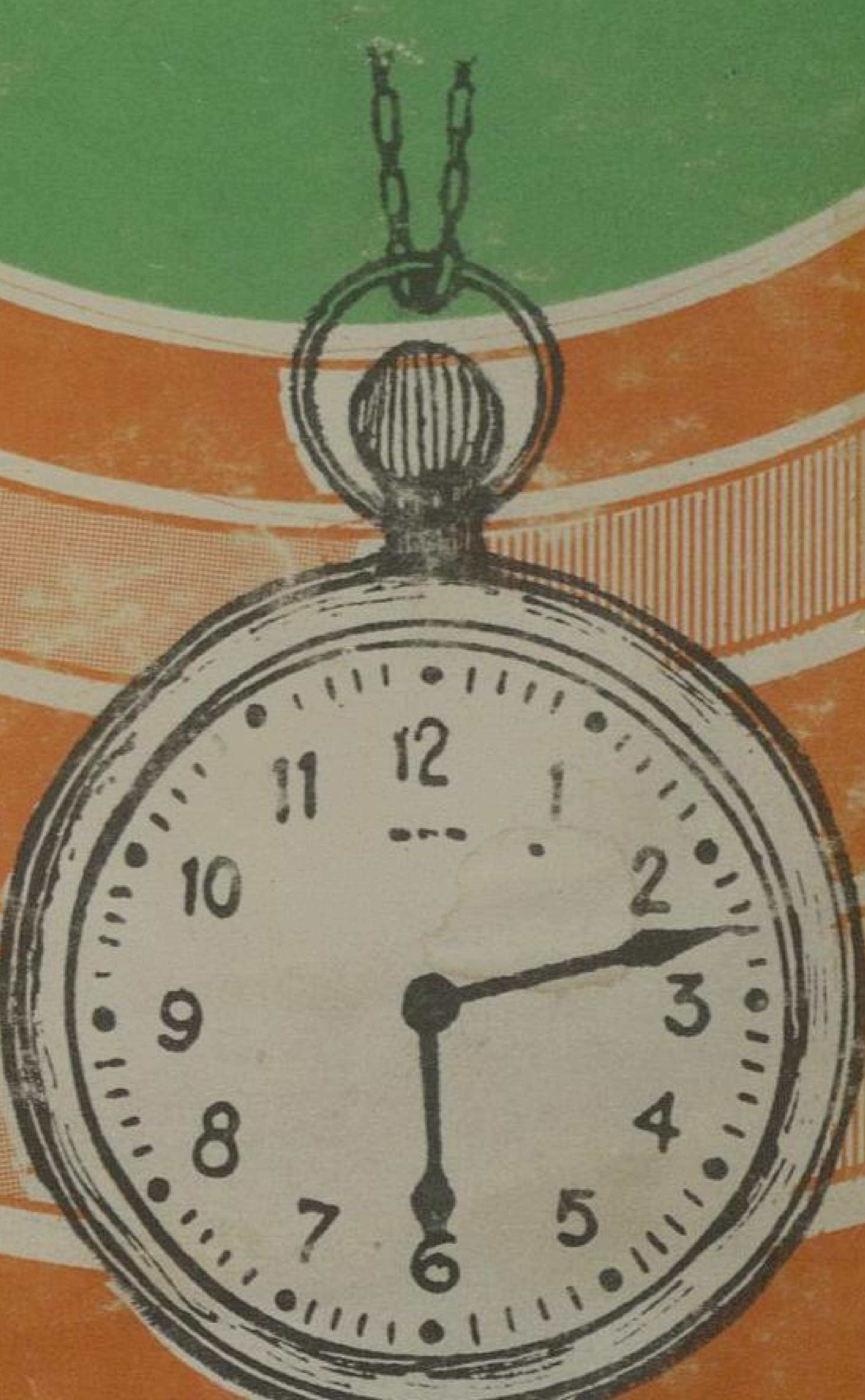
مولانا عبد الماجد

دریابادی

آپ بیتی



اشد ضروری

"آپ بیتی" کے قارئین کرام سے گذارش ہے
کہ براہ کرم مطالعہ کے وقت درج ذیل صفحات
کو اس ترتیب سے پڑھیں
صفحہ نمبر ۱۲۱ کے بعد ۱۲۳ پڑھیں اس کے بعد
صفحہ ۱۲۲ پھر ۱۲۴ کا مطالعہ فرمائیں۔
اسی طرح صفحہ نمبر ۱۲۶ کے بعد ۱۲۹ اس کے بعد ۱۲۸
پھر ۱۲۷ اور اس کے بعد ۱۳۰
کاپی جوڑتے وقت ان صفحات کی ترتیب غلط ہو گئی ہے
اس کے لیے ہم نہایت معذرت خواہ ہیں۔

۱۵ اپریل ۱۹۷۹ء

فلاح الدین قریشی
ناشر

ص 15 ٹیگور - اور تاثیر و درپردہ مسلمان تھے۔

فلسفہ اجتماع - فلسفہ جذبات - تاریخ اخلاق یورپ - مقالات برکلے
زود پشیماں - مناظرہ لا ابے دہام سے بکی - سائیکالوجی آف لیڈرشپ
کرامت مصحفی - فیہ ما فیہ امام غزالی - سفر حجاز - قصص و مسائل
مقالات ماجد - انشائے ماجد - عشرت پیشتر ... - نشریات ماجد - مکتوبات ... - خطوط مشاہیر
حکیم الامت / نقوش و تاثرات - محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق - تاثرات - خطبات ...
الحیوانات فی القرآن یا حیوانات قرآنی - ڈھائی ہفتے پاکستان میں
ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی - اعلام القرآن یا قرآنی شخصیات - الاعلام ...
سیرت نبوی قرآنی - خطبات ماجدی یا سیرت نبوی قرآنی - بشریت انبیاء
تفسیر ... ترجمہ - ... الہی - فلسفہ اجتماع - مکالمات برکلے
تفسیر قرآن ... شدہ ایڈیشن

سلسلۂ مطبوعات مکتبہ شاداب

۲

آپ بیتی

اُردو کے مشہور صاحب طرز ادیب اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ کے قلم سے نکلی ہوئی "آپ بیتی" اور خود نوشت سوانح عمری جس میں گزشتہ لکھنؤ اور اودھ کی ثقافت و تہذیب، مشاہیر دین و ادب اور ممتاز معاصرین و احباب کے جیتے جاگتے تذکرے اور چلتی پھرتی تصویریں بھی موجود ہیں "آپ بیتی" میں مولانا کے جادو نگار قلم نے اپنی گزشتہ زندگی کے ساتھ عہد رفتہ کو اس طرح آواز دی ہے کہ وہ حال معلوم ہونے لگتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

شاداب بک سینٹر

۳۱۷ع ذوالقرنین چیمبر، گنپت روڈ، ـــ لاہور

پہلا اڈیشن

۱۳۹۹ھ ــــ ۱۹۷۹ء

ناشر ...... سعادت الدین قریشی

طباعت ...... منظور پریس، لاہور

صفحات ۴۰۲

قیمت ...... ۳۰ روپے

ملنے کا پتہ

شاداب بک سینٹر

۳۱۷ ذوالقرنین چیمبر، گنپت روڈ، لاہور

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ کی (جن کو بقول مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مرحوم کے اس دور میں ادب وانشا کے قلمرو کی حکمرانی نہیں، بلکہ اس عہد کی صاحبقرانی ملی تھی) کسی کتاب پر مقدمہ یا پیش لفظ لکھنے کے خیال سے اُن سے اور ان تمام اہل نظر سے شرم آتی تھی جو ان کے مقام ورتبہ سے واقف تھے، اب ان کی زندگی کے بعد اس کی جرأت کرنے سے ان کی روح سے شرم آتی ہے۔ لیکن یہ قصور یا گستاخی ایک مرتبہ ان کی زندگی میں بھی ہو چکی ہے، اور ان کے علم میں آ چکی ہے، اور اب ان کی "آپ بیتی" پر چند لفظ لکھنے کی جرأت یا گستاخی پھر ہو رہی ہے، مگر اس کے ذمہ دار برادر مکرم مولوی حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی بی، اے مدیر "صدق جدید" ہیں، جنھوں نے یہ مشکل اور نازک کام اس کم سواد کے سپرد کیا، اور اس کے لئے اصرار فرمایا، یا "مکتبہ فردوس" کے ذمہ دار جنھوں نے اس کتاب کی طباعت واشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔

بہر حال بڑے تامل اور معذرت کے ساتھ یہ چند سطریں سپرد قلم کی جا رہی ہیں، عُرفی نے اپنے خاص انداز میں ایسے سب "دخل در معقولات" کرنے والوں کے لئے ہمیشہ کیلئے

معذرت کردی ہے

امید ہست کہ بیگانگیٔ عُرفی را
بہ دوستی سخنہائے آشنا بخشند

اگر یہ سوال کیا جائے کہ ادب وانشا، اور تاریخ و تذکرہ کے اصناف میں سب سے زیادہ دل چسپ، دلآویز، خوش گوار، اور شوق انگیز صنف کون سی ہے، تو شاید اکثر اہل ذوق کا جواب یہی ہوگا، کہ ایک اچھے صاحب قلم اور ادیب کے قلم سے نکلی ہوئی "آپ بیتی"، یہ انسانی نفسیات کا عجیب معمہ ہے، کہ انسان کو دوسرے کی کہانی میں بعض اوقات وہ مزہ آتا ہے، جو اپنی کہانی میں آتا ہے، خاص طور پر جب وہ کہانی کہانی کی طرح سنائی جائے، وہ حکمت و فلسفہ اور پند و موعظت کے عناصر، اور ادب وانشا کے تکلفات سے زیادہ گراں بار نہ ہو، اس میں سادگی اور بے ساختگی، جذبات و احساسات کی ترجمانی، واقعات و مناظر کی سادہ تصویر کشی، غلطیوں اور کوتاہیوں کا کہیں اظہار یا کہیں اقرار، آورد سے زیادہ آمد، اور رہایت سے زیادہ حکایت ہو، اس کو لکھنے والے نے اپنی یاد دوسروں کی بھاری بھرکم تصنیفات میں اضافہ کرنے کے لئے نہ لکھا ہو، بلکہ بھولی ہوئی یادیں تازہ کرنے، مٹے ہوئے نقوش اجاگر کرنے، خود اپنی مسرت، حسرت، عبرت اور اپنے عزیزوں، افراد خاندان، اور نیازمندوں کو اپنے سے واقف کرنے اور اپنی زندگی کی داستان سنانے کے لئے لکھا ہو، جو محبت و تعلق کا کبھی کھلا ہوا، کبھی پوشیدہ اور خاموش مطالبہ اور فطرت انسانی کا خاصہ ہے، اور ایک سلیم الفطرت انسان میں کبھی کبھی یہ جذبہ خود پیدا ہوتا ہے، کہ وہ اپنے عزیزوں اور چھوٹوں کو اپنی زندگی کے واردات، حوادث اور تجربے خود سُنائے، اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو دنیا کا ادب مصنوعی

اور خارجی بن کر رہ جاتا، اور ہم ادب و شاعری کے حسین ترین حصے سے محروم رہ جاتے،
اب یہ اپنا اپنا سلیقہ، سنانے والے کی توفیق اور سننے والے کی قسمت ہے کہ یہ داستان
اپنی صداقت اور دیانت کے ساتھ بامزا، سبق آموز اور مفید ہو، اور یہیں ایک عامی اور
عالم، کم سواد اور دانشور، اور ادیب و غیر ادیب کا فرق ظاہر ہوتا ہے، لیکن یہ بہرحال
ضروری ہے کہ پند و موعظت اور حکمت آموزی کا تناسب اس میں اتنا ہی ہو جتنا
کھانے میں نمک کا ہوتا ہے، ورنہ اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا، جو پند ناموں
اور فلسفہ کی کتابوں کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے، اور اس سے وہ مقصد فوت ہو جائے گا،
جو "آپ بیتی" لکھنے والے کے عام طور پر پیش نظر ہوتا ہے۔

اس آپ بیتی میں اگر یہ چند خصوصیات اور جمع ہو جائیں تو پھر "سونے پر سہاگہ" ہو
جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اس کا لکھنے والا زبان کا اداشناس، اپنے زمانہ اور اہل زمانہ کا مزاج
شناس، کہنہ مشق اور صاحب طرز ادیب بھی ہو، قدرت نے اس کو قوت مشاہدہ کی
دولت سے مالا مال کیا ہو، وہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی بڑے غور
کی نظر سے دیکھتا ہو، اور ان سے بڑے بڑے نتائج نکال لیتا ہو، گرد و پیش کی دنیا سے
واقف ہونے کا شوق رکھتا ہو، اس کی اچھی چیزوں کی دل سے قدر کرتا ہو، اور ان کے
متعلق بے تکلف اظہار کرنے میں کوئی شرم مانع نہ ہو، ناگوار اور تکلیف دہ واقعات سے
ناگواری محسوس کرتا ہو، اور اس کے اظہار میں بھی وہ کسی تکلف سے کام نہ لیتا ہو،
نامور مصنف، عظیم دانشور، مانے ہوئے مفسر، معلم اخلاق، اور ماہر فلسفہ و نفسیات
ہونے کے باوجود، وہ معصوم بچپن کی، پھر اٹھتی ہوئی جوانی کی، پھر ڈھلتی ہوئی عمر کی
وہ کیفیتیں، اور سطح آب پر پیدا ہونے والے ان تموجات اور اشکال و صور کو جو حباب

کی طرح اٹھیں اور حباب کی طرح بیٹھ گئیں، بھولا نہ ہو، اور اب عمر و علم کی اس پختگی اور شہرت و عظمت کے اس مقام پر پہونچ کر جس پر وہ برسوں سے فائز ہے، ان کے ذکر کرنے میں وہ کوئی حقارت، یا حیا محسوس نہ کرے، بلکہ موئے قلم سے ان کی تصویر اس طرح کھینچے کہ پڑھنے والے اس کو پڑھ کر جھوم جائیں اور ان کو اپنا گزرا ہوا زمانہ، اپنا معصوم بچپن، اور اپنی بیتی جوانی یاد آجائے، اور اس زمانہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے، جو نہ تاریخ میں محفوظ ہے، نہ ادب کی کتابوں میں۔

مثال کے طور پر اس کتاب میں رسم بسم اللہ کی تصویر کشی دیکھئے، جو مسلمان شرفاء اور کھاتے پیتے گھرانوں میں بڑے اہتمام سے منائی جاتی تھی، اور جو اسلامی تہذیب کی ایک برکت تھی، عہد طفلی کے تذکرہ کے موقعوں پر مولانا کے جادو نگار قلم نے نہ صرف گزرے ہوئے زمانہ کے مناظر کو آنکھوں کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے، بلکہ ان کے قلم سے وہ جملے بھی نکل گئے ہیں، جو سادگی کے باوجود ادب و انشاء کا نمونہ ہیں، مثلاً وہ دایہ کی گود میں جانے کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"ہائے وہ دایہ کی گود میں جانے کی لذت! اب کیا بیان ہو؟ وہ لذت جس کا بدل نہ جوانی کی گرمیاں دے سکیں، نہ بڑھاپے کی خنکیاں"۔

اپنے بچپن اور اس کے واقعات کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے اس جملہ میں کتنا درد بھر دیا ہے۔

"غضب کی حسرت ناک سچائی بھر دی ہے کسی نے اس مصرعہ میں ع دو دن کو اے جوانی دیدے اُدھار بچپن"۔

زمین داری، پھر اودھ کی زمین داری کا دَور گزر گیا، جنھوں نے وہ دَور نہیں دیکھا

ان کو ہزار بتایا جائے، وہ اس کا صحیح تصور ہی نہیں کر سکتے، اس کی کمزوریاں اور خامیاں اور ان میں دبی ہوئی کچھ خوبیاں، ایک چھوٹی سی نوابی اور ایک خیالی بادشاہی، سخت گیری کے ساتھ رعایا کی کچھ خبر گیری بھی، کچھ ہمدردی بھی، زمین داروں کے لڑکوں کا احساس برتری، اس زمانہ کی مرفہ الحالی اور بے فکری، یہ سب دیکھنا چاہیں تو اس حصّہ کو دیکھیں جہاں مولانا نے زمین دار معاشرے کے گھروں کا نقشہ کھینچا ہے۔

ریل کا سفر کون نہیں کرتا اور اب تو روزمرہ کا معمول ہے لیکن کتنے آدمیوں کو اپنے ریل کے ابتدائی سفروں کے تاثرات یاد ہوں گے، اور کتنے ان کو بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں؟ یہی ایک پیدائشی ادیب، اور صاحب فن کا امتیاز ہے کہ وہ مردہ تصویروں میں جان ڈال دے، اور تحریری نقوش کو متحرک بنا دے۔

مولانا روزمرہ کے واقعات میں بھی معرفت و تصوف کے نکتے پیدا کرتے ہیں، اور علم الاجتماع، تمدن اور فلسفہ، تاریخ کے بعض ایسے حقائق بیان کر دیتے ہیں، جو ہزاروں صفحات کا نچوڑ، اور عمر بھر کے تجربے کا عطر ہوتا ہے، مثلاً ایک موقع پر لکھتے ہیں۔

"سلسلۂ سخن میں ایک بات اور سنتے چلئے، مصنف و مفکر بہترین بھی ہو اپنے زمانہ کا بندہ ہوتا ہے، کیسے ممکن ہے کہ کوئی کتاب بشری دل و دماغ سے، دو چار سو سال قبل سے نکلی ہوئی آج کے مسلمات کا ساتھ دے سکے"!

مولانا نے اپنے اسکول کے داخلہ کے تاثرات، ایک ادیب اور ماہر نفسیات کی طرح جس کو قوت مشاہدہ بھی بھرپور طریقہ پر ملی ہو، اور بچپن کی ہر چیز بھی اس کو جان کی طرح عزیز ہو، بڑی تفصیل اور دلچسپی کے ساتھ قلم بند کئے ہیں، وہ سیتاپور کے بیتے ہوئے دن کبھی نہیں بھولتے، لیکن اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ لکھنؤ کا ترقی یافتہ اور بوقلموں

ماحول اپنا اثر کئے بغیر نہ رہا، وہ لکھتے ہیں۔

"نئی نئی دل چسپیاں لکھنؤ میں پیدا ہوتی گئیں اور سیتاپور کی دل چسپیاں ان کے آگے سرد، بلکہ گرد ہوتی گئیں"۔

پھر وہ عمر کی منزلوں، لڑکپن، جوانی، اور بڑھاپے کے قدرتی نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خاص ادبی انداز میں لکھتے ہیں۔

"فاطر کائنات نے اپنی پیدا کی ہوئی دنیا کا نظام کچھ ایسا رکھ دیا ہے لڑکپن کو جوانی اور جوانی کو ضعیفی کس تیزی کے ساتھ ڈھکیلتی، ریلتی پیلتی چلی جاتی ہے"۔

اس کتاب کے بعض جملے سادگی و پرکاری کا نمونہ ہیں، واقعہ نگاری بھی، اور انشا پردازی بھی، ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"شوق کے پیروں سے دوڑ کر نہیں، شوق کے پَروں سے اُڑ کر اُس کے یہاں پہونچا"۔

ازدواجی زندگی کا باب انسانی زندگی کا ایک اہم فطری اور شرعی باب ہے، جس کے بغیر کوئی "آپ بیتی" مکمل نہیں اس کے بیان کرنے میں بھی مولانا کی حیثیت ایک ادیب، ماہر نفسیات و معلم اخلاق، ایک حساس و محبت آشنا انسان اور ایک عالم دین کی ہے۔

غرض یہ کتاب جو مولانا نے اپنی زندگی کے آخری دَور میں لکھی اور اس پر بار بار نظر ثانی فرمائی، ادبی، اخلاقی اور تاریخی تینوں لحاظ سے قدر و قیمت کی حامل ہے، مولانا نے اس میں اپنے دَورِ الحاد کا قصہ بھی پوری صفائی اور اخلاقی جرأت کے ساتھ سنایا ہے، اس کے اسباب و عوامل بھی بیان کئے ہیں، جس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں،

پھر دین فطرت کی طرف بازگشت، اور اس کے اسباب و دواعی کا بھی ذکر کیا ہے، اپنے خاندانی بزرگوں کے ساتھ، اپنے قریبوں، محسنوں، دوستوں، اور مخالفین، ناقدین سب کا ذکر فراخ دلی اور صاف گوئی کے ساتھ کیا ہے، اور کسی کی رو رعایت نہیں کی، ان کا بھی ذکر کیا ہے جن سے ان کو تکلیف پہونچی، ان کا بھی ذکر کیا ہے جن کے حق میں ان سے زیادتی ہوئی، غرض یہ کتاب ان کی زندگی کا مرقع ہے ہی، اس دور اور معاشرت کا بھی آئینہ ہے، جس میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور زندگی کا سفر طے کیا، کسی زمانہ میں بلکہ قریبی زمانہ میں ان اہل قلم اور مؤرخوں کو بھی اس سے بڑی مدد ملے گی، جو اس دَور کے تمدن و معاشرت پر کچھ لکھنا چاہیں گے، اس کتاب میں ان کو بعض ایسے اشارے ملیں گے جن سے وہ بہت کام لے سکتے ہیں، اور اس زمانہ کی بولتی ہوئی تصویر پیش کر سکتے ہیں، ادب کے طالب علموں بلکہ ادب کے استادوں اور معلموں کو بھی اس میں ادب و زبان کی خوبیاں، لکھنؤ اور اودھ کے محاورے، اساتذہ کے آبدار اشعار اور جاندار مصرعے، اردو ادب و زبان کے گزشتہ دور، اور لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں سے تعارف ہوگا، دین و اخلاق اور اصلاح و تربیت نفس کے سلسلہ میں بھی اس سے رہنمائی حاصل ہوگی، اور اس سے ظاہری و معنوی دونوں طرح سے یہ کتاب ہر طبقہ کے لئے دل چسپ دل کش، اور دلآویز ہوگی ع

بہ رنگ ارباب صورت را بہ بو ارباب معنی را

۳۰ رمئی ۱۹۷۸ء ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ

دیباچہ

عزیزوں، دوستوں، مخلصوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کا اصرار ہے کہ ۸۴، ۸۵ سال کی عمر کا ایک پیرِ نابالغ اپنی آپ بیتی دوسروں کو سنائے اور نادانیوں، سفاہتوں کی لمبی سرگزشت دنیا کے سامنے اپنی زبان سے دہرائے! ــــ اللہ جانے انسان کو انسان کی پستیوں، رسوائیوں، فضیحتوں کی داستان سننے میں کیا مزہ آتا ہے! اور یہاں تو خیریت سے سادہ دل بندوں کا ایک جمِّ غفیر اس دھوکے میں پڑا ہوا ہے کہ جلوے کسی عالم، فاضل، اہل اللہ کے ان صفحات میں دیکھنے میں آئیں گے اور موعظے کسی حکیم و عارف باللہ کے سننے میں آئیں گے! ــــ اللہ اللہ! اس عالمِ آب و گل میں کسی کی صفت ستّاری سے کیسے کیسے پردے، عیبیوں، مجرموں، خاطیوں کے چہروں پر، اور اچھے اچھے دانش و بصیرت رکھنے والوں کی فہم و نظر پر ڈال رکھے ہیں؟

بہر حال خوش فہمیوں میں مبتلا رہنے والے، اور اپنے کو خوش گمانیوں میں ڈالے رکھنے والے، اپنے فعل و عمل کے ذمہ دار و مختار ہیں، یہاں تو صرف یہ دعا اپنے پیدا کرنے والے سے ہے کہ جو کچھ آپ بیتی ہے، اسے بشری حد تک بے کم و کاست سپردِ قلم کر ڈالنے کی توفیق اس بدہمت کو ہو پائے ــــ "حدِ بشری" کی قید اس لئے ضروری ہے کہ راست گوئی کا جو حق ہے، اسے زبان قلم سے اپنے حق میں ادا کرنا بجز نبیِ معصوم کے اور کس کے بس کی بات ہے؟ ہم ایسوں کے لئے یہی بہت ہے کہ قلم کا دامن کذب صریح و افترار مبین سے آلودہ نہ ہونے پائے۔ بہر حال آرزو و کوشش کے ساتھ دعا بھی

بندے کی یہی ہے اور اس کا قبول کرنا اسی کے ہاتھ میں ہے، جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔

تسوید و تحریر کی پہلی بنیاد تو جولائی ۵۵ء میں پڑی، اس وقت خود گزشت کی ترتیب تاریخی پیش نظر تھی مگر اس طرح تحریر بڑی ہی طویل و ضخیم ہوتی جا رہی تھی، چند ہی ورق کے تجربے کے بعد کام روک دینا پڑا۔ اور جنوری ۵۶ء کے اخیر سے نقشہ بدل کر اور طوالت سے بچ کر، قلم برداشتہ از سر نو لکھنا شروع کر دیا۔ اس کے لئے وقت پابندی کے ساتھ روزانہ نہ نکل سکا۔ وقفے اور ناغے درمیان میں کثرت سے اور لمبے لمبے ہوتے رہے، جوں توں مسودۂ اول ۴/ اگست ۵۸ء کو ختم ہو گیا لکھنے کی واقعی مدّت کل ۵ مہینے کی رہی، مسودہ کٹ پٹ بہت گیا تھا، میرے بعد کسی کے چلائے نہ چلتا۔ اس لئے یوم جمعہ ۲۶/ جون ۵۶ء (۱۸/ ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ) کو اسے اپنے ہاتھ سے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ صفائی محض نقل نہ رہی، اضافہ، ترمیم، کانٹ چھانٹ اچھی خاصی ہو گئی اور تکمیل ستمبر ۵۹ء میں ہو پائی۔ نظر ثانی کا سلسلہ ہر سال دو سال کے بعد وقتاً فوقتاً ۶۴ء اور ۶۵ء کی نظر ثانی اچھی طرح یاد ہے اور اب تازہ ترین نظر ثانی کی نوبت ۶۷ء میں آ رہی ہے، جب سن کا ۷۴ واں سال ختم ہو کر ۷۵ واں شروع ہونے کو ہے۔ اور یہ سطریں اللہ کا نام لے کر آج جمعرات ۳/ فروری ۶۷ء (۲۱/ شوال ۸۶ھ) کو ختم ہو رہی ہیں اور آئندہ کا حال کون جانے۔

کتاب اغلب ہے کہ اگر چھپی بھی تو میری زندگی میں نہیں، میرے بعد ہی چھپ سکے گی۔ میری تحریریں میری زندگی ہی میں زیادہ تر میری بدخطی کے باعث جب غلط در غلط، بلکہ کہیے کہ کبھی کبھی مسخ ہو کر چھپا کیں، تو ظاہر ہے کہ اپنے بعد صحت طبع و کتابت کی امید بعید بھی کیسے کر سکتا ہوں۔

حسب روایت شیخ سعدیؒ، لوگوں نے لقمان سے پوچھا کہ یہ تمیز و دانش کس سے سیکھی؟ جواب ملا کہ بے تمیزوں اور بے ہنروں سے، جو حماقتیں ان میں دیکھیں بس ان سے احتیاط برتی ـــــــ عجب کیا کہ اللہ کے بعض بندے کچھ اسی نوعیت کے سبق اس خرافات نگاری سے حاصل کرلیں، اور اس کوڑے بلکہ گھورے کے ڈھیر کو کریدکر عبرت کے کچھ موتی اس سے چن لیں، اور جس نے ساری عمر تباہ کاری کی نذر کردی، اس کے بگاڑ سے اپنے بناؤ کا کچھ سامان فراہم کرلیں۔

بہرحال و بہرصورت لکھنے والا اپنے حق میں دعائے خیر و مغفرت کی درخواست اپنے ہر پڑھنے والے سے بہ منت و لجاجت کررہا ہے۔ دعا فرمائیے، اور اپنا اجر اپنے رب سے پائیے۔

عبدالماجد

۳ فروری ۱۹۶۷ء

ایک ضروری تمہید

یہ ورق پڑھنے والے کے ہاتھ میں کب پہنچیں، اور زمانہ اس وقت تک کتنا آگے بڑھ چکا ہو۔ اس لیے شروع ہی میں دو چار باتیں بہ طور تمہید جان لینا ضروری ہیں کہ بغیر ان کے مطلب و مفہوم کسی طرح واضح نہ ہو سکے گا۔

اس مسودہ کی تحریر کا زمانہ سنہ ۱۹۶۷ء اور جو حالات اس میں درج ہیں، وہ صرف دس ہی بیس سال قبل کے نہیں بلکہ ۵۰، ۷۰، ۸۰ سال قبل تک کے بھی ہیں، تو آگے پڑھنے سے قبل کچھ تو سمجھ لیجئے کہ وہ زمانہ کیا اور کیسا تھا، اور اس کے نمایاں خط و خال کیا تھے؟

صرف میں آنے والی چیزیں، کھانے پینے کی، پہننے اوڑھنے کی یا اور کسی قسم کی کیا تھیں۔

اٹھارہویں صدی کے اخیر اور انیسویں صدی کے شروع میں قیمتیں نہایت ارزاں تھیں۔ رفتہ رفتہ قیمتیں بڑھنا اور چڑھنا شروع ہوئیں۔ یہاں تک کہ دُنیا کی دوسری جنگ عظیم جب پانچ سال بعد سنہ ۱۹۴۶ء میں ختم ہوئی تو چیزوں کے نرخ دو گنے، ڈھائی گنے، بلکہ تگنے ہو گئے تھے۔ اگست سنہ ۴۷ء میں جب انگریزی حکومت ہندوستان سے اٹھی اور ملک کی حکمرانی خود ملک والوں کے قبضہ میں آئی، اس کے بعد سے تو گرانی کی جیسے کوئی حد و نہایت ہی نہیں رہ گئی۔ چنانچہ اب سنہ ۶۷ء میں پرانی قیمتیں آٹھ گنی نہیں بلکہ دس گنی ہو گئی ہیں اور اب بھی ان کے رُکنے اور ٹھہرنے کے کوئی آثار نہیں بلکہ آثار مزید گرانی، اور گرانی در گرانی ہی کے ہیں اور روپیہ کی قیمت قدرتاً اسی تناسب سے اُترتی گئی

ہے، چنانچہ میرے بچپن میں پچاس روپے ماہوار کی آمدنی والا اوسط درجہ کا خوش حال سمجھا جاتا تھا۔ اب اتنی مطمئن زندگی چار ساڑھے چار سو ماہوار آمدنی رکھنے والے کو بھی نصیب نہیں۔ غلہ، کپڑا سوتی اور ریشمی، گوشت، گھی، دودھ، دہی، نمک، شکر، ترکاری، پھل، جوتا، کپڑا، سونا، چاندی، کوئلہ، لکڑی، کوئی چیز بھی شدید ترین گرانی سے محفوظ نہیں ـــــ اور یہی حال ریل کے کرایہ، ڈاک کے محصول، اور سارے سرکاری ٹیکسوں کا ہے۔

غلہ پر یہ آفت سب سے زیادہ ہے اور غلہ میں بھی گیہوں اور چاول پر سب سے بڑھ کر۔

۱۹۵۱ء تک کم سے کم ہمارے صوبہ میں (اور اب صوبہ کا نام ہی بدل کر "ریاست" پڑ گیا ہے) زمین داری کا رواج قائم تھا۔ اور جو زیادہ بڑے زمین دار تھے وہ تعلقدار کہلاتے تھے، زمین دار جو معمولی درجہ کے ہوتے تھے، وہ بھی خوش حال ہوتے تھے اور بڑے زمین داروں کا تو کہنا ہی کیا۔ اور جو طبقہ تعلقداروں کا تھا، ان میں راجہ، مہاراجہ، نواب ہوتے تھے، اور دولت کی ریل پیل ان کے ہاں رہتی تھی۔ نظام حکومت میں انقلاب کے بعد یہ ادارہ حکم سرکار سے توڑ دیا گیا۔ اور کتنے زمین دار خاندان دیکھتے دیکھتے مفلوک الحال ہو گئے۔ جو کچھ معاوضہ انھیں ملا وہ ان کی پچھلی آمدنیوں سے کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتا تھا۔ خود ہمارا خاندان بھی ایک حد تک اسی زد میں آیا۔

میرے لڑکپن تک سواریاں ریل کے علاوہ، بگھی فٹن پالکی گاڑی، لینڈو، ٹمٹم، اِکّے بیل گاڑی اور اُونٹ گاڑی تھیں، سواری کے جانور گھوڑے، ہاتھی اور اونٹ تھے، اور زنانی سواریاں ڈولی، پالکی، فینس اور میانہ (جو پہلے) کی تھیں، جنھیں (ایک خاص

قوم) کہار اٹھا کر لے چلتے تھے، رفتہ رفتہ یہ گھٹتی گئیں۔ اور پہلے سائیکلیں آئیں، پھر تانگے اور ان کے بعد رکشے چالو ہوئے۔ موٹر، موٹر سائیکلیں، اسکوٹر کا دور آیا، جیپیں، اور بسیں بھی عام ہو گئیں۔ اور ہوائی جہاز بھی ہر وضع اور ہر سائز کے فضا میں اڑنے لگے اس انقلاب کا اثر تمدن و معاشرت کے ہر شعبہ پر پڑا۔

میرے بچپن میں ہندو وقتاً فوقتاً مسلمان ہوتے رہتے۔ کسی مسلمان کا مرتد ہو کر ہندو دھرم قبول کر لینا ناقابل تصور تھا۔ رفتہ رفتہ آریہ سماجیوں نے کسی کسی کو مُرتد کرنا شروع کیا، اور ایک زمانہ میں تو شدھی کی تحریک بڑے پیمانے پر چل نکلی۔ اس طرح کسی کلمہ گو عورت یا لڑکی کا کسی ہندو یا سکھ کے "عقد" میں چلا جانا ناقابل تصور تھا۔ راج کی تبدیلی کے بعد یہ خواب بھی ایک حقیقت بن گیا۔

پردے کا رواج ہندو گھرانوں میں بھی شرافت و اعزاز کی علامت سمجھا جاتا تھا اور مسلمانوں کے اونچے خاندانوں میں تو پردہ شدت ہی سے نہیں افراط کی حد تک رائج تھا اور تعلیم مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کی برائے نام ہی تھی۔ اور شرم و حیا حدود شریعت و عقل سے بھی تجاوز کئے ہوئے تھی، چنانچہ کوئی شریف بیوی اپنے شوہر کا نام کسی حال میں اپنی زبان پر نہیں لا سکتی تھی، اور شوہر کے نام سے بھی آگے سسرال کا نام سسرالی عزیزوں کے نام شوہر کے نام سے ملتے جلتے نام تک سب اس کے لئے حرام تھے!۔۔۔ دیکھتے دیکھتے صورت حال بالکل بدل کر رہ گئی۔ بڑی بڑی شریف بیویاں یہی نہیں کہ بے تکلف باہر بے پردہ گھومنے پھرنے لگیں بلکہ بے پردگی کے ساتھ بے حجابی بھی عام ہوتی گئی بلکہ نوبت بے ستری کی بھی پہنچ گئی۔

۱۸۸۰ء میں مسلمانوں کی زنانی آبادی میں بی، اے، ام اے، ال ال بی، پی ایچ ڈی

وغیرہ ہر طرف نظر آنے لگی ہیں۔ اور ملازمت اور کاروبار کا کوئی شعبہ، کوئی پیشہ، کوئی عہدہ ان سے خالی نہیں۔

اگست ۱۹۴۷ء تک سارا ہندوستان انگریزوں کے تابع تھا۔ پاکستان بنا تو پنجاب اور بنگال دو دو ٹکڑے ہوکر پاکستان میں شامل ہو گئے اور سندھ و بلوچستان اور صوبہ سرحد وغیرہ تو پورے ہی پاکستان کے جزو بن گئے۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کی آبادی تقریباً دس کروڑ سے گھٹ کر ۴½، ۵ کروڑ رہ گئی ——— خاندان کے خاندان مسلمانوں کے، خصوصاً یوپی کے مسلمانوں کے "اجڑ گئے، مٹ گئے، اور کٹ گئے، ایک بھائی یہاں، دوسرا وہاں۔ باپ اِدھر تو بیٹا اُدھر۔ وہ افراتفری پڑی اور اکھاڑ پچھاڑ ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ اور لکھ لکھا مسلمانوں کی جو جانیں گئیں، عزتیں مٹیں، عصمتیں لٹیں، اور کروڑوں کا مالی نقصان ہوا ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں! ہندوستان کی حکومت سرکاری کاغذوں پر "نامذہبی" قرار پائی۔ لیکن عملاً گاندھی جی اور جواہر لال نہرو وغیرہ کی تتو تھمبو کے باوجود بھی بڑی حد تک ہندو حکومت بن گئی۔ مسلمان ہراس زدہ اور حواس باختہ احساس خودداری کھو بیٹھے۔ اور ہر معرکہ میں "اکثریت" اور حکام اور پولیس کے ہاتھوں پٹنے اور مار کھانے لگے۔

میرے بچپن تک مسلمانوں کا ایک مخصوص معاشرہ تھا، خصوصی آداب و اطوار تھے، خاص قسم کا لباس، خاص قسم کے بال، خاص قسم کے کھانے پینے وغیرہا۔ تغیّر و انقلاب کی آندھی نے یہ سارا شیرازہ منتشر کر دیا پہلے تو انگریزیت کا دَور دَورہ رہا۔ وضع و قطع، مکان و لباس، کھانا پینا سب مغربی طریق کا ہوتا چلا گیا۔ اور پھر اَب ہندو تہذیب و معاشرت کا سیلاب آیا ہے، جو نظام تعلیم و نصاب تعلیم کی مدد سے ساری ہی

انفرادیت اسلامی کو بہائے لئے جارہا ہے۔ احساس کمتری کے ساتھ ساتھ، ہندوؤں کی کھشاجوئی اور خوشامد کا جذبہ پھیلتا چلا جارہا ہے۔ اور معاشرتی، علمی، تہذیب مرعوبیت سے لے کر اعتقادی، اور دینی ارتداد تک کی راہ ہموار ہوگئی ہے۔ میری پیدائش کے وقت انگریزی سرکار کا رعب واقبال دلوں دماغوں پر چھایا ہوا تھا۔ اور اچھائی برائی کا یہی پیمانہ ہاتھ میں تھا۔ یہ کیفیت ۱۹۰۵ء ۱۹۰۶ء تک باقی رہی اس کو پہلا دھچکا تو جاپان کے ہاتھوں سے روس کی شکست سے پہنچا، کہ ایک مشرقی نے مغرب کے غرور کا سر نیچا کیا، پھر ملک میں آزادی کی طلب پیدا ہوئی جس کی بنیاد انگریزی کی تعلیم کے اثر سے چند سال قبل پڑ چکی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں جو نام کے خلیفۃ المسلمین (سلطان ترکی) کے خلاف اٹلی نے طرابلس میں، اور ۱۹۱۲ء میں اور دوسرے ملکوں نے بلقان کی جنگ چھیڑی، اس نے مسلمانوں میں فرنگیوں کے خلاف عام بددلی اور ایک نفرت پیدا کردی۔ مولانا محمد علی کے انگریزی ہفتہ وار کامریڈ اور اُردو روزنامہ ہمدرد نے اور مولانا ابوالکلام کے ہفتہ وار الہلال نے اور مولوی ظفر علی خاں کے روزنامہ زمیندار نے اس تحریک کو ترقی دی۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت وترک موالات پورے جوش وخروش کے ساتھ حکومت برطانیہ کے خلاف شروع ہوگئی اور گرفتاری و قانون شکنی اور سزایابی گاندھی جی کی تلقین کے اثر سے بجائے توہین و ذلت کے دلیل عزت و علامت سرداری بن گئیں۔

اپنے ہاتھ سے کام کرنا اس وقت عیب میں داخل تھا اور جو گھرانے ذرا بھی خوشحال تھے ان میں نوکروں چاکروں کا رواج عام تھا۔ گھر میں اور زنان خانوں میں ماما ئیں اصیلیں اور درمیانی گھرانوں میں "لونڈیاں باندیاں"۔ ہمارا گھر ایک چھوٹے زمین دار کا بھی تھا اور ایک خاصے معزز عہدہ دار کا بھی۔ قدرتاً ہمارے ہاں اندر باہر ملا کر ایک

پوری پلٹن نوکروں کی موجود تھی اور ان ہی میں اناّئیں یعنی دائیاں کھلائیاں بھی داخل تھیں۔ شریعت کے علاوہ اب قانون وقت کے لحاظ سے بھی "لونڈی غلاموں" کا کوئی جواز نہ تھا، لیکن عملاً یہ سب عموماً "زر خرید" ہی کے حکم میں تھے۔ عام انسانی حقوق تک سے محروم گھر یا گھر کے پلے ہوئے جانور ہیں۔ صرف کوئی کوئی آقا شفیق اور رحم دل مل جاتے تھے، اور اُنھیں میں میرے والد مرحوم بھی تھے۔

اُردو کا زور ۴۷ء تک رہا۔ "آزادی" ملتے ہی ہندی والوں کا تعصب اُردو پر ٹوٹ پڑا۔ کچہریوں، دفتروں، سڑکوں کی تختیوں سے اردو حروف چھیل چھیل کر، کھرچ کھرچ کر مٹائے گئے۔ اب ۶۷ء ہے اور خیر کچھ کچھ جگہ پیر ٹیکنے بھر کی اردو والوں کو ملنے لگی ہے، عدم محض سے اتنا بھی غنیمت ہے —— ۲۲ء تک خلیفۃ المسلمین کے نام کا بھرم دلوں میں قائم تھا اور ہندوستان کی خلافت کمیٹی نے خلافت اسلامیہ کا جوش از سرِ نو دلوں میں تازہ کر دیا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں مصطفٰی کمال نے باقاعدہ یہ منصب عظیم ہی مٹا دیا۔ محمد علی یہاں بہت چیخے، چلّائے، تڑپے، نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

۱۹۴۷ء تک مملکت آصفیہ ایک ریاست نہیں، پوری سلطنت تھی، اپنا سکّہ، اپنا ڈاک خانہ، اپنی ریل وغیرہا۔

۴۸ء میں اس کا بھی قلع قمع ہو کر رہا، اور حیدر آباد جو سارے مسلمانان ہند کا ملجا و ماویٰ تھا، "آندھرا پردیش" بن کر مملکت ہند کا ایک جزو حقیر بن گیا۔

یہ سب معلومات ذہن میں رہیں تو آگے کی بہت سی مشکلات از خود حل ہوتی چلی جائیں گی۔

باب (۱)

ماحول — اجداد

سب سے پہلے اس ماحول کو سمجھ لیجئے، جس میں اس تباہ کار نے آنکھیں کھولیں، گو خود ماحول ہی ہر پچاس سال (۷۰، ۸۰ سال تو بہت ہوتے) کے بعد اتنا بدل جاتا ہے کہ لاکھ تفصیل اپنے قلم سے کر جایئے، آنے والی نسلوں کی سمجھ میں پورے جزئیات کے ساتھ آ ہی نہیں سکتا۔

اُنیسویں صدی عیسوی کا آخری دہا ہے، برطانیہ اور پھر ملکہ وکٹوریہ کے عہد واقبال کا برطانیہ! آج بعد زوال کوئی اس عہد کی تصویر کھینچنا بھی چاہے تو کیوں کر کھینچے، کس مُصوّر کے بس کی بات ہے کہ ستر سال کے پیر مرد کے چہرے مہرے میں ۲۵ سال والے جوان کی رعنائی، شادابی، شگفتگی بھر دے! ہندوستان پر برطانیہ کے تسلط و اقتدار کا عین شباب تھا، محض سیاسی ہی حیثیت نہیں، علمی، مجلسی، تمدنی، تعلیمی، غرض دنیوی زندگی کے ہر ادارے اور ہر تنظیم پر حاوی ومحیط، بلکہ ایک خاصی حد تک دینی زندگی کے بھی مختلف شعبوں میں بھی جاری وساری۔

مسلمان ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ "غدر و بغاوت"، اور اس کے عواقب و نتائج سے کچھ ایسے ڈرے، سہمے ہوئے تھے کہ سرکار جو کچھ بھی چاہے کرے، بس اپنی خیریت اسی میں ہے کہ اس کی ہاں میں ہاں ملائے جایئے۔ یہ کونسلیں اور اسمبلیاں جنہوں نے بعد کو اتنی

نمود حاصل کی، انیسویں صدی کے دسویں دہائی میں اگر تھیں، تو اپنی بالکل ابتدائی صورت میں، بلکہ کہئے کہ بالکل برائے نام۔ معراج ترقی مسلمان شریف زادوں کی، خصوصاً یوپی اور شمالی ہند میں، بس یہ تھی کہ ڈپٹی کلکٹری یا منصفی مل گئی۔ بس اکثر کے لئے تو ان سے بھی چھوٹے عہدے ایک نعمت تھے، ضلع کے انگریز کلکٹر "بڑے صاحب" کہلاتے تھے۔ اور انگریز جوائنٹ مجسٹریٹ "چھوٹے صاحب" اور ضلع کے جس رئیس سے "صاحب" خوش ہو گئے بس وہ نہال ہو گیا۔ ایک سید محمود (سرسید کے صاحبزادہ) کو جو ہائی کورٹ کی ججی اس عہد میں مل گئی، وہ شمالی ہند کے مسلمانوں کے لئے تو ایک "خارق عادت" اور خصوصی کرامت تھی۔

یہ تو خیر سرکاری طبقہ کا حال تھا۔ باقی شعر و ادب، بول چال، وضع و لباس، مکان اور فرنیچر، سواری اور سفر، شہدپن اور عیاشی، کھیل کود، دوا علاج، غرض زندگی کے چھوٹے بڑے ہر جزئیہ میں "صاحب" اور صاحبیت ہی کا سکّہ رواں تھا۔ حد یہ ہے کہ اپنی مادری زبان، اردو قصداً لہجہ اور تلفظ بگاڑ کر بولی جانے لگی، تاکہ بول چال میں بھی "صاحب بہادر" سے مشابہت پیدا ہو جائے! ــــــ اور دین و عقیدہ کے دائرے میں تو یہ مرعوبیت تکلیف دہ حد تک بڑھ چکی تھی۔ یورپ کی ہر بات پر آمنّا و صدقنا "دانایانِ فرنگ"، "حکمائے فرنگ"، "عقل فرنگ" یہ سب الفاظ، خواص و عام دونوں کے زبان زد تھے۔ شبلی نے شاعری نہیں کی، حقیقت بیان کی، جب یہ کہا۔

نکتۂ شرع برافسانہ برابر ننہی
یورپ ار گپ زند آں نیز مسلّم باشد

دَور دورہ سرسید اور چراغ علی، اور انگریزی خوانوں کی حد تک امیر علی کا

تھا۔ بہ قول شہنشاہِ ظرافت اکبرالہ آبادی ؎

مرزا غریب چپ ہیں اُن کی کتاب ردّی

بُدھوا کڑ رہے ہیں "صاحب" نے یہ کہا ہے!

نئے فیشن کی پیش قدمی پوری تیزی سے جاری تھی 'قدیم' و 'جدید' کی آویزش قدم قدم پر تھی، اور قدیم ہر محاذ پر اور ہر میدان میں شکست پر شکست کھا رہا تھا، زک پر زک اٹھا رہا تھا۔ سارے شعار اسلامی ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے، اور "اقبال سرکار" اور "دانایان فرنگ" گویا ہر مسئلہ میں "سند" کا درجہ رکھنے لگے تھے۔

ملک کی عام فضا سے صوبۂ اودھ اور ہمارے ضلع بارہ بنکی کی حالت کچھ مستثنیٰ نہ تھی، نکبت و ادبار کی گھٹا جو ساری ملت پر چھائی ہوئی تھی، اس میں دہلی و لکھنؤ کے قرب و جوار والوں کا حصہ شاید کچھ زیادہ ہی تھا۔ دونوں آخر "شاہی" شہر تھے اور دولت کی ریل پیل کو رخصت ہوتے ابھی کچھ ہی زمانہ ہوا تھا۔

نائی، دھوبی، بہشتی (سقہ) دُھنیے، جلاہے، لوہار، بڑھئی، مزدور، کسان، قلی، وغیرہ سارے پیشہ ور "کمینے" قرار پا گئے تھے، اور شرافت کا معیار یہ ٹھہر گیا تھا کہ نسب میں "میاں لوگوں" کی ٹکر کا کوئی بھی نہیں، اونچی اور شریف ذاتیں صرف شیخ و سید میں محدود ہو کر رہ گئی تھیں، اور پھر باہم ان میں بھی تفاضل۔ اور شیخوں کی شیخی کی کوئی حد ہی نہیں، اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنا سو عیبوں کا ایک عیب اور سو ذلتوں کی ایک ذلت۔ تجارت دوکانداری، کاشت کاری سب میں ہماری سُبکی اور توہین۔ سارا سہارا زمینداری کے بعد بس ملازمت کا رہ گیا تھا، یا پھر وکالت یا طبابت۔ باقی شرعی اکل حلال کے سارے راستے بند۔ خدمتی پیشے والے (نائی، منہار، کنجڑے، قصائی وغیرہ) سب پرجا یا رعایا

کہلاتے تھے، ان کی نہ کوئی عزت نہ ان کی عورتوں کی کوئی عصمت۔ ہم میاں لوگ ان سب کے مقابلہ میں فرعون بے ساماں بنے ہوئے۔ مجال نہیں کہ جب کوئی میاں لوگ اپنے بیٹھکے میں بیٹھے ہوں تو کوئی نیچ قوم کا لڑکا یا جوان ان کے سامنے سائیکل پر گزر سکے!

جوار کی شریف اہم برادری میں ایک اہم برادری قدوائی خاندان کی تھی یہ خاندان کہنا چاہئے کہ ضلع بارہ بنکی کے ساتھ مخصوص ہے، گدیہ، بھیارہ، مسولی، رسولی، بڑے گاؤں وغیرہ میں پھیلا ہوا یا ضلع لکھنؤ کے بھی ایسے قصبے جو بارہ بنکی کی سرحد پر واقع ہیں مثلاً جگور، خال خال لوگ اس خاندان کے فیض آباد، اُناؤ، رائے بریلی، ہردوئی وغیرہ اضلاع اودھ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ خاندان کے مورث اعلیٰ کا نام قاضی معزالدین عرف قدوۃ الدین تھا، ان کا زمانہ کہا جاتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی کا تھا اور وہ محمود غزنوی کے ہم عصر تھے، بعد کو ان کا نام زبانوں پر محض قاضی قدوہ رہ گیا۔ مشہور ہے کہ سلطان محمود ہی کے زمانے میں کسی لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے اور قصبہ اجودھیا (ضلع فیض آباد) میں مقیم ہو گئے۔ وہیں ایک مزار بھی ان کی جانب منسوب ہے نسلاً اسرائیلی تھے، خاندانی نسب ناموں میں ان کا سلسلہ حضرت ہارونؑ سے ہوتا ہوا لادی بن حضرت یعقوبؑ سے ملتا ہے، اس لئے قدوائی خاندان بھی اسرائیلیوں کی ایک شاخ ٹھہرتا ہے۔

لکھنؤ اور شہر لکھنؤ سے متصل قصبہ بجنور کے شیخ زادے نسب میں کسی کو اپنے برابر کا سمجھتے ہی نہ تھے، مگر قدوائیوں سے قرابتیں کر کے ان کو انھوں نے اپنے میں ملا لیا۔ اور سادات بانسہ وغیرہ نے بھی اپنی لڑکیاں قدوائیوں کو دیں اور ان کی لڑکیاں اپنے ہاں

لیس۔ اس طرح قدوائیوں کی عالی نسبی مسلّم ہوگئی۔ اور نسل ونسب کے لحاظ سے یہ کسی سے ہیٹے نہ رہے اور اسی زمرے میں شمار ہونے لگے، جس میں عباسی، انصاری، علوی، عثمانی وغیرہ تھے۔ مسلم حکومت کے دوران اس کُنبہ میں عالم و فاضل، مشائخ و درویش، اطبا، اور سرکاری عہدہ دار برابر پیدا ہوتے رہے، اور جب انگریزی حکومت آئی، جب بھی قدوائیوں کے علمی و منصبی امتیاز میں کوئی کمی نہ آنے پائی، اور اس وقت ۱۹۶۱ء تک شفیق الرحمٰن قدوائی (وزیر تعلیم صوبہ دہلی)، اور رفیع احمد قدوائی (نامور وزیر مرکزی) سے لے کر خدا معلوم کتنے ادیب و شاعر، کتنے طبیب و ڈاکٹر، کتنے وکیل و بیرسٹر، کتنے عالم و درویش، اسی خاندان سے اُٹھ چکے ہیں۔

دریاباد آج سے ایک صدی پیشتر شروع انگریزی عہد ۱۸۶۱ء وغیرہ میں، ہیں خود بھی ایک ضلع تھا، اب عرصہ دراز سے ایک معمولی و متوسط حیثیت کا ایک قصبہ ہے، آبادی کوئی ۷ ہزار ہوگی۔ آدھی ہندو آدھی مسلمان۔ فیض آباد سے ۴۰، ۴۲ میل جانب مغرب اور لکھنؤ سے ۴۳ میل جانب مشرق، صدر ضلع بارہ بنکی سے ۲۴ میل جانب مشرق۔ لکھنؤ و فیض آباد کے درمیان جو روڈ ویز بسیں کثرت سے چلتی رہتی ہیں، ان کا اسٹیشن، دریاباد ریلوے اسٹیشن سے کل ۲، ڈھائی میل پر ہے۔ ریلوے اسٹیشن لکھنؤ اور فیض آباد کے ٹھیک وسط میں واقع ہے۔ لکھنؤ سے کلکتہ جو دو اکسپریس آتے جاتے رہتے ہیں، دونوں یہاں ٹھہرتے ہیں، علاوہ اسٹیشن کے ڈاک خانہ ہے، تار گھر ہے، اسپتال ہے، ورنیکولر مڈل اسکول ہے، انگریزی کا ہائی اسکول ہے، پولس کی چوکی ہے، کپڑے، جوتے، مٹھائی، غلّے کا بازار خاصہ آباد ہے اور ضرورت کی زیادہ تر چیزیں مل ہی جاتی ہیں ہندو مسلم

کے الگ محلے ہیں۔ جینی لوگ صرافہ کی آبرو قائم رکھے ہوئے ہیں اور مسلمانوں میں مردہی محلہ کے لوگ کلکتہ میں خاصی بڑی تجارتیں کر رہے ہیں، کسی زمانے میں دو بڑی سرائیں آباد تھیں۔ ان میں سے ایک میں نامور شاعر میر تقی میر بھی ٹھہر چکے ہیں، اور سنا ہے کہ گھوڑوں کے تاجر ان میں اکثر آ آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ اب دونوں بالکل ویران ہیں۔ اور بجائے ان کے چائے کے ناشتے خانے (ہوٹلوں کے نام سے) جا بجا کھل گئے ہیں۔

مسلمانوں میں کئی شخص ندوہ کے پڑھے ہوتے ہیں اور دو چار شخص مدرسہ فرنگی محل کے بھی۔ شاعری کا شوق بلکہ کہئے کہ خبط ایک گروہ کو پیدا ہو گیا ہے اور مشاعروں میں وقت اور مال بے دریغ صرف کیا جا رہا ہے، قصبہ میں بجلی بھی آگئی ہے اور ٹیلی فون کا بھی ڈاک خانہ میں پبلک کال آفس کھل گیا ہے۔ کنوؤں کے علاوہ ہینڈ پمپ بھی جا بجا لگ گئے ہیں اور قصبہ میں مجموعی فضا خوش حالی ہی کی ہے۔ مسجدیں متعدد ہیں اور رمضان میں تراویح کی خوب دھوم دھام رہتی ہے۔ متعدد مسلمان باہر بڑے کامیاب کاروبار میں مشغول ہیں خصوصاً کلکتہ میں، انگریزی تعلیم بھی مسلمانوں میں خاصی ہے، بی اے، ایم اے، ال ال بی وغیرہ۔ ایک ایم ایس سی یورپ پلٹ ماہر طبعیات بھی۔ قصبہ کے ہندو بھی خاصے خوشحال اور ترقی یافتہ ہیں، خصوصاً رستوگی اور کائستھ۔

ضلع مزارات اولیاء و مشائخ کے لئے مشہور ہے۔ دیویٰ، رُدولی، بانسہ کی مشہور درگاہیں اسی ضلع میں ہیں۔ دریاباد میں بلکہ میرے محلہ ہی میں کئی بزرگوں کے مزار ہیں اور میرے مکان سے عین متصل درگاہ ہم لوگوں کے مورث اعلیٰ مخدوم و شیخ محمد آب کش چشتی نظامی (متوفی ۸۸۰ھ / ۱۴۷۵ء) کی ہے۔ شاہان شرقیہ جون پور کے عہد میں اپنے جد امجد قاضی عبدالکریم سرسنڈوی کے پاس سے پڑوس کے قصبہ محمود آباد میں آئے۔ وہاں سے شاہی عامل دریا خان

نا یے جا کرا نھیں اس خطۂ ویران میں لے آئے اور حضرت مخدوم نے ان کے نام پر اس کا نام دریاباد رکھ کر اس کی آبادی کی بنیاد ڈال دی۔ تاریخ آبادی ۸۴۵ھ / ۱۴۴۱ء ہے مخدومؒ خلیفہ شیخ ابوالفتح چشتی نظامی جونپوری کے تھے اور مشہور یہ ہے کہ مرشد نے آپ کے لئے مجاہدہ آب کشی کا تجویز کیا تھا کہ پانی بھر بھر کر مسافروں اور نمازیوں کو دیا کریں، جب ہی سے لقب "آب کش" پڑ گیا۔ اولاد پر مدت تک رنگ چشتیت غالب رہا، پھر ایک بزرگ خاندان بغداد سے "قادریت" کا تحفہ لے کر لوٹے ـــــ جی یہ چاہتا ہے کہ اس نامہ سیاہ کا وقت موعود اگر دریاباد ہی میں آجائے تو اسے جگہ بھی انھیں حضرت مخدومؒ کی درگاہ کے پائیں کسی گوشے میں مل جائے۔ یہ خواہش اپنے وصیت نامہ میں الگ بھی لکھ کر وارثوں کو دے دی ہے[۱]۔

دادا صاحب چار بھائی تھے، فرزندان شیخ مخدوم بخشؒ:۔

(۱) مولوی حکیم نور کریم صاحب (متوفی ستمبر ۱۸۶۱ء)

(۲) مولوی مفتی مظہر کریم صاحب (متوفی ۱۸۷۳ء)

(۳) مولوی حاجی مرتضیٰ کریم صاحب (متوفی ۱۸۷۳ء)

(۴) مولوی کرم کریم صاحب (متوفی ۱۸۷۹ء)

تیسرے صاحب کا انتقال عین جوانی میں ہو گیا، چوتھے صاحب کا شمار قرب وجوار کے ارباب وجاہت میں رہا۔

پہلے صاحب علاوہ بڑے دادا ہونے کے میرے حقیقی نانا بھی تھے، قیام لکھنؤ میں

۱؎ مرحوم کی یہ تمنا پوری ہوئی۔ ۶؍جنوری ۷۷ء کو وصال کے بعد تدفین انھیں بزرگ کے پہلو میں ہوئی (عبدالقوی)

رہا کرتا۔ مطب تو آگے چل کر چھوڑ ہی دیا تھا۔ سارا وقت طلبۂ طب کے درس دینے میں صرف کرتے۔ تدریسی انہماک کی بنا پر لقب "طبیب گر" پڑ گیا تھا، لوگ عجب عجب قصّے بیان کرتے ہیں کہ کھانا کھاتے جاتے ہیں اور سبق پڑھاتے جاتے ہیں۔ راستہ چلتے جاتے اور کوئی نہ کوئی شاگرد کتاب ساتھ لئے پڑھتا جاتا۔ اور اس طرح کے قصّے ان کی تنگ دستی کے باوجود داد و دہش کے بھی مشہور ہیں۔ علمائے فرنگی محل سے تعلقات بڑے مخلصانہ بلکہ عزیزانہ تھے، اور اسی طرح جھوائی ٹولہ کے خاندان اطباء سے۔ اعلیٰ درجہ کے خوشنویس اور ساتھ ہی زود نویس بھی تھے۔ لغت، طب، تفسیر، حدیث، تاریخ وغیرہ کی بیسیوں کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھ ڈالیں، کاغذ اتنا پائدار، روشنائی اتنی پختہ اور روشن کہ کتابت سوا سو برس قبل کی نہیں، کل کی معلوم ہوتی ہے، ان کے کمالات کے قصے آج تک خاندان میں زبان زد ہیں۔ آخر عمر میں بڑودہ طبی ملازمت کے سلسلے میں بلائے گئے اور وہیں وفات پائی۔

حقیقی دادا مفتی مظہر کریم صاحب تھے، علم دین کی سند فرنگی محل سے حاصل کی۔ شروع انگریزی کا زمانہ تھا۔ شاہجہاں پور میں عدالت کلکٹری میں سررشتہ دار ہو گئے۔ (جو وقت کا ایک خاصہ معزز عہدہ تھا) اور افتار کا مشغلہ بھی جاری تھا کہ اسی دوران ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ انگریزوں کے خلاف برپا ہو گیا۔ اور اس کے خاتمہ پر ان پر مقدمہ اس کا چلا کہ ان کے شہر شاہجہاں پور میں باغیوں کی کمیٹی انھیں کے مکان پر ہوتی تھی خاندانی روایتیں اس کے برعکس یہ سننے میں آئی تھیں کہ انھوں نے ایک انگریز کی جان بچائی تھی اور اسے اپنے گھر میں چھپا کر رکھا تھا بہرحال صحیح یا غلط (اور اب کوئی ذریعہ تحقیق کا نہیں) ان پر مقدمہ چلا اور ۹ سال کی سزا عبور دریائے شور کی سنادی

گئی کالے پانی یعنی جزیرہ انڈمان جانا اس وقت گویا سفر ملک عدم کا پیش خیمہ تھا۔ بہر حال سب کو روتا پیٹتا چھوڑ کر یہ گئے۔ اور وہاں اور بھی کئی علماء کا ان کا ساتھ ہو گیا مشغلۂ علمی وہاں بھی جاری رہا۔ کسی انگریز کی فرمائش پر عربی کی مشہور جغرافیہ مراصد الاطلاع فی اسماء الامکنۃ والبقاع (صفی الدین عبدالمومن) کا ترجمہ اُردو میں کر ڈالا۔ شاید کچھ اس کے صلہ میں اور کچھ خوش چلنی کی بنا پر اسیری کی مدت نَو سال سے گھٹ کر سات ہی سال کی ہو گئی اور یہ سنہ ۱۸۶۵ء میں وطن واپس آگئے۔ اور بقیہ عمر دریاباد ہی میں رہ کر عبادت اور فقہی فتاویٰ نویسی میں بسر کی۔ ایک ضخیم جلد فتاوئے مظہریہ کے نام سے چھوڑ گئے ہیں جو غیر مطبوعہ ہی رہی۔ اس کا قلمی مسودہ، ذرا بد خط اور خط شکست میں لکھا ہوا، مسائل مظہریہ کے نام سے ملتا ہے۔ عقائد میں ہم مسلکی علماء بدایوں کی ہے، مراسلت بھی ان حضرات سے رہا کرتی۔ غایۃ المرام فی تحقیق المولود والقیام کے عنوان سے ایک کتاب اپنے ایک عزیز قریب کے نام سے محفل میلاد اور اس میں قیام تعظیمی کی حمایت و جواز میں چھپوائی۔ ایک کٹا پٹا مسودہ بھی مناقب غوثیہ کے نام سے پُرانے کاغذات میں ملا۔ میری نانی مرحومہ نے بڑی عمر پائی۔ اپنے بچپن میں ان کا دیکھنا یاد ہے، چلنے پھرنے سے معذور ہو کر فرلیش رہتی تھیں یہ قصبہ بجنور (لکھنؤ) کے خاندان شیخ زادگان صدیقی کی تھیں۔ یہ وہی خاندان ہے، جس کے ایک رکن چودھری خلیق الزماں پہلے تحریک خلافت کے اور پھر مسلم لیگ کے ایک نمایاں لیڈر رہے اور اب ۱۹، ۲۰ سال سے پاکستانی ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ خوش حال ہونے کے ساتھ بڑے "خوش عقیدہ" قسم کے تھے —— ان اثرات گوناگوں سے ہمارے خاندان دریاباد میں علم دین کے چرچے کے باوجود غالب رنگ خانقاہی و درگاہی تصوف کا تھا۔ اور

پیروی بجائے سُنت کے بدعات ہی کی ہو رہی تھی۔

مذہبیت یا دین داری ایک رسمی قسم کی، اور ظواہر کی حد تک، ہمارے ہاں اچھی خاصی تھی لیکن جس چیز کا نام تقویٰ قلب ہے خصوصاً بندوں کے ادائے حقوق اور ان سے حسن معاملت کی کمی، وہ جوار کے اکثر شریف گھرانوں کی طرح ہمارے ہاں بھی نمایاں تھی۔ نوکروں، چاکروں، خدمت گاروں اور خدمتی پیشے والوں کی مٹی خاص طور پر پلید تھی۔ خادموں اور خادماؤں کے لئے لفظ لونڈی غلام بے تکلف زبانوں پر چڑھا ہوا تھا۔ اور جب ان کی کوئی عزت ہی نہ تھی، تو کسی بے عزتی کا اندیشہ کیوں ہونے لگا تھا۔ اور جب کوئی حیثیت عُرفی تھی ہی نہیں تو اس کے کسی ازالہ اور ہتک کا سوال ہی کیوں پیدا ہوتا۔ آقازادے اور آقازادیاں بچپن ہی سے اپنے حقوق مالکانہ ان کے بوڑھوں اور بوڑھیوں پر قائم کر لیتے، اور ڈانٹ ڈپٹ، گالی گلوج، مارپیٹ ان بدنصیبوں کے گلے کے طوق تھے۔ اپنے ذاتی ملک سے خرید کر بھی یہ لوگ نہ کوئی اچھی چیز کھا سکتے تھے اور نہ کوئی اچھا کپڑا پہن سکتے تھے، جُرم فوراً یہ قائم ہو جاتا کہ نیچ اور کمینے ہو کر یہ لوگ مالک کی برابری کرتے ہیں۔ ہندو تقسیم اونچ نیچ اور ذلیلے اور اچھوتوں کی، پوری طرح مسلم دلوں دماغوں پر بھی مسلط ہو چکی تھی ——— اور جن کھاتے پیتے گھروں میں، زمین داری کے ساتھ کوئی حاکمانہ عہدہ مثلاً محکمۂ پولس کا حاصل ہو جاتا وہاں کے ظلم وستم کا تو پوچھنا ہی کیا!

دریاباد کے علاوہ ہم لوگوں کا تعلق شہر لکھنؤ سے بھی قدیمی چلا آرہا ہے نانا صاحب کی تو عمر ہی لکھنؤ میں گزری، وہیں پڑھا، وہیں پڑھایا۔ اور شہر میں صاحب اثر و رسوخ رہے

دادا صاحب بھی گویا نیم فرنگی محلی ہو گئے تھے۔ والدہ، خالائیں اور اکثر عزیزوں کی پیدائش بھی لکھنؤ میں ہوئی، فرنگی محل سے تعلق و رابطہ حدِ یگانگت تک پہونچا ہوا تھا۔ اطبائے جھنوائی ٹولہ سے بھی ربط و ضبط رہا۔ اور سندیلہ، کاکوری، بانسہ، گوپہ وغیرہ کے شریفوں کی جو نوآبادیاں لکھنؤ میں قائم ہو گئی تھیں ان کے میل جول سے ہماری پوری برادری لکھنؤ میں قائم ہو گئی تھی۔ اور لکھنؤ ہم لوگوں کے لئے اگر وطن نہیں، تو وطنِ ثانی ضرور بن گیا تھا۔

باب (۲)

والد ماجد

سنہ ۱۸۴۸ء و سنہ ۱۹۱۲ء

دادا صاحب متوفی سنہ ۱۸۷۳ء نے اولادیں کُل سات چھوڑیں، پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے، سب سے چھوٹی اولاد میرے والد مرحوم ہی تھے، مولوی عبدالقادر، پیدائش سنہ ۱۸۴۸ء میں ہوئی، غالباً لکھنؤ میں، تعلیم و تربیت یہیں پائی۔ وقت کے دارالعلم والعمل فرنگی محل میں۔ ایک استاد مشہور عالم و شیخ طریقت مولوی محمد نعیم فرنگی محلی تھے، ان کے یہ شاگرد با لاختصاص رہے۔ باقاعدہ عالم تو نہیں لیکن درس کی اکثر کتابیں پڑھ لی تھیں۔ اور عملاً عالم کے درجہ میں آہی چکے تھے۔ عربی و فارسی میں دست گاہ کے ساتھ، اردو کی بھی استعداد اچھی خاصی حاصل کرلی تھی۔

اخبار و رسالوں کے علاوہ معلوماتی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا شوق آخر تک رہا اور کچھ نہ کچھ مشغلہ لکھنے لکھانے کا بھی رکھا۔ پنشن لینے کے بعد لکھنؤ کے روزنامہ اودھ اخبار اور گورکھپور کے سہ روزہ ریاض الاخبار میں، اور پھر اسی کے جانشین ہفتہ وار مشرق میں مذہبی و نیم مذہبی عنوانات پر برابر لکھتے رہے۔ یہاں تک کہ مشرق کے جس پرچہ میں خبر وفات شائع ہوئی، اس میں مرحوم کا آخری مضمون بھی نکلا۔ انگریزی بھی اپنے مطالعہ کے زور سے کچھ نہ کچھ سیکھ لی تھی اور اس شُدبُد سے کام نکال لینے لگے تھے۔ سمجھ تو

سب جانتے اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی اور لکھ بھی لیتے۔

امتحان وکالت پاس تھے، لیکن کام اس سند سے کبھی نہ لیا۔ وکالت کے چلتے ہوئے دھندے سے اپنی طبیعت میں مناسبت نہ پائی۔ شروع ملازمت اسکول کی فارسی مدرّسی سے کی۔ پہلے بارہ بنکی، پھر ہردوئی میں۔ تنخواہیں اس وقت بہت قلیل تھیں۔ یہ اسی میں مگن اور مطمئن تھے، اور اپنی حسن کارکردگی سے سب کو خوش کیے ہوئے تھے، ہردوئی میں نجی طور پر کسی انگریز کو فارسی پڑھائی اس نے خوش ہوکر اپنی خصوصی سفارش سے انھیں عدالت فوجداری کی سررشتہ داری دلادی۔ اور پھر یہ اپنی دیانت جفاکشی، فرض شناسی سے تحصیلداری پر پہنچ گئے، بلگرام اور سندیلہ میں تحصیل دار رہ کر ایسے مرجع انام اور مقبول خاص وعام بنے رہے کہ وہاں کے رہنے والے دو دو پشت تک اُنھیں اپنے کسی عزیز یا بزرگ کی طرح یاد کرتے رہے حالانکہ تحصیل داری کا عہدہ اس عہد میں بجائے شفقت ولینت کے تمامتر ایک رعب داب، ڈانٹ ڈپٹ ہی کا عہدہ تھا——
یہ زمانہ ۱۸۸۰ء اور اس کے بعد ہی کا ہوگا۔

اپنے ذاتی اعمال وکردار میں بڑے پختہ مسلمان تھے، نماز، روزہ، تلاوت قرآن مجید وغیرہ کے پابند۔ لیکن برتاؤ مسلم وغیر مسلم سب کے ساتھ بڑی نرمی، رواداری وہمدردی کا رکھتے تھے۔ اور انصاف ہی نہیں ہر شخص کے ساتھ امکان بھر حسن سلوک ہی سے پیش آتے، اس لئے نیک نام اور ہر دل عزیز اپنوں، بے گانوں سب میں رہے۔ شیریں زبانی ایسی تھی کہ ہندو، عیسائی، آریہ سماجی، سکھ، سب ہی کو موہ لیتی۔ گورکھپور میں ایک یہودی صاحب رہتے تھے۔ اپنے بچپن کی بات یاد ہے کہ ان سے بھی گہرے تعلقات ہو گئے تھے۔

میری پیدائش ۱۸۹۲ء کی ہے اس سے قبل ڈپٹی کلکٹر ہو چکے تھے، جب میرے ہوش کی آنکھیں کھلیں یعنی ۱۸۹۶ء میں تو اس وقت لکھیم پور میں ڈپٹی تھے۔ یہ عہدہ اس وقت بجائے خود ایک معراج ترقی تھا۔ اور گریڈ چار سو کا تھا اس وقت کے چار سو آج کے محتاط اندازہ میں بھی چار ہزار کے برابر تھے۔ اس ۷۰، ۷۵ سال کے عرصہ میں اشیاء کی قیمتیں دس گنی بڑھ چکی ہیں۔ اور روپیہ کی قیمت اسی نسبت سے گر چکی ہے

ہردوئی، بارہ بنکی، لکھیم پور، گونڈا، بستی، گورکھپور، فیض آباد، سیتاپور اتنے ضلعوں میں ڈپٹی رہے، اور جب آخر میں سیتاپور آئے ہیں، تو تنخواہ پانسو ہو گئی تھی۔ رشوت سے بحمداللہ عمر بھر نابلد رہے۔ ہاں مختلف الاونس جائز طریقے پر ملتے رہتے۔ اور کچھ آمدنی دریاباد میں زمینداری سے بھی ہو جاتی تھی، گویا اوسط سب ملا کر ۶۰۰ سو ماہوار کا رہتا اتنی آمدنی میں خاصی رئیسانہ حیثیت سے بسر ہوتی تھی۔ سیتاپور کی زندگی، ۹، ۱۰ سال کے سن سے مجھے اچھی طرح یاد ہے، دو دو گھوڑے، دو دو گاڑیاں موجود تھیں (موٹر کا نام بھی اس زمانہ میں کون جانتا تھا)، کوچوان، سائیس، چوکیدار، خدمت گار، باورچی، ملا کر کوئی ۸، ۱۰ نوکر تو مردانے ہی کے تھے، اسی طرح زنانے میں دائی، کھلائی، ماما، چھوکریاں ملا کر یہ بھی ۸، ۱۰ سے کم نہیں۔ گھوڑے، بھینس، بکریاں، مرغیاں پلی ہوئی تھیں۔ دودھ، دہی، مکھن، گھی، انڈوں کی افراط۔ قورمہ، پلاؤ، کباب، فرینی، مُربا، حلوا، کہنا چاہیئے کہ روز ہی زینت دسترخوان۔ دعوتیں اکثر کیا کرتے اور اس دن تو خوب ہی کھانے کو ملتا۔ یوں بھی دوپہر اور رات کا کھانا، اور صبح دودھ کا گلاس اور سہ پہر کا ہلکا سا ناشتہ، چار چار وقت کا معمول تھا۔

صورت شکل مولویانہ، قد متوسط، جسم جامہ زیب، رنگ گندمی، چہرہ پر خاصی بڑی

خوشنما داڑھی (آخر عمر میں خضابی) لباس میں اچکن، پاجامہ، گرمیوں میں دو پلّی ٹوپی، جاڑوں میں کبھی سیاہ ایرانی ٹوپی، اور کبھی بادامی یا سبز رنگ کا عمامہ، جو اُن کے گول چہرے پر بہت بھلا لگتا۔ جوانی میں ڈنڑ وغیرہ کی ورزش کرتے رہے اور مگدر کی جوڑی ہلانے کی مشق تو ۶۰، ۶۲ سال کے سن تک جاری رہی۔

روزانہ کے معمولات یہ کہ منہ اندھیرے سے اُٹھتے، نماز فجر کے اخیر وقت میں ہم دونوں بھائیوں کو جگایا اور مختصر جماعت تینوں نے ادا کی، اور قرآن مجید کھول کر تلاوت کے لئے بیٹھ گئے۔ مدتوں تلاوت اُس مصحف مطبوعہ دہلی کی کرتے رہے، جس میں ایک ترجمہ فارسی کا شاہ ولی اللہ دہلوی کا تھا، اور دوسرا اُردو کا شاہ رفیع الدین کا، اور حاشیہ پر تفسیر ابن عباسؓ اور تفسیر جلالین دو دو تفسیریں تھیں، پھر اخیر میں مولوی نذیر احمد دہلوی کا ترجمہ پڑھنے لگے تھے۔ اس سے اُٹھے تو چند منٹ ورزش کی پھر دودھ کا ناشتہ کیا، اتنے میں دن چڑھا اور کچھ لوگ ملنے ملانے آگئے۔ وہی وقت ڈاک کا بھی ہوتا، دو ایک اخبار اُردو کے ضرور آتے، اور انگریزی کا بھی ایک سہ روزہ ایڈووکیٹ نام کا لکھنؤ سے۔ غالباً ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ سے مولانا شبلی کی ادارت میں ماہنامہ الندوہ نکلا، اُسے بھی منگانے لگے، اتنے میں دس بج گئے۔ کھانا کھایا، گاڑی پر کچہری گئے، ظہر کی نماز اپنے آرام کمرے میں پڑھی، سہ پہر ہوا، گھر آئے اور نماز عصر پڑھی۔ کبھی کچھ ناشتہ بھی قبل مغرب کر لیتے، مغرب کی نماز مردانے میں باجماعت پڑھتے۔ کوئی ملنے والے آگئے تو ان کے ساتھ، ورنہ ایک آدھ ملازم کے ساتھ کبھی ٹہلتے ہوئے شہر کی جامع مسجد تک چلے جاتے، وہ خاصے فاصلہ پر تھی، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے رات گئے کھانا ہوتا۔ والدہ اور ہمشیر ہم لوگوں کے بعد کھاتیں۔ اس وقت کی یہی تہذیب و شرافت تھی۔ اب نماز عشا ہوتی اور

استراحت کا وقت آجاتا۔ اکثر کچھ دیر رات میں بھی، موم بتی یا لالٹین کی روشنی میں کچھ لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھتے۔ اور اوراد واذکار کے کچھ زیادہ عادی نہ تھے، کوئی ہلکا سا ورد مثلاً تسبیح فاطمہ بعد نماز مغرب ٹہل ٹہل کر پورا کر لیتے ——— بچپن کا زمانہ بھی کیا زمانہ ہوتا ہے۔ والد ماجد کا پروگرام لکھتے لکھتے خود اپنی نادانی، غیر ذمہ داری اور معصومانہ شرارتوں کا زمانہ کس حسرت کے ساتھ نظروں کے سامنے پھر گیا۔ آہ، اس وقت کیا خبر تھی کہ یہ کھیل کود کا زمانہ چشم زدن میں ختم ہو جائے گا، اور بڑے ہو کر کیسی کیسی فکریں اور ذمہ داریاں سر آپڑیں گی اور زندگی کو کن کن مشکلات کا مقابلہ اور کیسے کیسے اندرونی اور بیرونی فتنوں کا سامنا کرنا پڑے گا!

دعوت کا دن بڑے مزے سے گزرتا، دعوتیں عموماً رات کے کھانے کی ہوتیں، باورچی کو ہدایتیں صبح ہی سے ملنے لگتیں، والدہ گھی تلوا کر باورچی خانہ میں باہر بھجوانے لگتیں اور کون کھانا ایسا ہوتا، جس میں گھی دا اور اس وقت تک گھی خالص ہی ہوتا تھا، کثرت سے نہ پڑتا۔ شام کا انتظار دن بھر کس شدت واشتیاق کے ساتھ رہتا! وہ دیکھئے، پلاؤ دم پر لگا ہوا ہے، سیخ کے کباب کیا خوشبو دے رہے ہیں، تندور سے روٹیاں کیسی گرم گرم نکل رہی ہیں۔ خدا خدا کر کے وقت آتا اور کھانے کی ہوس جی بھر کر پوری ہوتی۔

والد ماجد کے مزاج میں تمکنت نام کو بھی نہ تھی، وضع قطع، چال ڈھال، لباس اور بول چال کسی چیز سے پتہ نہ چلنے پاتا کہ یہ شہر کے حاکم اور ڈپٹی ہیں (اس وقت کے ڈپٹیوں کا رعب داب اب کن لفظوں میں بیان ہو) پیدل چلے جا رہے ہیں، راستہ میں کسی چپراسی نے حضور، سلام کہہ دیا، بس وہیں کھڑے ہو کر اس سے بات چیت شروع کر دی۔ اس

کے گھر والوں کی خیریت پوچھ رہے ہیں، آج کسی کی سفارش کا خط لکھ رہے ہیں، کل کسی کے کام کے لئے خود چلے جا رہے ہیں، کتنوں کی مدد اپنی جیب سے کرتے رہتے، تنخواہ کا ایک معقول حصہ، یتیموں، بیواؤں اور غریب عزیزوں پر خرچ کرتے۔ جاڑوں میں بستی کے ناداروں کو رضائیاں بنوا دیتے۔ وطن جب آتے تو بستی کے بچوں کو تازی جلیبیاں تقسیم کرتے۔ گھر پر ایک میلا سا لگ جاتا۔ خاندان والوں کے لئے موسمی تحفے لکھنؤ سے ضرور لاتے، کبھی حلوا سوہن، آم، خربوزہ، یا پیچی یا نارنگی۔ اکثر عزیزوں کی دعوت کرتے، سب کو دسترخوان پر بٹھا کر کھلاتے، گھر پر آئے ہوئے کسی بھی سائل کو حتی الامکان محروم نہ واپس کرتے، بعض سائل مستقل پھیرا ہر سال کرتے رہتے۔ آتے اور کئی کئی دن مہمان رہتے۔ ایک صاحب یاد ہیں، اونٹ پر سوار ہو کر آتے۔ آنے والوں میں کبھی کبھی ہندو فقیر بھی ہوتے، آتے اور اپنا حصہ لے کر جاتے ایک ہندو فقیر اچھی طرح یاد ہے، آتا اور یہ صدا لگاتا "بڑھو، عبدالقادر بڑھو"۔ نوکروں، چاکروں کے قصور سے اکثر چشم پوشی کر جاتے۔ غصہ اگر آتا بھی تو دیرپا نہ ہوتا۔

مزارات کے معتقد تھے، مگر زیادہ بدعات سے دامن بچائے رکھتے، محفل سماع میں کبھی کبھی شرکت کر لیتے۔ خصوصاً خیرآباد کے مشہور قوالوں کی چوکی کے بڑے قدردان تھے لیکن حال و وجد کے بجائے صرف آب دیدہ ہو کر رہتے۔ اپنے خلوص و شیریں زبانی کی بنا پر ہر طبقہ میں مقبول و محبوب تھے۔

۱۹۰۴ء میں جب سیتاپور میں پنشن پائی، تو چھوٹے بڑے، ہندو مسلمان سب ہی نے قلق محسوس کیا۔ کس حاکم کو پنشن کے بعد کون پوچھتا ہے۔ لیکن یہاں صورت حال برعکس دیکھنے میں آئی۔ رخصتی دعوتیں اور پارٹیاں خوب دھوم دھام سے

ہوتی رہیں۔ اور خلقت کی گرویدگی جیسے کچھ اور بڑھ گئی۔ پنشن کے بعد آمدنی قدرۃً آدھی رہ گئی تھی یعنی پانسو سے صرف ڈھائی سو، لیکن معاً بعد سیتاپور میونسپل بورڈ میں سکریٹری کی جگہ ڈیڑھ سو ماہوار کی نکل آئی۔ اور اس لئے مالی کمی کچھ ایسی زیادہ نہیں ہونے پائی۔ نسبت سو اور اسّی کی قائم رہی۔

اس کے پورے چار سال بھی نہ گزرے ہوں گے کہ نومبر ۱۹۰۹ء میں ایک عزیز چودھری شفیق الزماں تعلقہ دار گڑھی بہلول کے اصرار پر ان کے علاقہ کی منیجری پر چلے آئے اور اب مستقل قیام لکھنؤ میں رہنے لگا۔ سیتاپور اور اس کے پڑوس خیرآباد والوں نے رُو رُو کر رخصت کیا۔ اور ہم لوگ بھی بڑے تاثر کے ساتھ رخصت ہوئے، نو، دس سال کے مسلسل قیام نے سیتاپور کو بالکل وطن بنا دیا تھا ـــــ اور مجھ سترہ سال کے لڑکے کو مفارقت و مہاجرت کا عمر میں پہلا تلخ سبق ملا ـــــ میں تو یوں بھی ایک سال پہلے ہی سے لکھنؤ میں پڑھنے آگیا تھا۔ اور اب ہم لوگوں کو رہنے کے لئے قیصر باغ میں پُر تکلف حد تک وسیع و آرام دہ مکان ملا۔ سواری کو گھوڑا گاڑی، خدمت کو چپراسی وغیرہ۔ سال ڈیڑھ سال کی مدت ہنسی خوشی بسر ہوئی اس کے بعد والد صاحب اور ان رئیس صاحب میں تلخیاں پیدا ہوئیں، پیچیدگیاں بڑھیں۔ یہاں تک کہ نباہ کی کوئی صورت نہ رہی۔ وسط ۱۹۱۲ء میں نوبت قطع تعلق کی آگئی۔ اور رئیس صاحب نے ایک بڑی رقم کئی ہزار کی بہ طور معاوضہ، حسب معاہدۂ سابق پیش کر دی۔

اس سے حج کا زادِ راہ نکل آیا۔ اشتیاق ہمیشہ سے تھا اور میری ہمشیر اللہ کی نیک بندی اس شوق کو اور مہمیز دیتی رہتی تھیں۔ بہرحال اکتوبر ۱۹۱۲ء میں والد صاحب مع والدہ و ہمشیر اور دو چار اور عزیزوں اور خادموں کے پورا ایک مردانہ و

زنانہ قافلہ بنا کر حج بیت اللہ کو روانہ ہوگئے۔ بمبئی تک یہ پیکر الحاد و فرنگیت بھی ساتھ گیا۔ جہاز کی روانگی میں برابر دیر ہوتی چلی گئی، بالآخر مجھے واپس آنا پڑ گیا۔ پڑھائی کا جو ہرج ہو رہا تھا۔ رخصتی کے وقت والد مرحوم کی آنکھوں سے آنسو زار و قطار جاری تھے۔ بالکل خلاف معمول اور آہ! کہ عالم آب و گل میں یہ آخری رخصتی تھی ــــ میں شقی القلب و نادان اُن کی اس رقتِ قلب اور فطری بارش مہر کو حیرت سے دیکھتا اور بے محل سمجھتا رہا!

فرائض حج کے معاً بعد منیٰ میں ۱۲ ارذی الحجہ ۱۳۳۰ھ ۲۴ ر نومبر ۱۹۱۲ء کی شب میں مبتلائے ہیضہ ہوئے۔ اور اونٹ پر ڈال کر مکہ معظمہ لائے گئے۔ روتا پیٹتا سارا قافلہ ساتھ آیا یہاں ۱۴ ر ذی الحجہ اذان فجر کے وقت داعئ اجل کو لبیک کہہ ڈالا اور کھٹ سے کعبہ سے رب کعبہ کے حضور میں حاضر ہو گئے! ــــ حج مبرور اسی کو کہتے ہیں کہ ادائے فریضہ کے بعد مبتلائے معصیت ہونے کی مُہلت ہی نہ ملی۔ رفیقوں کا بیان ہے کہ نماز کا وقت اشارے سے بار بار دریافت کر رہے تھے، بلکہ خود نماز کی نیت بھی باندھ چکے تھے! نماز جنازہ صحن حرم میں ایسے وقت ادا ہوئی کہ خانہ کعبہ کا سایہ میت پر پڑ رہا تھا۔ جگہ جنت المعلیٰ میں ملی صحابی عبدالرحمنؓ بن ابی بکر کے پائیں میں! اللہ اللہ! اکرم و نوازش کی کوئی انتہا ہے! عین حج کرتے میں دنیا سے اُٹھایا، بیماری رہی تو شہادت والی اور پھر نماز و دفن وغیرہ کی یہ ساری کرامات مستزاد! خبر خط کے ذریعہ دا اور اس وقت جہاز میں ڈاک کے یہ انتظامات کہاں تھے) اخیر دسمبر میں ہندوستان پہنچی خاندان بھر میں کہرام مچ گیا! اور مدتوں قائم رہا۔ اخباروں نے بھی ماتم کیا میرا اپنا تعزیتی مضمون ہفتہ وار مشرقِ (گورکھپور) میں نکلا۔ لکھنا اس وقت کیا آتا تھا لیکن فخر کے لئے یہ کافی

ہے کہ مضمون کی داد مولانا شبلی نے دی۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے میری درخواست پر یہ قطعہ ارشاد فرمایا ؎

پیشوائے قوم والا مرتبت — شیخ عبدالقادر والا صفات
آخرت ہی پر نظر رکھتے تھے وہ — سمجھتے تھے دنیائے دوں کو بے ثبات
جاہ و منصب میں وہ گو ممتاز تھے — کرتے تھے یادِ خدا دن ہو کہ رات
ان کے ذکر و شغل کا تھا یہ اثر — "شغل" ہی میں نکلی تاریخ وفات ۱۳۲۰ھ

اور آہ! کہ اس تباہ کار نے مرحوم و مغفور کی زندگی کے آخری تین سال اپنی بھرپور نالائقی، بے دینی اور خیرہ سری سے نہایت درجہ تلخ رکھے۔ ان کی خدمت تو الگ رہی الٹا ان سے گستاخی اور نافرمانی ہی سے پیش آتا رہا۔ اس کی جو کوفت انھیں ہر وقت رہتی اور اس درد دل کا اظہار وہ اپنے پڑھے لکھے اور دین دار ملاقاتیوں ہی کے سامنے کرتے کاش اس دن کے لئے میں زندہ ہی نہ رہا ہوتا! اور خیر ان کی زندگی میں تو نہیں نکلی کاش میری ہی زندگی میں کوئی صورت اس سراسر نالائقی کی تلافی کی نکل آتی! سوچتا ہوں کہ حشر میں ان کا سامنا کس طرح کر سکوں گا!

دو جوہر میں نے ان میں خاص پائے، جو اور لوگوں میں بہت کم دیکھنے میں آئے۔

(۱) ایک صلح کلی، جھگڑے قضیئے سے اجتناب، خود کوئی جھگڑا مقدمہ جائداد وغیرہ کا کیا شروع کرتے، ادھر سے کوئی اگر جھگڑا نکالتا تو اسے رفع ہی کراتے، بات آگے نہ بڑھنے دیتے۔

(۲) دوسرے جس طرح خیال، خاص اپنی اولاد کا رکھتے، اسی طرح کا خیال بھتیجوں، بھانجوں، بلکہ دُور کے عزیزوں کا رکھتے۔ اولاد کی محبت میں حد سے گزرنے والے حد خود غرضی تک پہنچ جانے والے میں نے بہت سے دیکھے ہیں۔ انھیں مستثنیٰ پایا، رہی نماز اور روزہ کی پابندی، اسے اوپر لکھ ہی چکا ہوں۔

باب (۳)

والدہ ماجدہ

۱۸۵۶ء تا اپریل ۱۹۴۱ء

نام بی بی نصیر النسار تھا۔ اپنے والد حکیم نور کریم کی پانچ لڑکیوں اور تین لڑکوں میں سب سے چھوٹی اولاد تھیں، جیسے میرے والد مرحوم بھی اپنے سارے بھائی بہنوں میں چھوٹے تھے۔ سالِ ولادت غالباً ۱۸۵۳ء تھا۔ کہا کرتی تھیں کہ 'غدر' کے وقت میں ۳، ۴ برس کی تھی، اور 'غدر' کا سال ۱۸۵۷ء تھا۔

پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ شادی کے وقت تک وہیں قیام اپنے والدین کے ساتھ رہا کیا۔ شہر میں قیام زیادہ تر محلہ کھجوے (قریب عیش باغ) میں رہا۔ اس کا ذکر بڑی محبت سے کرتی تھیں۔ کھجوے میں ایک عالی شان حویلی مع بہت بڑے باغ اور چار دیواری کے "آغائی صاحب" کی ملک تھی۔ اس کے کسی حصہ میں ہمارا نانہالی خاندان آباد تھا، اور یہ لق و دق عمارت ابھی چند سال قبل یعنی ۱۹۴۰ء تک محفوظ تھی۔ ایک بار والدہ ماجدہ کو لے جاکر اسے دکھا بھی لایا تھا۔ اور مرحومہ جاکر بہت خوش ہوئی تھیں۔ ان کے زمانہ میں لڑکیوں کی لکھائی پڑھائی کا نام بھی نہ تھا۔ کس مشکل سے جوں توں قرآن مجید ناظرہ پڑھ لیا تھا۔ اٹک اٹک کر ایک ایک لفظ نکال نکال کر پڑھتی تھیں۔ اس پر بھی تلاوت پابندی کے ساتھ اخیر عمر تک قائم رکھی، اور اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنا اجر اپنی اس

مشقت و تعب سے کمالیتیں! اردو میں صرف حرف شناس تھیں۔ مولوی اسماعیل صاحب کی پہلی یا دوسری ریڈر سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ اور اخیر عمر میں یہ بھی سب حافظہ سے محو ہو گیا تھا۔

صورت شکل میں اپنے زمانہ میں ممتاز رہی تھیں۔ میں نے جب دیکھا تو ادھیڑ پن کی ہو چکی تھیں۔ نانا صاحب کے یہاں تنگ دستی تھی اور خرچ میں اولوالعزمی، قدرۃً ان کے بچپن کا زمانہ تنگی و ترشی میں گزرا۔ اب جب ہم لوگوں کے سامنے بچپن کی ناداری کے قصے سناتیں تو ہم لوگوں کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے۔ بے چاری کو کیسا پتّا مار کے رہنا ہوتا تھا! اللہ نے صبر کا پھل میٹھا دیا۔ شادی کے بعد ہی سے مالی حالت بہتر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ آگے چل کر تو خاصی خوش حالی سے گزرنے لگی۔ شوہر سے بھی خوب بنی۔ اس لئے خرچ پر بھی پورا اختیار حاصل رہا۔ کہنا چاہیئے کہ گھر میں ملکہ بن کر رہیں، اور راج کرتی رہیں۔

مزاج کی نیک، ہمدرد، غریب پرور، اور بڑی فیاض تھیں، گھر میں جو کچھ آتا، بانٹ کر رکھ دیتیں اور بچا بچا کر رکھنا تو جیسے جانتی ہی نہ تھیں۔ بارہا ایسا ہوا کہ ہم لوگوں کو حصہ بس واجبی ہی سا ملا۔ اور ہم لوگ کہ ان کی اولاد تھے، جھنجھلا کر رہے، ایسا بھی ہوا کہ خاصے کی چیز اٹھا کر کسی غریب پڑوسن یا عزیز کے یہاں بھیج دی۔ اور خود موٹے جھوٹے پر گزر کرلی۔ عفت و حیاداری کے جس ماحول میں ساری زندگی گزاری، اس کا اب سمجھ ہی میں آنا مشکل ہے، شرمیلی اتنی تھیں کہ اپنی ہی سی شریف و معزز، لیکن اجنبی بیویوں سے ملتے میں جھجکتیں، ان سے باقاعدہ پردہ کرتیں، والد مرحوم کے ہمراہ شہروں شہروں گھومتی رہیں، لیکن سوا اپنی برادری کی جانی پہچانی بیویوں کے کسی کو اپنے سامنے

لانے کی روادار نہ ہوئیں۔ سیتاپور میں جس کوٹھی میں ہم لوگ تھے، اس کے سامنے کے بنگلہ میں سرسید کے بھتیجے پنشنر سب جج اور کھرے سید رہتے تھے، ان کی بیگم صاحبہ نے ملاقات کے لئے بار بار کہلایا، نہ خود گئیں نہ ان کے آنے پر ہامی بھری، آخر ایک روز وہ خود ہی زبردستی آکر اُتر پڑیں۔

۵۹ سال کی عمر میں بیوہ ہوئیں اور چند سال پھر تنگ دستی کے اُٹھائے، بھائی صاحب کی تنخواہ اس وقت قلیل تھی، اور وہ صاحب اولاد بھی ہو چکے تھے، اور میں تو کچھ بھی نہیں کمار ہا تھا۔ گاڑی، گھوڑا اور گھر کا زائد سامان سب الگ کرنا پڑا، معیار معیشت نیچے لانا پڑا، کھلے ہوئے ہاتھوں کا روکنا مشکل ہی ہوتا ہے، خیر اللہ نے لشتم پشتم گزار دی، اُدھر بھائی صاحب کی تنخواہ بڑھنے لگی، ادھر میری بھی آمدنی ہونے لگی، اس پر بھی میں دیکھتا تھا کہ جس طرح والد مرحوم سے لڑ جھگڑ کر وہ لیتی تھیں اس کے آدھے کی بھی فرمائش ہم لوگوں سے نہ کریں ——— شوہر کی کمائی اور اولاد کی کمائی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ شوہر سے بیبیاں مچل کر، جھگڑ کر حاصل کر لیتی ہیں، بیٹوں سے کہتے ہوئے مائیں خود لجی جاتی جھجکی جاتی ہیں۔ اُلٹی خود ان کی مروت میں، رعایت میں دبی ہوئی، پسی ہوئی رہتی ہیں۔ یہ حقیقت شروع شروع سمجھ میں نہ آئی، جب اپنا ادھیڑ سن آیا، جب جا کر آنکھ کھلی اور اب تو ایک موٹی سی بات معلوم ہوتی ہے۔

شوق عبادت میں اپنی نظیر آپ تھیں، عمر طویل پائی، اشراق و چاشت دونوں نمازوں کا کیا ذکر ہے، تہجد تک میرے علم میں ناغہ نہ ہونے پاتی اور ہمت کا کمال یہ تھا کہ شب کے اخیر حصہ میں نماز وقت فجر سے گھنٹہ پون گھنٹہ قبل اٹھنے کے بجائے عین درمیان

شب میں اٹھ بیٹھتیں اور وضو کر کے چار یا آٹھ رکعتیں ہی نہیں، پوری بارہ رکعتیں کھڑے ہو کر پڑھتیں اور پھر نماز فجر، اول وقت، منہ اندھیرے پڑھ ڈالتیں!۔۔۔۔یہی حال روزے کی پابندی کا تھا۔ عمر اور ضعف کو دیکھ کر ہم لوگ برابر یہ کہا کرتے کہ اب آپ پر روزہ فرض نہیں، ایک نہ سنتیں، اور رمضان کے روزے تو بڑی چیز ہیں، عاشورہ محرم، عرفہ ذی الحجہ وغیرہ کے مسنون و مستحب روزے تک چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتیں۔ حج و زیارت کی بھی بڑی مشتاق رہا کرتیں۔ حج بیت اللہ کی سعادت تو اللہ نے نصیب کرادی۔ زیارت مدینہ منورہ، مقدر میں نہ تھی، شوہر کا انتقال معًا بعد فرائض حج ۱۴ ار ذی الحجہ کو ہو گیا اور بیوہ کو کوئی صورت سفر کی باقی نہ رہی بجز واپسی وطن کے۔ یہ حسرت آخر تک دل میں رہی اور یہ دلی حسرتِ زیارت وہ کام کر گئی جو شاید خود زیارت بھی نہ کر سکتی۔ سفر حج اور نماز تہجد، دونوں کے تذکرے ایسے مزے لے لے کر بیان کرتیں کہ سننے والیوں کے دل میں وہی ولولہ و حوصلہ پیدا ہو جاتا!

نماز فجر سے اول وقت فراغت حاصل کر کے، اسی جانماز پر بیٹھی ہوئی، کڑوے تیل سے جلنے والے چراغ کی روشنی میں قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دیتیں اور جس مشقت و تعب سے ایک ایک لفظ اٹک اٹک کر ادا کرتیں وہ منظر بھی دیکھنے کے قابل ہوتا! اشراق پڑھ کر جانماز سے اٹھتیں اور پھر خانہ داری کے کارخانہ داری میں لگ جاتیں۔۔۔۔صلۂ رحم میں، عزیزوں، قریبوں، ہمسایوں کے ساتھ حسنِ سلوک میں اپنی مثال آپ تھیں، بڑی خود دار اور غیرت مند تھیں۔ لیکن خودی سے ناآشنا۔ اپنی نادار جٹھانی، یعنی میری چچی کا لحاظ خصوصیت سے رکھتیں اور انھیں ان کی ناداری کا احساس ہی نہ ہونے دیتیں۔ اپنے میاں کی کمائی انھیں مخدومہ کے ہاتھ

سے خرچ کرائیں اور دیکھنے والوں پر اثر یہ پڑتا کہ جیسے گھر کی مالکہ یہ خود نہیں بلکہ وہی مخدومہ ہیں۔ اس ظرف کی مثال بس تلاش ہی سے کہیں ملے گی تو ملے۔

شروع میں ماحول کے اثر سے بدعات کا رنگ غالب تھا، جوں جوں صحیح تبلیغ اس تباہ کار کی زبان سے ہوتی گئی لغو رسمیں ایک ایک کر کے چھوڑتی گئیں۔ یہ نہیں کہ ضد میں آکر انھیں پر جمی بیٹھی رہتیں۔ اپنی ایک ہی لڑکی یعنی میری ہمشیر معظمہ کو، جہاں تک عبادت کا تعلق ہے، اپنے ہی رنگ میں پوری طرح رنگ لیا تھا بلکہ کچھ اپنے سے بھی بڑھا دیا تھا۔ اپنے ہی نہیں بلکہ اپنے شوہر کے بھی بھتیجوں، بھانجوں کو اپنی ہی اولاد کی طرح سمجھتیں۔ شب بیداری کے باعث دوپہر کو قیلولہ ناگزیر تھا۔ ورنہ دن بھر گھر کے کام کاج میں لگی رہتیں۔ حالاں کہ باہر کی طرح اندر بھی خادمائیں کئی کئی تھیں۔ کھانا ۲۰، ۲۲ آدمیوں کا پکتا، خود ہی اس کا سارا انتظام رکھتیں اور خود ہی اپنے ہاتھ سے دونوں وقت کھانا نکالتیں۔

عام صحت آخر تک اچھی رہی، چلتی پھرتی رہتی تھیں۔ البتہ گران گوشی بہت بڑھ گئی تھی اور آنکھیں بھی بنوانا پڑیں تھیں۔ دبلی پتلی کشیدہ قامت رنگ صاف، جامہ زیب تھیں۔ بیعت اپنے خاندانی سلسلہ قادریہ رزاقیہ (ہانسہ) میں تھیں۔ اخیر سن میں عقیدت خصوصی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے ہو گئی تھی۔ آخرت کا خیال عمر بھر رہا اور اخیر وقت کام آیا۔ اپریل ۱۹۴۱ء میں جب بھائی صاحب فیض آباد میں ڈپٹی کلکٹر تھے، یہ انھیں کے پاس تھیں کہ بخار میں مبتلا ہوئیں اور ایک مختصر سی شدید علالت کے بعد ۱۳ اپریل (۱۵ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ) یوم یک شنبہ کو اخیر وقت عصر میں، میری زبان سے سورۂ یٰسین سنتے سنتے رحلت فرما گئیں۔ عمر ۸۷، ۸۸ کی پائی۔ میت

غسل کے بعد ہم لوگ لاری پر رکھ کر دفن کے لئے دریاباد لے آئے۔ اور یہیں اپنے حسب خواہش خاندانی مسجد کے عین پشت پر، قدیم گورستان میں جگہ پائی۔ اذان کی آواز کی جیسے عاشق تھیں، کہا کرتی تھیں کہ قبر ایسی جگہ بنے جہاں اذان کی آواز سنائی دے۔ اللہ نے مومنہ صالحہ کی آرزو پوری کر دی! ـــــ زندگی میں آخری کلمہ جو زبان سے ادا ہو سکا، اور وہ مجھ نالائق کو مخاطب کر کے تھا، یہ تھا کہ "بھیا اب سورۂ یٰسین پڑھ دو"

میرے اوپر شفقت کی انتہا نہ تھی، لڑکپن بھر، بلکہ جوان اور صاحب اولاد ہونے کے بعد بھی، میری طرف سے بدتمیزیوں میں کوئی کسر اٹھا نہ رہی، ایسی کہ اس تکلیف دہ عنوان کی کہ تفصیل کی تاب بھی قلم کو نہیں، ہر بار افراط شفقت سے معاف ہی فرماتی رہیں اب جب کہ اپنی عمر ڈھل چکی اور وہ بھی زیادہ تر حضرت تھانویؒ کے فیض صحبت سے، کچھ تھوڑا بہت احساس ماں کے حقوق کا ہوا تو اللہ نے دنیا کی وہ سب سے بڑی برکت اور نعمت واپس ہی لے لی ـــــ باپ کی طرح ماں بھی جس درجہ کی نعمت ہے، اس کا پورا اندازہ بھی اس نعمت کی موجودگی میں شاید ممکن نہیں، بہر حال "من نہ کردم شما حذر بکنید"۔ آج جو خوش قسمتی سے اپنے والدین رکھتے ہیں اور اپنی بدنصیبی سے اس نعمت کی ناقدری اور بے توقیری کر رہے ہیں، شاید کہ ان سطروں سے کچھ سبق حاصل کر لیں اور قبل اس کے کہ وقت بالکل ہی ہاتھ سے نکل جائے، کچھ تھوڑی بہت تو تلافی مافات کر لیں، ورنہ پچھتاوا ساری عمر کا رکھا ہوا ہے۔

باب (۴)

بھائی بہن

بھائی بہن پیدا تو کل پانچ ہوئے. سب مجھ سے بڑے، زندہ صرف دو رہے' ایک بھائی، دوسری بہن. ذکر پہلے بہن کا سنئے.

سن میں مجھ سے کوئی پانچ چھ سال بڑی. نام پہلے ظریف النساء رکھا گیا تھا. پھر بارہ تیرہ سال کی عمر میں بدل کر بی بی سکینہ کر دیا گیا. قد کی چھوٹی، چہرہ گول اور بھرا ہوا، رنگ خوب صاف، صورت شکل میں ممتاز، اتنی بے نفس دبے زبان کہ اچھی صالح بیبیوں میں ایسی مثال کمتر ہی ملے گی. نہ کسی سے لڑائی بھڑائی، نہ کسی کی غیبت و بدگوئی (اور خیر کسی سے رشک و حسد کا تو ذکر ہی کیا)، ہنس مکھ چہرہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک، عبادت الٰہی بس اوڑھنا بچھونا. اسی میں جوانی پوری کی پوری گزار دی. والدین کی اطاعت تو گویا فریضۂ زندگی ہی تھا. بڑے بھائی کو بھی کبھی الٹ کر جواب نہ دیا. خود مجھ سے جو اتنا چھوٹا تھا اپنے کو چھوٹا ہی سمجھا کیں، انھیں اتنا دبا ہوا پایا کریں اور ہر طرح ان پر شیر ہو گیا، اور اپنا اچھا خاصا سن آجانے پر بھی، ان غریب سے یہ برتاؤ رکھا کہ جیسے میں بڑا ہوں اور وہ چھوٹی ہیں! ——— نفس کی کمینگی اور خباثت سے اللہ کی پناہ!

اردو کی معمولی سی تعلیم پا کر بس بچپن ہی سے مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں پڑ گئیں اور خوف آخرت دل میں ایسا بیٹھا کہ اپنے کو گویا عبادت ہی کے لئے وقف کر دیا. کئی

کئی پارے قرآن مجید کے مع اُردو ترجمہ کے ان کی روزانہ تلاوت کا معمول۔ پنج وقتہ طویل نمازوں کے علاوہ اشراق، چاشت، اور تہجد کی نمازیں داخلِ معمول۔ کمزوری و ناطاقتی کی بنا پر روزے میں ذرا کچی تھیں، پھر بھی رمضان کا کوئی روزہ چھوٹنے نہ پاتا، حج و زیارت کی اس درجہ شائق کہ کہنا چاہئے کہ ۱۹۱۲ء میں انھیں کا اصرار اور تقاضا والد ماجد مرحوم کو حج کے لئے لے گیا۔ زکوٰۃ کا حساب باقاعدہ رکھتیں اور یوں عام داد و دہش میں خدا معلوم کتنا دے نکلتیں۔ شادی سے قبل ۱۴، ۱۵ سال کے سن میں عام صحت بہت گر گئی تھی۔ ایک طبیب حاذق نے نبض دیکھ کر والد ماجد مرحوم سے کہا کہ ہولِ آخرت ان کے دل میں بیٹھ گیا ہے۔ قیامت نامہ وغیرہ پڑھنا ان سے چھڑا دیجئے۔ صرف بہشت نامہ وغیرہ پڑھتی رہیں۔ عقد اپنے چچا کے لڑکے ڈاکٹر محمد سلیم کے ساتھ ہوا۔ نسبت بچپن ہی سے لگ گئی تھی۔ سیتاپور میں تقریب بہت سادگی کے ساتھ انجام پا گئی۔ شوہر کے ساتھ پردیس میں بہت کم رہیں۔ زیادہ قیام والدہ ماجدہ کے ساتھ رہتا، انھیں کی خدمت میں لگی رہتیں اور گویا ان کی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن گئی تھیں۔ اولاد کوئی نہیں ہوئی، شاید اللہ نے اس میں بھی انھیں کے مذاق کی رعایت رکھی کہ دنیا کے بکھیڑوں، جھمیلوں سے اپنے کو بچائے ہی رکھنا چاہتی تھیں۔ اعتقاد زندہ و مرحوم سب ہی بزرگوں سے رکھتی تھیں۔ اخیر میں میرے اثر سے خصوصی اعتقاد حضرت مولانا تھانوی کے ساتھ ہو گیا تھا۔ میرے ہمراہ تھانہ بھون کی حاضری بھی رہی۔ شوہر کا انتقال ۱۹۲۳ء میں مرض دق میں ہو گیا۔ اس وقت ۳۶، ۳۷ سال کی تھیں، بقیہ بیوگی کا ۲۲ سالہ زمانہ طاعتِ الٰہی و خدمت خلق کے لئے وقف رکھا۔ زندگی کی رنگینی اور شوقینی گویا جانی ہی نہیں۔ جب نیک نفسی کا ذکر چلتا، خاندان میں ان کا نام بطور نمونہ و مثال لیا جاتا۔

اپریل ۴۵ء میں بیمار پڑیں اور بڑی ہی تکلیف دہ علالت اُٹھائی۔ لکھنؤ کے حکیموں، ڈاکٹروں اور بزرگوں نے دوا اور دُعا کا سارا زور لگا ڈالا، ہوا وہی جو ہونا تھا ـــــ ۲۲؍اپریل ۱۹۴۵ء (جمادی الاول ۱۳۶۴ھ) کو بعد دوپہر اپنے مالک و مولیٰ سے جا ملیں۔ نماز جنازہ ایک مجمع نے وقت کے ایک مقبول و برگزیدہ بندہ حاجی محمد شفیع بجنوری کے اقتدار میں ادا کی۔ یہ بزرگ عین نزع کے وقت، متصل کمرے میں بیٹھے ہوئے مشغول ذکر و توجہ تھے۔ عیش باغ (لکھنؤ) کے مشہور گورستان میں دفن ہوئیں قبر میں اُتارنے والوں میں ایک یہ نامہ سیاہ بھی تھا۔ کسی کی قبر میں اُترنے کا یہ زندگی میں پہلا اتفاق ہوا۔

والدہ ماجدہ کے بعد، خالص بے لوث، بلا توقع مُزد و معاوضہ کا مزا انھیں کے دم سے تھا۔ اور میرے اوپر تو گویا جان ہی چھڑکتی تھیں۔ لفظ "معصوم" کا اطلاق اگر انبیاء معصوم کے علاوہ بھی دنیا میں کسی کے لئے کسی درجہ میں جائز ہو تو عجب نہیں کہ اس مرحومہ کا شمار بھی انھیں گنی چنی مثالوں میں ہو ـــــ عجب ذات والا صفات تھی اس مرحومہ کی، جس کی کوئی قدر اس بدنصیب نے زندگی بھر نہ کی۔

بھائی عبدالمجید صاحب مجھ سے سن میں آٹھ سال بڑے تھے، اور ہمشیر مرحومہ سے دو سال، سال ولادت ۱۸۸۴ء طبعاً نیک، سادہ مزاج، ذی مُروّت، تعلیم گھر پر حسب دستور، اردو، فارسی کے بعد، کچھ عربی کی بھی پائی، عربی میں زیادہ نہ چل سکے، کچھ تو اس لئے کہ استاد کوئی اچھے نہ ملے اور کچھ اس لئے کہ ضیق النفس کا روگ بچپن ہی سے لگ گیا تھا۔ اس لئے اسکول اور خانگی دونوں تعلیموں کا بار سنبھلنا مشکل تھا۔ علاج والد مرحوم

نے خدا معلوم کتنے کرڑوا نے مرض نہ جانا تھا نہ گیا۔ جوانی تو خیر، کسی طرح گزر گئی جاڑوں بھر دورے پر دورے شدت کے ساتھ پڑتے اور یہ کسی نہ کسی طرح جھیل ہی جاتے۔ بڑھاپا آیا تو قوت برداشت جواب دے گئی۔ سارا موسم گویا رو رو کر گزرتا۔ اور بھی کئی کئی بیماریاں زائد پیدا ہو گئیں۔

مرض خنان بھی شروع سے دامن گیر رہا۔ لشتم پشتم انٹرمیڈیٹ ۱۹۱۰ء میں لکھنؤ کرسچین کالج سے پاس کیا۔ اس وقت کا ایف اے، آج کے ایم اے کے برابر تھا۔ والد صاحب کے اثر سے یہ نائب تحصیل دار ہو گئے۔ ضلع الٰہ آباد اور رائے (جالون) اور ضلع لکھنؤ کی تحصیلوں میں ہوتے ہوتے چند سال میں تحصیلدار ہو گئے۔ اور پھر تحصیل لکھنؤ کی تحصیل داری کے مرحلے سے گزر کر ۱۹۲۴ء میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ گونڈا، بستی، پرتاب گڑھ، سیتاپور، بہرائچ، فیض آباد کے ضلعوں میں حکومت کی کرسی پر بیٹھے ہوئے بالآخر ختم ۱۹۴۲ء کے قریب لکھنؤ کی ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ کے عہدے سے پنشن لی۔

تنخواہ ایک ہزار تک پہنچ گئی تھی (آج کے معیار سے ۴، ۵ ہزار) نوکر چاکر کئی ایک اور گھوڑا گاڑی پہلے ہی سے تھے، آخر میں موٹر بھی رکھ لیا تھا۔ اور خاصی خوش حالی سے گزر بسر کرتے رہے، جہاں رہے مقبول و نیک نام ہی رہے، دیانت داری میں والد مرحوم ہی کے قدم بہ قدم رہے اور رشوت کو ہر حال میں حرام مطلق ہی سمجھے۔ اور ہموں کے ساتھ حسن سلوک و فیض رسانی میں مشغول رہے۔ ان کی بیوی میرے سابقہ میں ان سے بھی کچھ بہتر ہی ثابت ہوئیں۔ ۴۰، ۴۱ سال کی طویل مدت میں مجھ سے ایک بار بھی شکر رنجی کی نوبت نہ آئی۔ بلکہ جب بھائی صاحب سے مجھ سے بہ تقاضائے بشریت کوئی صورت بے لطفی کی پیدا ہونے لگتی تو الٹی میری طرف سے صفائی پیش

کر دیتیں۔ چار لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑ کر ۱۱ر ستمبر ۱۹۵۱ء (۸ر ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ) کو کُل ایک دن کی علالت اور بے ہوشی کے بعد اللہ کو پیاری ہوگئیں اور عیش باغ لکھنؤ میں جگہ پائی۔ سکون خاطر میں بڑا دخل، خانگی امن وسکون کو ہوتا ہے۔ اور یہ بہت کچھ، بلکہ شوہروں سے زیادہ ہی بیویوں کے ہاتھ میں رہتا ہے، خوش نصیب ہے وہ بیوی جس کی ذات گھر میں بجائے شر و فساد کے، خیر و عافیت کا باعث بنے۔

رفیقۂ حیات کی مفارقت سے بھائی صاحب کا مغموم و متاثر رہنا تو ظاہر ہی ہے لیکن ایک اچھا اثر یہ بھی پڑا کہ تلاوت قرآن روزانہ پابندی سے کرنے لگے، اور نماز کے تارک تو بحمد اللہ پہلے بھی نہ تھے، اب زیادہ پابند ہو گئے۔ پنشن لے کر وطن نہیں آئے لکھنؤ ہی کو وطن بنایا اور مسلمانوں کے مختلف رفاہی اور فلاحی کاموں میں (درس گاہوں یتیم خانوں وغیرہ) کی اعزازی خدمتوں میں لگ گئے۔

۱۹ر دسمبر ۶۶ء کو لکھنؤ میں تھا، ان کی صحت جیسی رہتی تھی بس ویسی ہی تھی۔ ۱۱ بجے دوپہر کو میں دریاباد کے لئے رخصت ہوا، پھاٹک تک حسب معمول مجھے پہنچانے آئے اور "خداحافظ" کہا —— کون جان سکتا تھا کہ یہ خداحافظ اُن کی آخری آواز ہے جو میرے کان میں پڑی۔ دن بھر اپنے معمولات پورے کئے ۲½ بجے رات کو اپنے منجھلے لڑکے کو پاس کے پلنگ سے جگایا۔ سانس خوب پھول رہی تھی (دمہ کے ہر دورہ میں یہ ہوتا ہی رہتا تھا)، بولے بڑی تکلیف ہے اور پکارے کہ اے اللہ رحم کر! بڑا لڑکا اور دوسرے اعزہ جاگ کر آئے، خمیرہ گاؤ زبان آب زمزم ملا کر دیا، اور خاتمہ منٹوں نہیں، سکنڈوں کے اندر ہو گیا! —— بندۂ مومن کا چہرہ از خود قبلہ رُخ ہو گیا۔

مجھے خبر پہونچی، ہم سب دریاباد سے بعد دوپہر پہنچے، جنازہ تیار تھا، کفن پوش چہرہ پُرنور

ایمان کی جھلک نظر آئی چارپائی پر وہیں لیٹے ہوئے تھے، جہاں مجھ سے آرام کرسی پر ملتے تھے، اور کس للک سے مجھے بٹھاتے تھے، جیسے مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے ہوں! آج سرے سے خاموش اور غیر ملتفت تھے! ــــــ مجمع میرے اندازے سے کہیں زائد، ندوہ اور فرنگی محل کے علماء، ایک دو نہیں، کئی کئی موجود۔ شہر کے دوسرے صالحین واخیاران کے علاوہ، نماز جس دل سے بھی بن پڑا، اسی گنہ گار نے پڑھائی۔ لاشعور میں یہ دعا جاری تھی کہ "اے مالک، تیرے رسول نے یہ خبر پہنچائی ہے کہ تو نرم مزاجوں سے شفقت وکرم کا معاملہ رکھتا ہے، تیرا یہ بندہ بھی نرم مزاج تھا، اب تیری ہی رحمت کے حوالہ ہوتا ہے"۔ ۱۰/ دسمبر ۱۹۶۰ء (رجب ۱۳۸۰ھ) کو ۳ بجے سہ پہر کو قبر میں اُتارا، عیش باغ کے مشہور گورستان میں مدتوں اسی گورستان کمیٹی اور انجمن اصلاح المسلمین کے سکریٹری رہ چکے تھے۔

اخباری ماتم کے علاوہ تعزیت نامے بھی مدت تک آتے رہے، بعض اہل دل اور اہل علم کے بڑے موثر بھی تھے۔ بڑے لڑکے حکیم حافظ عبدالقوی سے ایک کتاب ذکرِ مجید کے نام سے لکھوادی۔ وہی بیٹے جا کر ان کی طرف سے حج بدل بھی کر آئے۔

میرے ساتھ انھیں محبت بھائی کی سی نہ تھی، ایسی تھی جیسے والدین کو اولاد سے ہوتی ہے، حالاں کہ سن میں مجھ سے کل آٹھ ہی سال بڑے تھے۔ زندگی میں ایسے موقع بھی پیش آتے رہے کہ انھوں نے مجھے خطرہ سے باہر رکھنے کے لئے اپنی اولاد کو خطرہ میں ڈال دیا اور رہی مالی امداد تو انھوں نے سالہا سال جاری رکھی۔

باب (۵)

دوسرے اعزہ اقربا

میں نے اپنے اجداد میں سے کسی کا زمانہ نہیں پایا۔ میرے والد بھی خود ہی اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد تھے، اور میں ان کی سب سے چھوٹی اولاد۔ قدرتاً اپنے دادا، نانا میں سے کسی کو نہیں دیکھا۔ صرف اپنی نانی کا بالکل اخیر، اور معذوری کا زمانہ یاد ہے۔ پلنگ پر مستقل فریش تھیں، بینائی بھی جا چکی تھی۔ لڑکیاں، بہوئیں، پوتیاں، نواسیاں ہر وقت خدمت میں لگی رہتیں، یہی اس زمانہ میں شریف گھرانوں کا عام دستور تھا۔ یہ نہ تھا کہ بوڑھوں کی خبر گیری کے لئے کوئی نرس یومیہ کرایہ پر بلائی جاتی۔ خدمت میں میری والدہ خاص طور پر پیش پیش رہتی تھیں۔

میرا سابقہ بڑے رشتوں میں صرف ماموں، چچا، خالہ، پھوپھی وغیرہ سے پڑا سب میرے حق میں شفقت مجسم خصوصاً حقیقی چچا۔ یہ کسی چھوٹی سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر اب خانہ نشین تھے اور آدمی پڑھے لکھے تھے، معمولی دوا علاج، دعا تعویذ کیا کرتے، خوش نویس بھی تھے، اخبار اس وقت ایک نادر چیز تھے، یہ کوئی نہ کوئی اخبار منگاتے رہتے۔ پانچ سال کے سن کی بساط ہی کیا۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ لغت فارسی کی ضخیم کتاب برہان قاطع اور روزنامہ اودھ اخبار کی جلدیں ان کے پاس تھیں، سحر خیز اور نماز کا پابند اتنے ہی سن میں انھوں نے مجھے بنا دیا تھا۔

پھوپھیاں پانچ تھیں۔ دو دریاباد ہی میں بیاہی ہوئی تھیں، ہیں دونوں کا چہیتا ماموں تین تھے، چھوٹے ماموں کا شمار جوار کے مشاہیر میں تھا۔ عربی کے عالم و حاذق طبیب، کیننگ کالج لکھنؤ میں فارسی کے استاد تھے اور لکھنؤ ہی میں مطب بھی کرتے رہے۔ ہر ہفتہ دریاباد آنے کے پابند۔ شرح سکندرنامہ کے مصنف۔ چار خالائیں تھیں، میں سب کا دُلارا۔ آخری کا انتقال ۱۹۲۸ء میں ہوا، جب میں ۳۶ سال کا ہوگیا تھا۔ انھیں شفقت میں ماں سے کم نہ پایا۔

خاندان بڑا تھا، رشتے ناتے کی بھاوجیں، بہنیں، چچیاں، ممانیاں، جیسی سب کی ہوتی ہیں، میری بھی تھیں اور آپس میں رنجشیں، چشمکیں، جنگیں بھی جاری تھیں۔ لیکن میرے والدین کی صلح سب سے تھی اور یہ اللہ کی ان خصوصی نعمتوں میں سے ہے، جو میرے ساتھ رہی۔ لڑائی جھگڑا الگ رہا، دُور کے عزیز بھی بالکل قریب کے معلوم ہوتے رہے۔

چچازاد بھائی دو تھے، دونوں بہت بڑے، عملاً دونوں حقیقی ہی بھائی۔ بڑے کا نام عبدالحلیم تخلص اثر دوقت کے مقبول اور مشہور ناول نویس مولوی عبدالحلیم شرر کے جوڑ پر)، شعر خدا معلوم کبھی کہا یا نہیں۔ شعر و ادب کے رسیا ضرور تھے۔ دیوان حالی سب سے پہلے انھیں کے پاس دیکھنے میں آیا۔ پڑھے لکھے وقت کے معیار سے اچھے خاصے، یعنی درجہ انٹرمیڈیٹ تک انگریزی اور اردو دونوں میں صاحب استعداد، فارسی بلکہ عربی کی بھی شد بد سے واقف۔ میری ابتدائی تعلیم و تربیت میں بڑا دخل انھیں مرحوم کو تھا۔ اخبار سناتے، کتابیں دکھاتے، پڑھواتے۔ شرر کی فردوس بریں اخباروں میں اودھ پنچ، اودھ اخبار اور انگریزی کے آبزرور (لاہور) اور پانیر

(دالہ آباد) کے نام اور شکل سے میں انھیں کے ذریعہ واقف ہوا۔ سر سید، سید محمود، شبلی، حالی، نذیر احمد، ریاض وغیرہ کے نام انھیں کی زبان سے سُنے۔ دین کی بھی بڑی غیرت وحمیت رکھتے تھے، شادی بانسہ میں ہوئی تھی۔ اخیر دسمبر ۱۹۰۳ء تھا وہیں عُرس میں گئے ہوئے تھے، کہ یک بیک طاعون میں مبتلا ہوئے اور دو تین دن کے اندر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میں اس وقت کل دس، گیارہ سال کا تھا۔ اللہ بال بال مغفرت فرمائے، میرے سب سے پہلے محسن و مُربّی کہنا چاہئے کہ یہی تھے۔

اُن سے چھوٹے کا نام محمد سلیم تھا۔ یہ میرے بہنوئی بھی ہو گئے۔ لیکن اپنی یگانگت کے لحاظ سے آخیر تک بہنوئی نہیں، بلکہ حقیقی بھائی ہی بنے ہوئے۔ چھوٹے ڈاکٹر یا اسوقت کی اصطلاح میں سب اسسٹنٹ سرجن تھے۔ عمر ان کی بھی بے وفا ثابت ہوئی۔ ۴۸، ۴۹ کا سن ہوگا کہ دق میں مبتلا ہوئے اور کوئی پانچ مہینے کے بعد اگست ۱۹۲۳ء میں رہ گزارِ آخرت ہو گئے۔ میرے والد مرحوم کے ہمراہ جا کر حج بھی کر آئے تھے، مزاج کے تُند تھے، لیکن ہم لوگوں کے حق میں بالکل بھائی۔ اپنے کوئی اولاد نہ تھی، جو کچھ کماتے، سب ہم ہی لوگوں پر لگا دیتے اور میری تو چھوٹی بڑی ہر ضرورت کے کفیل تھے۔

خالہ زاد بھائیوں میں نمبر اول حکیم حاجی عبدالحسیب مرحوم کا آتا ہے، لکھنؤ کے نامور طبیب، شفاء الملک۔ صدر انجمن طبیہ۔ یو، پی ممبر انڈین میڈیسن بورڈ وغیرہ۔ بڑی شہرت حاصل کی، سن میں مجھ سے ۱۳، ۱۴ سال بڑے تھے، لیکن شروع ہی سے بڑے بے تکلف رہے۔ شروع شروع میں اخبار یا کتاب جو منگانا پڑتی انھیں کے پیسے سے منگاتا، علم مجلس میں ماہر، اور بڑے بذلہ سنج۔ لکھنؤ کے عمائد میں شمار ہوتے رہے، اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء میں چند منٹ کی علالت میں دار فانی سے گزر گئے۔ جنازہ دریاباد لایا گیا۔ نماز

یہاں دوبارہ ہوئی۔ ایک دوسرے خالہ زاد بھائی شیخ نعیم الزماں سندیلوی تھے، عمر میں ان سے بھی بڑے، تعلیم ضابطہ سے تو کچھ ایسی نہ تھی لیکن اپنی ذہانت اور کتب بینی سے بہت کچھ پڑھ گئے اور بہت کچھ کڑھ گئے تھے۔ قوت گویائی میں اپنی نظیر آپ، تاریخ، جغرافیہ اور تصوّف میں خوب درک پیدا کرلیا تھا۔ میں نے ایک زمانہ میں بہت کچھ ان سے سیکھا لکھنؤ میں ۱۹۴۴ء میں وفات پائی۔

مرحوموں میں ایک عزیز اور ایک عزیزہ کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ عزیزوں میں میاں سید ممتاز احمد رزاقی بانسوی، رشتہ میں مجھ سے چھوٹے، یعنی پھوپھی زاد بھائی کے لڑکے لیکن سن میں دس، بارہ سال بڑے اور بڑے باغ و بہار بلکہ شوخ وطرار، ایک زمانہ تک ان سے بڑا لطف رہا۔ اور میری شادی وغیرہ کے معاملات میں بڑے معین و معاون و کارگزار رہے ـــــــ اور عزیزہ تھیں ایک خالہ زاد بہن اور رضاعی خالہ سن میں مجھ سے سات سال بڑی۔ حسن و جمال میں اپنی نظیر آپ، امیر گھرانے کی لڑکی، کم سنی ہی میں شادی ایک امیر تر گھرانے میں ہوئی اور مہینوں کے اندر بیوہ ہوگئیں۔ بیوہ کے عقد کا نام اس وقت زبان پر کون لا سکتا تھا۔ کن کن مصیبتوں میں، اور کیسے کیسے صبر آزما حالات میں جوانی کا زنداں کاٹا۔ آخر میں ایک ہونہار اور قابل عزیز کے ساتھ خفیہ عقد کرلیا۔ معلوم ایسا ہوا کہ خاندان بھر کی ناک کٹا دی۔ ان شوہر کی بھی زندگی نے وفا نہ کی، دوبارہ بیوہ ہوئیں اور رُو رُو کر عمر کاٹی، مجھ سے تعلق اخلاص کا رکھتی تھیں۔ ان کی مظلومیت ہی انشاء اللہ ان کے حق میں شفیع ہوجائے گی۔ آخر میں بڑی عبادت گزار بھی ہوگئی تھیں۔

عزیزوں کا ذکر ختم ہو گیا۔ ایک غریب و گمنام ضعیفہ کی یاد تقاضا کر رہی ہے کہ میں قابل ذکر ہی نہ سمجھی گئی یہ میری انّا یعنی مرضعہ تھیں۔ سندیلہ کی رہنے والی، گھر کے ایک ملازم کی بیوی، والدہ زچہ خانہ میں بیمار ہو گئی تھیں، اس لئے رضاعت ان سے کرائی گئی۔ جب خود صاحب اولاد ہو گیا اور مذہبی احساس شعور بھی از سر نو بیدار ہوا، تو احساس ہوا کہ بچاری میری کتنی بڑی محسنہ تھیں۔ ہمارے ہاں سے میرے بچپن ہی میں رخصت ہو گئی تھیں۔ اور بیوہ ہوئے بھی سالہا سال ہو چکے تھے، بہر حال اب جیسی تھوڑی بہت خدمت کی توفیق ہوئی، وہ ان کے گھر بیٹھے ان کی کرتا رہا۔ اپنے ہاں قصداً نہیں بلایا کہ برتاؤ میں رکھ رکھاؤ نہ ہو سکے گا۔

انھیں سے متصل دوسری تصویر جھانکتی ہوئی میری کھلائی (قصباتی زبان میں میری بُوا) کی دکھلائی دی۔ اچھی خاصی شریف پٹھان خاندان کی تھیں۔ لیکن مفلسی بہر حال خود ایک جُرم تھی۔ ہمارے ہاں ملازمہ کی حیثیت سے عمر گزار دی۔ اور کبھی کسی ادب تعظیم کے قابل نہ سمجھی گئیں۔ قبل اس کے کہ ان کا حق کچھ ہی سمجھ سکوں ۱۹۰۹ء میں بڑی تکلیف دہ بیماری کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئیں میرے اوپر اس وقت مِل اور اسپنسر اور ہکسلے کا بھوت سوار تھا۔ بوڑھی دائیوں، کھلائیوں کے کسی حق کا تصور کہاں سے دماغ میں پیدا ہوتا!

اللہ دونوں بوڑھیوں کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ——آج کے کتنے گدا "کل" شاہ نکلیں گے آج کے کتنے حقیر و درماندہ کل معزز و سربلند دکھائی دیں گے۔

پیش خلقاں خوار و زار و ریشخند
پیش حق محبوب و مطلوب، دل پسند

باب (۶)

پیدائش۔ بسم اللہ

۱۸۹۲ء میں والد ماجد ضلع لکھیم پور کھیری میں ڈپٹی کلکٹر تھے، اور والدہ ماجدہ دریاباد آئی ہوئی تھیں، کہ میری پیدائش یہیں ہوئی۔ شب کا وقت تھا اور شعبان کی ۱۶ ویں کہ میری پیدائش ہوئی۔ بڑے ہو کر میں نے منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کانپوری (بڑی جنتری والے) سے ٹھیک انگریزی تاریخ دریافت کی جواب آیا کہ ۱۶ ر شعبان ۱۳۱۰ھ کو مارچ ۱۸۹۲ء کی بھی ۱۶ ہی تھی۔ واللہ اعلم۔ لیکن ایک روایت کان میں پڑی ہوئی ۱۵ ر مارچ کی بھی ہے ——— دھوم دھام، مسرت وشادمانی جیسی سب گھرانوں میں ہوتی تھی، میرے لئے بھی ہوئی۔ اور اس کا علم تو عالم الغیب ہی کو ہو سکتا تھا کہ کون نصیبہ کیسا لے کر آیا ہے۔

مسلمان کے گھر میں اس وقت تک یہ دستور تھا کہ اِدھر بچہ پیدا ہوا اور اسپتالوں میں زچگی کا دستور اس وقت تک بالکل ہی نہیں ہوا تھا، اور اُدھر جلدی جلدی نہلا دُھلا اذان اس کے کان میں دے دی گئی کہ جس طرح روح کو اس عالم میں روانگی کے وقت لوری کلمہ طیبہ کی دی جائے گی اسی طرح اس عالم آب وگل میں آمد پر بھی اوّلین لوری کلمۂ پاک کی سُنا دی جائے۔ رضاعت کے لئے علاوہ والدہ ماجدہ کے ایک

انّا کی خدمات بھی حاصل کرلی گئیں۔ اور اتفاق پیش آجانے پر ایک آدھ دن کے لئے بستی کی ایک سیدانی نے بھی میری رضاعت کی۔ بس اس سے زیادہ کوئی بات اس منزل کی قابل ذکر نہیں۔

ابھی پوری بے ہوشی کا زمانہ تھا کہ والدہ ماجدہ کے ساتھ لکھیم پور آگیا۔ بھائی صاحب کو پڑھانے کے لئے دریاباد ہی کے ایک صاحب علم و عمل مولوی صاحب مقرر تھے، اس وقت کے معیار کے مطابق ایک معقول مشاہرہ اور کھانے پر گھر ہی میں رہتے تھے، اور گویا چوبیسوں گھنٹے اتالیقی کا فرض انجام دیتے تھے، میں ابھی پانچویں سال میں بھی نہیں بلکہ چوتھے ہی سال میں تھا کہ والدین نے میری بسم اللہ انھیں مولوی صاحب سے کرادی۔ سُنا ہے کہ میری صحت بچپن میں بہت اچھی تھی، چار سال میں پانچ سال کا معلوم ہونے لگا۔ اس لئے بسم اللہ کرادینے میں کچھ ایسی عجلت معلوم بھی نہیں ہوئی ہوگی۔

"بسم اللہ" اب کیا بتایا جائے کہ یہ متبرک رسم اس وقت بھی کیا۔ ان اوراق کی قسمت میں دیکھئے کب شائع ہونا ہے۔ خدا معلوم اس وقت تک مسلمانوں میں ہی کتنے اس رسم کے جاننے والے اور سمجھنے والے رہ جائیں گے!

انیسویں صدی کے آخر، بلکہ بیسویں صدی کے بھی رُبع اول تک دستور ہر پڑھے لکھے گھرانے میں تھا کہ بچہ ادھر پانچ سال کا ہوا کہ اُدھر اسے عام پڑھائی شروع کرانے سے قبل ایک چھوٹے سے مجمع میں اسے بٹھا، اور قواعد بغدادی نامے ایک پُرانی دُہرائی کتاب اس کے ہاتھ میں دے، لفظ بسم اللہ پر اس کی ننھی سی انگلی رکھا، کسی متبرک شخص کی زبان سے، پوری بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس سے دُہروادی جاتی تھی۔ مولوی صاحب

ایک ایک ٹکڑا الگ الگ کہہ کر کہتے جاتے اور بچہ اسے دُہراتا جاتا۔ اور تبرکاً ایک آدھ دعا اور بھی پڑھادی جاتی۔ بسم اللہ کرانے والے کی خدمت میں حسب توفیق کچھ نذرانہ پیش کیا جاتا۔ حاضرین محفل کو شیرینی تقسیم کردی جاتی، اور سب لوگ، والدین کو مبارک باد دیتے۔ اور بغیر بسم اللہ کی اس تقریب کے تعلیم شروع ہی نہ ہو سکتی —— اُس اسلامی تہذیب وثقافت کی ایک جھلک، جو اِس کی بھی تاکید رکھتی ہے کہ ہر صبح سونے سے اٹھنے والا کیا بچہ اور کیا بوڑھا، کلمہ ہی پڑھتا ہوا اُٹھے!

زمانہ یہی کوئی اخیر ۱۸۹۵ء کا ہوگا، کہ ایک سہ پہر کو بعد عصر، وہیں لکھیم پور میں زنانہ مکان کے صحن میں تخت پر فرش بچھادیا گیا، گھر والے جمع ہوئے۔ اور میں انھیں مولوی صاحب کے سامنے بسم اللہ پڑھنے بٹھا دیا گیا۔ اور رسوائی، زندگی کی پہلی رسوائی کا تماشہ اب شروع ہونے کو ہوا۔ ارد گرد عزیز، دوست، ملازمین کچھ کھڑے ہوئے کچھ بیٹھے ہوئے والدہ وہمشیرہ وغیرہ چلمنوں کی آڑ سے ادھر آنکھیں لڑائے ہوئے ہے۔ سب کے چہروں سے مسرت ٹپکتی ہوئی، لیکن یہ کیا، دیر ہوتی چلی جاتی ہے اور ضدّی لڑکے کی زبان پر بسم اللہ نہیں آتی! مزاج میں شرمیلا پن پیدائشی تھا، وہ اس وقت، اور کیسی بُری گھڑی رنگ لایا جھٹ سے فرفر سنا دینا الگ رہا، یہ بھی نصیب نہ ہوا کہ اٹک ہی اٹک کر کچھ تو زبان سے نکلتا ایک دم چُپ ہو گیا، اَڑ گیا! اب مولوی صاحب بیچارے ہزار چمکار رہے ہیں، بڑھاوا دے رہے ہیں، دلاسا دے رہے ہیں، اور کھڑے بیٹھے جتنے ہیں سب ہی اپنی والی شاباشی کی تھپکیاں دے رہے ہیں۔ لیکن چاروں طرف سے جتنا اصرار ہو رہا ہے، اسی قدر اپنی زبان گنگ سے گنگ تر ہوتی جا رہی ہے —— والد صاحب مرحوم بڑے ہی حلیم المزاج تھے لیکن آخر انسان تھے، غصہ کب تک نہ آتا۔ بھرے مجمع کے سامنے یہ منظر

بالکل خلاف توقع، خلاف امید دیکھ کر اور زیادہ جھنجھلا اُٹھے، بالآخر ایک پتلی چھڑی اُٹھا کر میرے جمادی، ضدّی بچّہ نے مار گوارا کرلی، لیکن زبان نہ کھلنا تھا نہ کُھلی۔ لوگوں نے سمجھا بجھا کر الگ کیا اور کچھ دیر کے لئے مجھے مہلت دلادی۔ اور خوش دلی و مسرت کی تقریب ایک عجیب قسم کی بے لطفی و اُداسی پر ختم ہوگئی۔

کچھ دیر بعد وہی اَن پڑھ کھلائی بالآخر کام آئیں اور مجھے گود میں اُٹھایا، خوب باتوں میں لگایا، خوب بہلایا، اور جب دیکھ لیا کہ بھوت سر سے پوری طرح اُتر چکا ہے تو آخری تیر یہ چلایا کہ "شاباش، کیا ہمارے بھیّا کو بسم اللہ کہنا نہیں آتی! اچھا ذرا پکار کر مولوی صاحب کو تو سنا دے" اب کیا تھا، شرم کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ مولوی صاحب مکان میں تھے، کڑک کے پوری بسم اللہ انھیں دروازے ہی سے سنادی اب کیا تھا۔ اُداس چہرے بحال ہوگئے۔ خوشی کی لہر گھر بھر میں دوڑ گئی، مٹھائی کی تقسیم دُھوم دھام سے ہوئی۔

ابھی ابھی فقرہ زبان قلم سے ادا ہوا ہے کہ "بوا نے مجھے گود میں اُٹھالیا" فقرہ آج سنہ ۶۶ء میں ۷۴، ۷۵ سال کے پیر سال خوردہ کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ ہائے، وہ دایہ کے گود میں جانے کی لذت! اب کیا بیان ہو؟ وہ لذت جس کا بدل، نہ کبھی جوانی کی گرمیاں دے سکیں، نہ کبھی بڑھاپے کی خنکیاں! —— پڑھنے والے اس مقام پر پہنچ کر ایک پیر نابالغ پر ہنسنے اور مضحکہ کرنے میں جلدی نہ کریں۔ عجب نہیں کہ اس سن پر پہنچتے پہنچتے انھیں بھی بچپن کی پیاری معصومانہ شرارتوں کی یاد تازہ ہو جائے! —— غضب کی حسرت ناک سچائی بھر دی ہے کسی نے اس مصرعہ میں۔

دو دن کو اے جوانی دیدے اُدھار بچپن!

جملہ معترضہ سمجھئے مگر یہاں بے ضروری، سرشت کی اُفتادی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ادھر کسی نے سختی کی، اور اُدھر طبیعت مقاومت و بغاوت پر تُل گئی، اور ادھر کسی نے نرمی سے کام لیا اور ادھر اپنی طبیعت بھی مروت سے دب گئی۔ ڈھیلی پڑ گئی، عمر بھر طبیعت کی کجی قائم رہی اور مظاہرے، ناشائستگی کے ہوتے رہے۔ آہ، یہ بدسرشتی جس کی اصلاح عمر کی آخری منزلوں میں بھی نہ ہو سکے! اسی کو کہتے ہیں ع

ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو!

اس سن کی باتیں یاد کس کو رہ سکتی ہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ گھر بھر میں چھوٹے بڑے ہر کام کے لئے، کوئی ملازم موجود تھا یا ملازمہ۔ اپنے ہاتھ سے پانی انڈیل کر پینے کی نوبت بھی مشکل ہی سے آپاتی۔ بڑے ہو کر بھی یہ نہ جانا کہ بستر تہہ کیوں کر کیا جاتا ہے، بستربند (ہولڈال) کے اندر رکھا کیوں کر جاتا ہے، کپڑے پر برش کیسے کیا جاتا ہے، لالٹین جلائی کیونکر جاتی ہے، جوتے کی ڈوریاں کسی کیوں کر جاتی ہیں، گلاس اور لوٹا صاف کیوں کر کیا جاتا ہے نوکر چاکر آخر تھے کا ہے کے لئے! —— نقشہ تنہا اپنے گھر کا نہیں، اوسط درجہ کے ہر مسلم خوش حال گھرانے، خصوصاً ہر زمین دار خاندان کا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اپنا ادنیٰ کام بھی نہ کرنا عیب میں نہیں، ہنر میں داخل، اور عین دلیل شرافت! ۱۹۶۰ء میں بھی یہ خال خال موجود۔

مسلم شریف گھرانوں میں اس وقت عام نصاب درسی کیا تھا؟ یہی کہ سب سے پہلے قواعد بغدادی، پھر قرآن مجید ناظرہ اور ساتھ ساتھ اُردو اور فارسی، اور کچھ تھوڑی بہت عربی بھی۔ اس گھریلو تعلیم کے بعد انگریزی اسکول میں داخلہ، اور حساب جغرافیہ،

انگریزی وغیرہ کی سرکاری تعلیم! جو معاش کے لئے ناگزیر تھی۔ مسلمانوں میں اپنے کلچر اپنی تہذیب اخلاق اپنے شعارِ ملی کے تحفظ کا جذبہ بہرحال زندہ و بیدار تھا، گو بڑی ہی پست سطح پر، اور تحفظ کے طریقے بھی فرسودہ اور نرے رسمی ہو کر رہ گئے تھے، زندگی عملی اور شعوری اعتبار سے جیسی بھی ہو، بہرحال قرآن ہی کی چھوٹی سورتوں کو شروع ہی میں حفظ کر لینا شیخ سعدیؒ کے پندنامہ (کریما) اور گلستاں، بوستاں کو بغیر زیادہ سمجھے بوجھے پڑھ ڈالنا بچوں کے لئے عام تھا۔ اور عقیدے میں باعث برکت و وسیلۂ نجات! اب ۷۰، ۷۵ سال کے بعد یہ سب محض افسانہ ہے یا خواب!

ایک۔ ایک کر کے سب تنکے
ہوئے .. رباد آشیانے کے!

اسلامیت سے بیزاری کی فضا، خود انگریزی ہی حکومت میں کیا کم تھی۔ کہ اس میں جو کمی تھی وہ آزاد ہند کی سیکولر حکومت نے پوری کر دی! انا للّٰہ ثم انا للّٰہ۔

باب (۷)

بسم اللہ کے بعد

گھریلو تعلیم اس عام و مُتداول نصاب کے مطابق شروع ہوئی، مولوی حکیم محمد علی اطہر دہلوی ثم دریابادی، بھائی صاحب کو پڑھانے پر پہلے سے ہی مقرر تھے، وہی میرے پڑھانے کے لئے بھی رہے، بسم اللہ انھیں نے کرائی اور تعلیم ابھی بالکل ہی ابتدائی منزلوں میں تھی کہ وہ اپنے ذاتی وجوہ سے وطن واپس چلے گئے۔ اور میں ان کے فیض صحبت سے محروم ہوگیا۔ وہ آدمی پڑھے لکھے بھی تھے اور خوش عمل بھی۔ اب ان کی جگہ جو دوسرے دریابادی صاحب آئے، وہ ان سے کوئی نسبت نہ علم میں رکھتے تھے، نہ عمل میں۔ بہرحال میرے پڑھانے بھر کو تو وہ بھی بہت تھے۔ اور میری مشرقی گھریلو تعلیم کا بڑا حصہ انھیں سے طے ہوا۔

والد ماجد کا تبادلہ اب گونڈے اور بستی کے مختصر قیام کے بعد گورکھپور ہو گیا تھا اور اب ۱۸۹۷ء تھا۔ اس وقت کی باتیں کچھ کچھ حافظہ میں محفوظ ہیں، درس کے اوقات صبح اور سہ پہر کے تھے۔ دوپہر کو چھٹی رہتی قرآن مجید کا خاص سبق لینا، پرانا آموختہ سنانا اور کتاب پڑھنا، تختی لکھنا، یہ روزمرہ کا معمول تھا۔ ایک شریفانہ مزاج کے ہندو ماسٹر بھائی صاحب کو انگریزی پڑھانے آتے، کچھ دیر ان کے پاس بھی بیٹھنے لگا اور انگریزی کا حرف شناس ہوگیا —— اب یہ سب استاد گمنام و بے نشان ہیں

کوئی صورت ان کے احسان کا معاوضہ کسی درجہ میں بھی کرنے کی نہیں، نہ کوئی ذریعہ اس جانچ کا کہ اگر یہ اپنا مغز اتنا نہ کھپا گئے ہوتے، تو آج میں کہاں ہوتا! ابتدائی درس دینے والے اکثر استادوں کا نوشتۂ قسمت ہی گمنامی و بے نشانی ہے!

اُردو ریڈرین اس وقت مولوی محمد اسماعیل صاحب میرٹھی کی چلی ہوئی تھی۔ اپنے زمانہ و ماحول کے اعتبار سے یہ معیاری تھیں، زبان و انشار کے علاوہ ملی و وطنی، اخلاقی، معلوماتی ہر اعتبار سے اچھی ہی تھیں۔ پانچ حصے تھے، میں نے سب پڑھے اور اردو اول اول انھیں سے سیکھی۔

گورکھپور کا مکان اب تک یاد ہے، اچھا بڑا تھا، دو دو کوٹھے، نیچے دو دو صحن ایک برآمدہ مکتب، یعنی ہم لوگوں کے پڑھنے کے لئے مخصوص، گھر سے کچھ ہی فاصلہ پر ایک یہودی خاندان آباد۔ مسٹر جیک کوئی کاروبار کرتے تھے۔ گورا رنگ اور سفید داڑھی کا نقش اب تک حافظہ میں ہے۔ کوئی مذہبی تقریب ان کے ہاں ہوتی تو ہم لوگوں کو بھی بلاتے۔ سوٹ بوٹ کے باوجود ان کی معاشرت مسلمانوں سے ملتی جلتی ــــ شہر کا چوک بھی کچھ دور نہ تھا۔ مگر اس سن کے بچوں کو، بازار جانے کی اجازت نہ تھی۔ جامع مسجد چوک کے اندر تھی۔ جمعہ کو تو خیر پابندی سے وہاں جانا ہوتا ہی، یوں بھی والد ماجد کبھی کبھی نماز مغرب کو وہاں ٹہلتے ہوئے چلے جاتے۔ واپسی میں بازار کی گرم بازاری کا وقت ہوتا، اکثر مٹھائی وغیرہ کی خریداری ہوتی، ایک خدمت گار ساتھ میں ہوتا، وہ اسے لے کر آتا۔ آہ اس سن کی سادہ دلی اور بے فکری!

والد مرحوم اپنے عہدے سے کہیں بڑھ کر اپنے نرم و شریفانہ اخلاق کی بنا پر شہر

یں مقبول اور ہر دل عزیز تھے۔ شہر خاصہ بڑا تھا اور اودھ سے باہر ہونے کے باوجود تمدن و معاشرت میں اودھ کا ہم رنگ۔ اور آخر کچھ تو اس سرزمین میں ایسی دل کشی تھی کہ اودھ کے البیلے شاعر ریاض خیرآبادی نے اسے اپنا لیا تھا۔ مسلمان رئیس کئی ایک تھے اور جب دیکھئے، تب والد صاحب کی دعوت کسی نہ کسی کے ہاں ہوتی رہتی۔ ایک پنشنر ڈپٹی کلکٹر محمد خلیل صاحب تھے ان کے ہاں کی آم کی دعوت آج تک یاد[1] ہے ایک رئیس مولوی سبحان اللہ خاں اپنی فیاضی اور فراخ دستی کے لئے مشہور تھے۔ بعد کو تحریک خلافت میں نام پیدا کیا، اور پھر اپنا قابل دید کتب خانہ علی گڑھ کو دیدیا۔ ایک نامور وکیل مولوی ابوالفضل احسان اللہ عباسی چریاکوٹی تھے۔ وکالت سے بھی زیادہ اپنی قلمی خدمات کے لئے مشہور۔ قرآن مجید کے مترجم، اور الاسلام و تاریخ اسلام وغیرہ کئی کئی کتابوں کے مصنف۔ اس وقت تو خیر میرا بالکل ہی بچپن تھا۔ لیکن آٹھ دس بعد ان کی کتابوں سے بہت مستفید ہوا۔ دو رئیس اور بھی تھے، مشائخ کے طبقہ میں ایک "میاں صاحب" واجد علی شاہ، دوسرے سید زاہد علی شاہ "سبز پوش" دونوں صاحبان گویا گوشہ نشین تھے۔ لیکن والد صاحب کے مخلصانہ رابطے ان سے بھی قائم تھے۔ تحفہ و تحائف، دعوتیں وغیرہ۔ ہم چشم عہدہ داروں کے نام بھی یاد پڑ گئے۔ ایک قصبہ جائس کے ڈپٹی محمد باقر خان اور دوسرے بدایوں کے خان بہادر ڈپٹی فصیح الدین —— اور دوسرے بہت سے ہندؤں سے بھی تعلقات ایسے ہی گہرے تھے۔

---

[1] کوئی ۵۵ سال بعد انہی خلیل صاحب کی ایک پوتی کی شادی میری بیوی کے حقیقی بھتیجے ولی الزماں پاکستانی کے ساتھ ہوئی۔

کمشنر اتفاق سے ایک بڑا علم دوست انگریز ڈاکٹر ہوئی (HOVEY) تھا، اور ڈسٹرکٹ اور سشن جج ایک دوسرا انگریز، اس سے بھی زیادہ مشہور اہل قلم ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ (SMITH) ہندو عہد کا خصوصی مورخ۔

اور آنے جانے والوں میں سب سے زیادہ جاذب نظر شخصیت ریاض خیرآبادی کی تھی۔ دَور شباب خود ان کا بھی تھا اور ان کے سہ روزہ پرچہ ریاض الاخبار کا بھی— ارے یہ سب کیا لکھتا چلا جا رہا ہوں۔ ان میں سے کسی کا نہ کوئی خاص تعلق میری ذات سے اور نہ پڑھنے والے ہی ان میں سے اکثر سے واقف ہوں گے لیکن کیا کیجئے جب اپنے بچپن کا جائزہ لینے بیٹھا تو یہ یادداشتیں از خود اُبھر آئیں۔ اور اب کسی کو ان میں مزہ آئے یا نہ آئے، لکھنے والا غریب اپنے لطف کا خون یکسر کیسے کر ڈالے۔

اور ہاں، ذکر والد مرحوم کی مذہبیت کا بار بار آرہا ہے تو اس سلسلہ میں یہ بھی سُن رکھئے کہ ان کا لقب زبانوں پر جتنا "ڈپٹی صاحب" تھا، اتنا ہی "مولوی صاحب" بھی تھا۔ نماز روزہ کی پابندی کے علاوہ وضع قطع بھی مولویانہ تھی۔ بڑی داڑھی، لبیں کتری ہوئی، سر پر اکثر عمامہ، جسم پر کبھی کبھی عبا، اور مولوی کے لقب میں اس وقت تک کوئی پہلو تحقیر کا شامل نہیں ہوا تھا۔ ایک تعظیمی لقب ہر عالم دین کے لئے تھا جب تک کوئی ایسا ہی ممتاز، جید فاضل نہ ہوتا، مولوی ہی کہلاتے۔

یہیں ایک بار ایسا ہوا کہ ہمشیر کی علالت کے سلسلے میں والدہ آئیں اور بھائی صاحب کو لے کر ایک حکیم حاذق کے علاج کے لئے سندیلہ چلی گئیں۔ اور میں تنہا والد صاحب کے ہمراہ گورکھپور ہنسی خوشی رہ گیا۔ یہ سچ ہے کہ گھر میں نوکر چاکر متعدد

سکتے پھر بھی پانچ، چھ برس کے بچے کا بغیر والدہ کے اپنی مرضی سے دو تین مہینہ رہ جانا اگر بے مروتی اور اکل کھرے پن کا ثبوت نہ تھا، تو اور کیا تھا! ــــــ ریل کا پہلا سفر اسی زمانہ کا یاد ہے، ریل کے سفر کی خوشی کا اس سن میں کیا کہنا۔ چھوٹے بڑے ہر اسٹیشن کے آنے کی خوشی، گاڑی کی ہر نقل وحرکت سے دل چسپی، گارڈ، ڈرائیور، ٹکٹ چیکر، اسٹیشن ماسٹر ہر وردی پوش کی شکل ہیں دل کشی۔ ٹرین کے ہر پٹری بدلنے کے وقت جوش مسرت، نہ کسی تکلیف کا احساس، نہ کسی ہجوم و ریل پیل سے کوئی خوف وہراس. بس کھڑکی کے پاس بیٹھ، باہر جھانکنا اور خشک وتر منظر سے بس خوشی ہی خوشی محسوس کرنا ــــ آج اس سادہ ذہنیت اس طبعی معصومیت کو واپس بلا لینا۔ کاش کسی قیمت پر بھی ممکن ہوتا!

اب سن ۱۰ سال کا تھا، پڑھائی جاری تھی، اور دل ہر قسم کے پڑھنے لکھنے میں لگ گیا تھا۔ لیکن دوسری طرف کھیل کود اور شرارتوں میں بھی کمی نہ تھی۔ بچپن سب ہی کا جیسا ہوتا ہے، اپنا بھی ایسا ہی تھا۔ اس سن کی بے فکری یاد آتی ہے تو فرط حسرت سے بہ قول شخصے، سینے پر سانپ سا لوٹنے لگتا ہے اور مصرعہ وہی یاد آنے لگتا ہے ؏

دو دن کو اے جوانی دیدے اُدھار بچپن!

اور جوانی کا دور ختم ہونے کے بعد جوانی سے بھی اسی قسم کے خطاب کا جی چاہتا ہے لیکن مرغوبیت بچپن کی اب بھی نمبر اول پر ــــــ شام کے وقت، عین اس وقت یہ یاد پڑ گیا کہ خوانچہ والا، خوانچہ لگا کر آواز دیتا ہوا آتا، اس کا انتظار کس شوق سے ہر روز رہتا، وہ آتا، اور میں چیزیں اس سے لے کر اندر والدہ ماجدہ کے پاس جاتا۔ خریداری اکثر ہو جاتی، اور اپنے حصے میں بھی کوئی مٹھائی آجاتی، کس مزے

سے اسے اچھل اچھل کر کھاتا! گویا گھڑی بھر کے لئے ہفت اقلیم کی بادشاہت ہاتھ آجاتی! ـــــ اب اس سن پر پہنچ کر جو سوچتا ہوں تو دنیا کی ساری ہی مادّی لذتوں کی حقیقت اس خوانچہ والے کی مٹھائی سے کیا کچھ بھی زائد نظر آتی ہے! ـــــ وہ سن نادانی کا کہہ لیا جائے، اب اس "دانائی" کے سن کا کیا حال ہے؟ انتظار ہر لذت کے لئے ہفتوں اور دنوں کا، اور کبھی ہفتوں اور مہینوں کا، بلکہ برسوں کا بھی اور حاصل ہو جانے پر ہر بڑی سی بھی بڑی مادّی لذت کی عمر کتنی! اور اس کے بعد پھر وہی انتظار کا چکر، کسی دوسری لذت کے لئے! اور بادشاہ سلامت ہیں کہ ایک ملک کی فتح کے بعد پھر وہی ہوس، وہی دُھن، وہی فکر، دوسرے ملک کے فتح کی! "ہم چناں در بند اقلیمے دِگر"!

ایک آگ ہے کہ برابر بھڑکتی ہی رہتی ہے، سُلگے ہی چلی جاتی ہے! ـــــ اکبرؒ نے بات کتنے تجربے کی کہہ دی ہے ؎

کارِ جہاں کو دیکھ لیا میں نے غور سے
اِک دلگی ہے سعی میں، حاصل میں کچھ نہیں!

اور عمر ہے کہ اس دلگی کی نذر ہوتی ہی جا رہی ہے۔ اسی حاصل لاحاصل کے پیچھے بسر ہوتی جا رہی ہے!

کسی اور نے بھی عمر کی بے حاصلی کے مضمون کو کیا خوب باندھا ہے ؎

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو کٹ گئے آرزو میں دو کٹ گئے انتظار میں!

باب (۸)

خانگی تعلیم و تربیت (۱)

۱۸۹۸ء کی دوسری ششماہی تھی کہ والد صاحب کا تبادلہ گورکھپور سے فیض آباد ہوا، وہ کچہری ہی میں تھے جب حکم نامہ ملا! اطلاعی رقعہ اسی وقت انھوں نے گھر بھجوادیا خبر پاتے ہی گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، خیر بڑوں کو تو خوشی اس کی تھی کہ وطن (دریاباد) قریب ہو جائے گا، فیض آباد اپنے اودھ ہی میں تھا، اور دریاباد سے قریب ہی نہیں بلکہ اس کی کمشنری بھی۔ پھر لکھنؤ قریب اور آب و ہوا بھی گورکھپور کی طرح مرطوب نہیں بلکہ معقول۔ چھوٹوں کو ان مصلحتوں اور دور اندیشیوں سے کیا سروکار۔ یہاں تو خوشی اور بے انتہا خوشی اس کی کہ ریل پر بیٹھنے کا موقع ملے گا، نئے نئے اسٹیشن دیکھنے میں آئیں گے، سارا گھر ساتھ ہوگا، نوکر چاکر ساتھ ہوں گے، اسباب کے بکس، صندوق اور گٹھر، منوں کے وزن کے ساتھ ہوں گے، بڑی "چہلکس" رہے گی! ساری خوشی اس ہنگامے اور ہڑبڑ کی تھی۔ سفر کی ساری فکریں اور انتظامات تو بڑوں کے سر تھے۔ اپنے حصہ میں محض ہڑبازی آئی۔ یہ چیز توڑی، وہ پھوڑی، ایک ادھم مچا کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ اور اس سارے تماشہ میں اور کون شریک ہوتا، ہاں شریک رہیں تو ہمشیر جو ۵، ۶ سال بڑی تھیں۔ آج یہ ساری شوخیاں، شرارتیں، جس درجہ نامعقول نظر آرہی ہوں۔ اس سن میں قوت کا فاضل یا فالتو ذخیرہ جو جسم میں فاطر

کائنات کی طرف سے جمع رہتا ہے، وہ آخر اپنی نکاس کا راستہ اور کس طرح ڈھونڈتا! اور "نامعقول" ہی سرتاسر ان حرکتوں کو کیوں کہیے! اور ان سے شرمندگی ہی اتنی کیوں محسوس کیجیے۔ ذکر کرتے کرتے کچھ رشک سا بھی تو اپنی اس معصومیت، سادہ دلی، خام عقلی اور بے تصنع نادانیوں پر آگیا!

کم فہم تھے تو کم تھے پریشانیوں میں ہم
داتائیوں سے اچھے تھے نادانیوں میں ہم[1]!

سفر کا سماں اب تک نظر کے سامنے ہے، روانگی رات کے ۹، ۱۰ بجے کی گاڑی سے طے ہوئی تھی، منکاپور اور لکڑمنڈی کے راستے سے۔ رخصتی مجمع سرشام سے ہونے لگا۔ وسیع مردانہ صحن کھچا کھچ بھر گیا تھا، خدا معلوم خلقت کہاں سے ٹوٹ پڑی تھی، خیر صاحب! اسٹیشن پہنچے، والد ماجد اور والدہ و ہمشیر کے ٹکٹ سکنڈ کلاس (آج کل کے فرسٹ کلاس) کے تھے، ہم لوگوں کے انٹر (آج کل کے سکنڈ کلاس) کے۔ یہ درجہ خوب ہی بھرا ہوا تھا، لیکن یہاں باہر جھانکنے اور سیر دیکھنے کے شوق میں لیٹنے اور بیٹھنے کی پروا ہی کس کو تھی! نیند آنکھوں میں تھی کہاں؟ ساری خوشی اس کی کہ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر باہر جھانکنے کو خوب ملے گا۔ اس کا ہوش ہی نہیں کہ آخر باہر اندھیرے گھپ میں دیکھنے ہی کو کیا ملے گا۔ یہ بچکانہ ذہنیت اگر بچپن میں نہ ہو، تو اسے بچپنا کہا ہی کیوں جائے۔ نیند آخر کب تک نہ آتی، والد ماجد کے متوسلوں میں کوئی صاحب بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے اپنے گھٹنے پر میرا سر رکھ کر مجھے سُلا دیا۔ سن پھر یاد کر لیجیے کہ ۶ سال کا تھا۔ منکاپور میں گاڑی آدھی رات کے بعد پہنچی۔ جہاں سے گاڑی لکڑمنڈی کے لئے بدلنا

---

[1] شیفتہ کے اصل شعر میں 'تھے' کے بجائے 'ہیں' تھا۔

تھی، ویٹنگ روم میں ٹھہرے، اسے پہلی بار دیکھا۔ اور اس سن میں یہ کمرہ خوب سجا سجایا نظر آیا۔ پٹریوں کے درمیان اس زمانہ میں چھوٹے چھوٹے پتھر پڑے رہتے تھے، مجھے انھیں دیکھ کر طبیعت لہرائی اور دوسرے بچوں کی طرح اپنے دل میں بھی یہ آئی کہ کوئی پتھر اٹھا کر پٹری پر رکھ دیجیے اور ٹرین کے گرنے اُلٹنے کا تماشہ دیکھئے ـــــ خیر ایسا ہونے کیوں پاتا، بڑوں میں سے کسی نے دیکھ لیا اور ڈانٹ کر وہاں سے ہٹا دیا۔ مقصود اس ذکر سے ان لوگوں کو چونکانا ہے، جنھوں نے بچوں کو مطلق صورت میں معصوم فرض کر لیا۔ یہ معصوم صرف اس معنی میں ہیں کہ ابھی ان کی عقلیں خام ہیں، ذہنیت کے لحاظ سے معصیت کی ذمہ داری ابھی ان پر نہیں آتی، ورنہ نفس شرارتیں تو بچوں کی اس غضب کی ہوتی ہیں کہ بڑی سی بڑی تباہی اور بربادی دم بھر میں بُلا کر رکھ دیں۔

لکڑمنڈی گھاٹ سے اجودھیا (متصل فیض آباد) کا سفر اسٹیمر کا تھا۔ دریائے گھاگرا میں برسات میں اسٹیمر چلا کرتا تھا۔ اور اسٹیمر اس سن کے تخیل میں نمونۂ جہاز نہیں، عین جہاز تھا۔ تماشہ ریل کے سفر کا کیا کم تھا، یہ بحری سفر تو اعجوبہ پن میں اس سے بھی کہیں بڑھ کر نکلا۔ پردہ اس وقت تک شریف خاندانوں کا جزوِ زندگی تھا۔ خرچ جتنا کچھ بھی پڑ جائے، یہ ممکن نہ تھا کہ پردے کی پابندیوں میں ذرا فرق آنے پائے۔ والد مرحوم اسی لئے زنانہ کے ساتھ سفر کرنے میں سکنڈ کلاس (اس وقت کے فرسٹ) کا پورا کمپارٹمنٹ رزرو کرا لیتے تھے، کہ درجہ بالکل ہو جائے اور کسی غیر کے آنے کا سوال ہی نہ باقی رہ جائے۔

اس ایک غرض کے لئے سارا خرچ گوارا تھا۔ پھر اتنی احتیاط بھی بعض دفعہ کافی نہ سمجھی جاتی اور درجہ کے اندر بھی چاندنی کا پردہ باندھ دیا جاتا کہ پلیٹ فارم پر بھی گزرتے ہوئے کسی مرد کا اتفاق سے سامنا نہ ہو جائے۔ لکڑمنڈی اسٹیشن پر پالکی کہاروں کا انتظام

خاصہ اہتمام کر کے پہلے سے کر لیا گیا تھا۔ ہمشیر کا سن ابھی پورے بارہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا اور والدہ ماجدہ اسی میں بیٹھیں، اور پالکی اسی طرح اسٹیمر پر رکھ دی گئی — کتاب کے شائع ہونے تک ذہن اس سوال میں اُلجھیں گے کہ یہ پالکی کیا بلا تھی، جس کا نام بار بار آ رہا ہے۔ پالکی، فینس، میانہ، چوپہلا، تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ان سواریوں کے نام تھے، جنھیں کہار (ایک خاص ذات کے مزدور) کاندھے پر اٹھا کر لے چلتے تھے، شکل ان کی مستطیل ہوتی تھی، نیچے کا حصہ پلنگڑی یا کھٹولے کی طرح سُتلی یا بید سے بنا ہوا ہوتا تھا، اوپر کے حصے میں ایک موٹا سا بانس پڑا ہوتا۔ اور کہار اسی بانس کو کاندھے پر رکھ کر چلتے تھے، اندر اتنی جگہ ہوتی تھی کہ عورت سمٹ سمٹا کر لیٹ سکتی تھی۔ اصلاً یہ سواری زنانی تھی، اس پر پردے پڑے رہتے، ان کی دیواریں لکڑی کی بنا کر دروازے بھی لکڑی ہی کے لگا دیے جاتے۔ بغیر پردہ ڈالے، مردانی سواری کا بھی کام پالکی دیتی تھی۔ اور تانگے، رکشے، سائیکل اسکوٹر، موٹر کے دَور سے پہلے۔ مردوں کے بھی یہ ایک معزز شریفانہ سواری تھی۔

اجودھیا گھاٹ پر اسٹیمر سے اُتر، وہاں سے شکرموں پر چند میل چل، قافلہ فیض آباد پہنچ گیا۔ اب "شکرم" بھی کوئی کیا سمجھے گا۔ پالکی گھوڑا گاڑی ہوتی تھی، دو گھوڑے جتے رہتے تھے، چھت دوہری ہوتی تھی اور خوب مضبوط، تاکہ وزنی سا وزنی سامان سنبھال سکے، بڑے شہروں میں کرایہ پر چلتی تھی۔ اور شرفاء و معززین کے لئے بڑے آرام کی سواری تھی فیشن کی نذر رفتہ رفتہ یہ آرام دہ سواری بھی ہو گئی۔ اس کے بعد تانگے چلے، اور تانگوں کے بعد نمبر رکشوں کا آیا۔ اور پھر سائیکل رکشا اور موٹر رکشا، اسکوٹر اور قسم قسم کے موٹر۔

اودھ میں سب سے زیادہ آباد و پر رونق شہر، لکھنؤ کے بعد فیض آباد ہی ہے، صاف ستھرا، اجلا، شجاع الدولہ کے وقت تک دار السلطنت بھی رہ چکا ہے۔ جس قسم کی اسلامیت کا مرکز لکھنؤ ہے، یعنی شیعہ تہذیب و تمدن کو نمایاں کئے ہوئے، فیض آباد بھی اسی میں امتیاز حاصل کئے ہوئے ہے۔ مسجدوں، مقبروں، امام باڑوں کی کثرت، ایک نامور طبیب، حکیم شفاء الدولہ، واجد علی شاہ کا زمانہ دیکھے ہوئے اس وقت تک حیات تھے، اور پرانے رئیسوں کی عالی ہمتی اور اولوالعزمی کا نام زندہ رکھے ہوئے۔ ۶، ۷ مہینے بعد جب والد صاحب کا تبادلہ یہاں سے بھی ہوا، تو رخصتی دعوت انھوں نے اس شان سے کی کہ اس کی نظیر میری نظر سے تو گزری نہیں، نہ اس کے قبل نہ اس کے بعد، دعوت نوکروں، چاکروں، ماما اصلیوں سب کی تھی، جی نہیں، بس انھیں پر نہیں، گھر کے پلے ہوئے جانوروں کی بھی تھی، گھوڑوں، کتوں، بھینس، بکریوں سب کے لئے دانہ اور راتب، گھاس اور چارے کی شکل میں!

فیض آباد میں میزبان اول منشی سرفراز علی تھے (ان کے لڑکے منشی محمود عالم ابھی چند سال قبل تک زندہ تھے) اجودھیا گھاٹ پر استقبال کے لئے موجود تھے، اسٹیمر سے اتار، شکرموں پر ساتھ لائے، سارے قافلہ کو اپنے گھر میں اتارا۔ اور ۲۰ دن بھی ٹھہرایا، حق مہمانداری ادا کر دیا (یہ ایک طرح کے ٹھیکیدار تھے، "قلیوں" کو بھرتی کر کے افریقہ وغیرہ کی نوآبادیوں میں بھیجا کرتے)، خیر پھر والد صاحب کرایہ کے مکان میں اٹھ آئے یہیں کہیں قریب ہی شہر کے نامور وکیل منشی امتیاز علی رہتے تھے، شکسپیر کے، ہملٹ ناٹک کا اردو ترجمہ جہانگیر کے نام سے انھیں کے قلم سے ہے۔ آگے چل کر ایک صوفی مرتاض ہو گئے۔ انتقال تقریباً ۱۹۴۰ء میں ہوا ہوگا۔ ان کے بڑے لڑکے منشی فیاض علی اچھے ناول نویس بھی نکلے، اور ماہر قانون بھی۔

پاکستان ہجرت کر گئے۔ اور وہاں اٹارنی جنرل کے مرتبے پر پہنچ کر وفات ۱۹۵۹ء میں پائی۔
یہیں والد ماجد کے پاس علاج معالجہ کے سلسلے میں آمد و رفت ایک اور صاحب کی دیکھی حکیم شاہ نیاز احمد درویشانہ قناعت و بے طمعی میں ممتاز، بعد کو ایک درویش مجذوب کی حیثیت سے انھوں نے بڑی شہرت حاصل کی، اور مرجعیت کا عالم یہ ہو گیا تھا کہ مرادوں کے لئے دعا کرانے کو خلقت دور دور سے کھنچی چلی آتی تھی۔ بیعت اور خلافت بھی مراد آباد کے مشہور نقشبندی شیخ طریقت مولانا فضل رحمٰنؒ سے تھی۔

بچپن کے اوہام و خیالات پر بڑے ہو کر خود بھی ہنسی آیا کرتی ہے، یہاں مکان میں ایک کوٹھری ایک کمرہ کے اندر تھی، قدرتاً خوب ٹھنڈی اور اس سے بھی زیادہ اندھیری! اس تاریک و محفوظ کوٹھری کو دیکھ کر اپنے دل میں کہا کرتا تھا کہ قیامت کے دن جب آفتاب سوا نیزہ پر آجائے اور کھوپڑی کے اندر بھیجا پکنے لگے گا تو میں پناہ لینے کو اسی کوٹھری کے اندر چھپ جاؤں گا! ـــــ مذہبی ماحول کا یہ اثر تھا کہ ۶، ۷ برس کے بچے کے دل میں حشر کا ہول پوری طرح بیٹھ گیا تھا!

عمر میں پہلی بار تھیٹر یہیں دیکھا سینما کا کوئی نام بھی اس وقت نہیں جانتا تھا، کوئی معمولی سی کمپنی کہیں باہر سے آئی تھی، کئی ورق اوپر ذکر بھائی عبدالحلیم مرحوم کا آچکا ہے، وہ اسے دیکھنے گئے اور تماشہ دکھانے مجھے بھی ساتھ لیتے گئے۔ تماشہ میرے لئے واقعی عجیب و غریب اور قابل دید تھا۔ وہ رنگ برنگ کے چمکیلے پردے، اور زرق برق پوشاکیں، اور گیس کے ہنڈوں کی تیز روشنی، اور پاؤڈر کے زور سے خوب گورے کئے ہوئے چہرے، وہ چمک دمک اور ایک لَے سے سب کا گانا، ناچنا، تھرکنا، بس آنکھیں کھلی

کی کھلی رہ گئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ راجہ اندر کے دربار کے سچ مچ ہی "یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے" کا سامنا ہے! ـــــ اخلاقی درس دینے والا اور دنیا کے بھی اونچ نیچ کا بتانے والا، اس وقت کون تھا؟ سب یہی سمجھے کہ چھ برس کے معصوم بچہ نے اگر یہ واقعہ ایک معصوم سا تماشہ دیکھ لیا تو اس میں قباحت ہی کیا ہوئی؟ نادان والدین اور مُربّی خدا معلوم کتنے معصوموں کو اپنی نادانی اور کوتہ فہمی سے اسی طرح غفلت بلکہ معصیت کے غار میں اپنے ہاتھوں ڈھکیلتے رہتے ہیں۔ والد مرحوم اور خود بھائی صاحب مرحوم دونوں "ناچ" کو بُرا ہی سمجھنے والوں میں تھے اور کبھی ناچ مجرے کی محفل میں میرے جانے کے ہرگز روادار نہ ہوتے لیکن یہ ڈرامے اور تھیٹر کی بلا تو "صاحب" کی لائی ہوئی چیز تھی، اور انتساب "دانایان فرنگ" کی جانب رکھتی تھی، اس کے عیب کا عیب ہونا ہم مشرقیوں کی نظر میں، اور وہ بھی انیسویں صدی کے اخیر میں، رہ ہی کیا گیا تھا! فسق و معصیت کے کریہہ چہرے پر جب غازہ فیشن اور "کلچر" کا مل دیا ہے تو اس کی بدنمائی اور زشت روئی پر نظر ہی کس کی پڑتی ہے!

یہی بھائی عبدالحلیم مرحوم اخباروں کے بھی رسیا تھے، گھر میں جو دو ایک اخبار آتے، انھیں تو خیر وہ پڑھ ڈالتے ہی تھے، باقی شام کو شہر کے کسی کلب میں بھی وہ پابندی سے جاتے، اور اخبارات، رسالے، پڑھ پڑھا رات گئے واپس آتے، تو گھر پر اپنے ملنے جلنے والوں سے بھی یہی اخباری تذکرے، چرچے جاری رکھتے، سمجھتا تو اس وقت کم ہی چیزیں تھا تاہم اخباری چیزوں کی چاٹ کچھ اسی وقت سے پڑنے لگی۔ اودھ پنچ کا نام پہلے پہل انھیں کی زبان سے سنا۔ ایک روز شام کو خوش خوش کلب سے لوٹے اور سنایا کہ ۱۸۹۸ء کی رخصتی اور ۱۸۹۹ء کی آمد پر اودھ پنچ نے کیا خوب لکھا ہے ؎

اٹھانوے کے ساتھ بلائیں ہوئیں جو دور ۔۔۔ ننانوے کے پھیر میں پڑ جائیں گے حضور!

اودھ پنچ اس وقت تک اپنی پرانی شہرت کسی درجہ میں قائم رکھے ہوئے تھا۔ اور اس قسم کی لفظی ظرافت تو اسی کا حصہ تھا ——— "ننانوے کے پھیر میں پڑ جانا" یہ محاورہ پہلی بار اپنے علم میں آیا۔

نماز پنج گانہ کی عادت، اب تو خیر سن ۶، ۷ سال کا تھا، دو سال قبل ہی قائم ہو گئی تھی، والدہ ماجدہ کے ساتھ جب دریاباد جا کر کچھ روز کے لئے رہنا ہوا تھا، اور اس میں بڑا دخل چچا صاحب شیخ عبدالرحیم صاحب کو تھا وہی منہ اندھیرے مجھے اٹھاتے تھے، اور مسجد اپنے ساتھ مجھے لے جاتے، نماز کا بچپن ہی سے عادی بنا دینے کا رواج اب تو خیر کیا ہوتا، اس وقت بھی بہت عام نہ تھا، حالانکہ والدین اگر زیادہ خیال کر لیا کریں تو ایسا دشوار کچھ اب بھی نہیں ——— فیض آباد میں نماز جمعہ کو پابندی کے ساتھ جاتا اپنے مولوی صاحب کے ساتھ، پڑھائی لکھائی کا شوق بدستور قائم اور تعلیم میں مذہبیت دوسرے علوم پر مقدم۔ قرآن مجید (ناظرہ) کا بڑا حصہ یہیں ختم ہوا۔

عجائب خانہ (میوزیم) کی زیارت بھی سب سے پہلے یہیں ہوئی، گو ظاہر ہے کہ بہت چھوٹا سا تھا۔ یہاں اسکولوں کے علاوہ ایک کالیجیٹ اسکول بھی تھا، اور اس زمانہ میں ایک خاص چیز تھا۔ اس کا پرنسپل ایک انگریز رہتا، دو بڑے بھائی (ایک حقیقی، دوسرے چچیرے) اسی میں پڑھتے تھے، ان کی زبانی اسکولی سوسائٹی اسکولی شرارتوں، اسکولی کھیل کود، اسکولی سزاؤں کے قصے برابر سننے میں آتے رہتے۔ اور اسکول میں نہ پڑھنے کے باوجود اسکول کے ماحول سے بے گانہ نہیں رہا تھا ——— اجودھیا ہندوؤں کا مشہور تیرتھ، شہر سے کچھ ہی فاصلہ پر تھا۔ کبھی کبھی اپنے بڑے بھائیوں اور ان کے دوستوں کے ہمراہ یہاں بھی کوئی میلہ

دیکھنے جاتا۔ وہاں کے مندروں، شوالوں کا حیرت کے ساتھ دیکھنا اب تک یاد ہے۔

۹۹ء کی پہلی سہ ماہی ختم پر تھی کہ والد ماجد کا تبادلہ سیتاپور کو ہو گیا۔ آبادی اس وقت تک کُل ۲۲، ۲۳ ہزار کی تھی، مسلم تہذیب خصوصاً شیعہ کلچر کا ایک خاصہ مرکز، آب و ہوا کے لحاظ سے بہت اچھا۔ مسلمان شرفاء کے مشہور قصبے اسی ضلع میں واقع خیرآباد، لاہرپور، محمودآباد، بابوپور وغیرہ۔ شہر چھوٹی لائن لکھنؤ سے بریلی کاٹھ گودام جانے والی پر واقع، بڑی لائن اور ایک اور چھوٹی لائن دونوں بہت بعد کو نکلیں۔

باب (۹)

خانگی تعلیم وتربیت (۲)

آدھی رات کا وقت تھا اور اخیر مارچ کا خوش گوار موسم، جب ہمارا قافلہ دریاباد اور لکھنؤ سے سیتاپور اسٹیشن پر اُترا۔ ۶۷ سال گزر گئے، بات کل کی معلوم ہوتی ہے! بچپن کے بعض نقش کس درجہ گہرے ہوتے ہیں! —— آدھی رات کا وقت، مگر کیسا کسل اور کہاں کا تکان! خوش خوش اور چاق چاق اُترا۔ کسے معلوم تھا کہ کئی کئی سال اسی شہر میں، مثل وطن کے رہنا ہوگا، آئندہ زندگی کی اہم ترین بنیادیں یہیں قائم ہوں گی، بچپن کی معصومیت یہیں ساتھ چھوڑے گی، لڑکپن کی شرارتوں، اور پھر نوجوانی کی غفلتوں، سرمستیوں کا آغاز بھی یہیں سے ہوگا! اس زمانہ کی ڈپٹی کلکٹری کے رعب وداب، اثر واقتدار کا کیا کہنا۔ اسٹیشن پر چپراسیوں اور عملہ والوں کا پورا پرا جما ہوا، ناوقت ہونے کے باوجود کوئی دقّت نہ ہوئی۔ متعدد سواریاں موجود۔ ہم لوگ کئی من نہیں، کئی ٹن کا وزنی ساز وسامان لئے ہوئے بہ آرام اپنی عارضی فرودگاہ پر پہنچ گئے۔ لیکن اب اندازہ ہوا کہ یہ مکان ہماری ضرورتوں کے لحاظ سے بالکل ناکافی بلکہ تنگ ہے، پلنگ، تخت، بھاری بھاری بکس، بہت سارے سامان کا ڈھیر باہر ہی لگا دیا، صبح ہی سے تلاش دوسرے مکان کی شروع ہوگئی، جو بندہ یابندہ، چند ہی روز کی دوادوش میں ایک کوٹھی مل گئی وسیع وشاندار، شہر کی عام آبادی سے ذرا ہٹ کر، سول لائنز کے حدود میں —— یہ سیول لائنز یا ہندوستانی لہجہ میں سیول لین کیا ہے؟

ذرا اسے بھی سمجھتے چلئے۔ ٹھنڈے ملک والے انگریزوں نے جب اس گرم دیس ہندوستان میں رہنا سہنا شروع کیا، تو ان کے افسروں نے شہروں کی گنجان آبادی سے باہر میدانوں میں اپنے لئے بڑی بڑی کوٹھیاں اور پھوس کے ٹھنڈے بنگلے تیار کرائے، اور ان کے ارد گرد بڑے بڑے پائیں باغ، چمن اور سبزہ زار رکھے گویا ہر کوٹھی بجائے خود ایک چھوٹے سے پارک کے حلقہ کے اندر، شہر سے متصل، لیکن شہر سے باہر یہ علاقے انھیں کی اصطلاح میں سول لائنز کہلائے۔ سیتا پور میں ایک بڑی وسیع سول لین آرام دہ اور وسیع صاف ستھری سڑکوں کے ساتھ تھی۔ یہ کوٹھی اسی علاقے میں ملی۔

کوٹھی راجہ صاحب محمود آباد کی تھی، محمود آباد کا نام آگیا ہے تو ذرا تعارف بھی ہو جائے آگے یہ نام بار بار آئے گا۔ محمود آباد ایک مسلم ریاست اسی ضلع میں تھی، سرحد ضلع بارہ بنکی سے ملی ہوئی، یہاں کا رئیس راجہ کہلاتا تھا۔ پشتینی خطاب خان بہادر کا رکھتا تھا۔ اور اس کا شمار اودھ کے سب سے بڑے تعلقہ داروں میں تھا۔ "تعلقہ دار" کی اصطلاح اب خود تشریح طلب ہو گئی ہے انگریزوں کے زمانے میں اودھ کے بڑے زمین دار، تعلقہ دار کہلاتے تھے، ۱۹۵۵ء میں زمین داری، تعلقہ داری سب ختم کر دی گئیں محمود آباد راج کے مالک نسباً ہم لوگوں کی برادری کے ایک شیخ صدیقی تھے، دو ہی تین پشت قبل مذہب انھوں نے امامیہ اختیار کر لیا تھا۔ اودھ کی سلطنت میں جب شیعیت کا زور ہوا، تو بہت سے ضعیف الایمان اہل سنت نے انھیں کی طرح سرکار دربار میں رسوخ و تقرب کے خیال سے شیعیت قبول کر لی تھا لیکن یہ تھا کہ گو رئیس شیعہ ہو گئے تھے، لیکن نسلی سُنّیت کا اثر مدتوں دور نہ ہو سکا، اسوقت کے رئیس کا نام امیر حسن خان تھا خان مخفف "خان زادہ" کا نہ یہ کہ ذات کے پٹھان تھے، "راجہ" اور "خان بہادر" انگریزی سرکار کے خطاب اور "امیر الدولہ" و "سعید الملک"

بادشاہی عہد کی یادگار۔

تو انھیں راجہ صاحب کی متعدد کوٹھیاں اور بنگلے سیتاپور سول لین میں، حاکموں اور افسروں کے لئے بنے ہوئے تھے، اور ضابطہ سے کرایہ پر چلتے تھے، جج، ڈپٹی کمشنر، سول سرجن، سپرنٹنڈنٹ پولیس وغیرہ انھیں کوٹھیوں میں رہتے۔ انھیں میں سے ایک کوٹھی ہمیں بھی ملی۔

کوٹھی میں آکر آنکھیں کھل گئیں، ایسا عالی شان مکان رہنے کے لئے اس سے قبل کیوں ملا تھا۔ کمرے چھوٹے بڑے کئی کئی۔ ایک وسطی ہال بھی اور بغلی کمرے بھی۔ کئی کئی زبرآمدے، غسل خانہ وغیرہ۔ زنانے مکان کا صحن لمبا چوڑا اور چار دیواری نیچی ہونے کے باعث خوب کھُلا کھُلا۔ اصل کوٹھی سے ذرا ہٹ کر جنوب میں خوب بڑا سا اصطبل اور شاگرد پیشہ کے مکانات، اور پائیں باغ تو کہنا چاہیے لق و دق۔ مشرق میں خوب پُر بہار چمن سبزہ زار پھولوں، بیلوں، پودوں سے آراستہ، مغرب و شمال کی جانب گھنا باغ۔ آم کے علاوہ بھی طرح طرح کے درختوں اور سبزی ترکاری سے لبریز، غرض گھر بیٹھے پورا مزہ پارک کا حاصل۔ اب تک یاد ہے کہ جب پہلی بار اس کوٹھی میں قدم رکھا ہے تو اس کی وسعت تو بے پایاں نظر آئی اور حسن و زیبائش کے لحاظ سے وہ تاج محل (آگرہ) کا نمونہ بن کر نظر میں سمائی، خوب اُچھلا کودا، خوشی منائی، اور میں تو خیر بچہ ہی تھا، بڑوں کو دیکھا، سب کے چہرے کِھلے ہوئے، سب ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہوئے ـــــ بچپن کا بھولا پن کیا چیز ہوتا ہے، اس کوٹھی کو جب سالہا سال کے بعد اپنے ادھیڑ سن میں دیکھا تو "جنت نشان" نکلنے کے بجائے ایک عام کوٹھی اوسط درجہ کی معلوم ہوئی اور بس۔ اور ایک بچپن ہی کیا معنی، عمر کی عمر ہی اسی فریب نظر میں بسر ہو جاتی ہے۔

پڑھائی مولوی صاحب اور ماسٹر صاحب دونوں سے جاری رہی، ماسٹر صاحب کئی بار بدلے گئے اور چونکہ انگریزی کے ساتھ حساب کی پڑھائی بھی لازمی تھی اس لئے ہمیشہ ہندو ہی ملتے رہے، مسلمان اس وقت سررشتہ تعلیمات میں خال خال ہی تھے، اور حساب پڑھانے والے تو کوئی ایک بھی نہیں یہ ماسٹر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ، ہم دونوں بھائیوں کو پڑھا کر چلے جاتے، کوئی خاص ربط و انس کسی ماسٹر سے پیدا نہ ہوا۔ میں ڈپٹی زادہ، یا عوام کی زبان میں خود ہی "چھوٹا ڈپٹی" تھا میری مروت، لحاظ سب ہی ماسٹر کرتے۔

مولوی صاحب ساتھ ہی رہتے، چوبیسوں گھنٹوں کے لئے ملازم تھے، وہ معلم کے علاوہ عام آتالیق و نگراں بھی تھے، ایک چھوٹا سا کمرہ ان کے لئے الگ تھا، وہی مکتب تھا، قرآن مجید ناظرہ کچھ روز بعد ختم ہو گیا۔ سن بھی کوئی ۷، ۸ سال کا ہوگا چھوٹی سی تقریب ہوئی، مٹھائی تقسیم ہوئی، کچھ چھوٹی سورتیں زبانی سنی گئیں۔ اتنا یاد ہے کہ "قُلْیا" (سورۃ الکافرون) میں متشابہ لگا، کچھ اور پڑھ گیا، سننے والوں نے ٹوکا۔

دیکھتے دیکھتے مولوی اسماعیل میرٹھی کی پانچوں اردو ریڈریں ختم ہو گئیں۔ پانچویں ریڈر خاصی مشکل تھی اور اچھی اونچی استعداد کی طالب، فارسی بھی اسی اثنا میں شروع ہو چکی تھی، (بیسویں صدی کے شروع تک شریف مسلمان گھرانوں میں عموماً یہی نصاب تعلیم رائج تھا) آمدنامہ، پندنامہ، گلزار دبستاں، دستور الصبیان (ایک ہندو کی تصنیف) سے گزرتے ہوئے نوبت گلستان اور پھر بوستاں کی آئی۔ اور جب ذرا اور بڑا ہو لیا تو درس رقعات مرزا قتیل، سکندر نامہ (نظامی)، یوسف زلیخا (جامی)، اور کیمیائے سعادت (غزالی)، کے بھی حاصل کئے۔ اور فارسی کے درسیات انھیں پر ختم ہو گئے ـــــ کیمیائے سعادت کی معنویت کا کیا کہنا۔ لیکن ایسے سن میں اور ایسے طریقہ سے پڑھی کہ پڑھائی سے زیادہ رٹائی

ہی رہی، اور بجز اس کے کہ عبادت کے لفظی معنی، الٹے سیدھے سمجھ لئے، اور کچھ ہاتھ نہ آیا، کتاب سن شعور پر پہنچ کر پڑھنے والی ہے، اور وہ بھی کسی محض ملائے مکتبی سے نہیں، بلکہ اچھے خوش فہم وصاحب فکر ونظر استاد سے۔ رہی یوسف وزلیخا تو اب اس کے لئے کیا عرض کیا جائے، اللہ ملا جامی کو معاف کرے، خدا معلوم کس سن میں اور کس عالم میں، وہ اپنی یادگار ایسی فحش وعریاں کتاب کی صورت میں چھوڑ گئے، بس جو خوش عقیدگی ان کے نام کے ساتھ وابستہ ہے وہی اس کتاب کو زیر درس رکھنے کی ذمہ دار ہے، فحش کی آمیزش تو گلستاں میں بھی ہے، لیکن بہ حیثیت مجموعی اس کی خوبیاں اس کے عیوب پر کہیں غالب ہیں! ـــــــ لیکن لکھتے لکھتے قلم یہ کس لاحاصل بحث میں جا پڑا، اب فارسی کے یہ اوراق پارینہ کہیں پڑھائے ہی کیوں جانے لگے، جو سوال ان کے حسن وقبح، صواب وعیب کا چھڑے!

سلسلۂ سخن میں ایک بات اور سنتے چلئے، مصنف ومفکر، بہترین بھی ہو بہر حال اپنے ماحول اور اپنے زمانے کا بندہ ہوتا ہے، کیسے ممکن ہے کہ کوئی بھی کتاب بشری دل ودماغ سے دو چار سو سال قبل سے نکلی ہوئی آج کے مسلمات کا ساتھ دے سکے۔ اور آج کے زاویۂ نظر کے ڈھانچے میں ٹھیک بیٹھ سکے۔ بہترین پرانی کتاب بھی اب اس قابل نہیں کہ اپنی ترتیب وتہذیب کے ساتھ بجنسہ طلبہ کے ہاتھ میں دے دی جائے، جدید مقدمہ یا دیباچہ اور بہ کثرت حاشیے تو بہر حال ضروری ہیں، اور پھر پڑھانے والے کے لئے بھی لازمی ہے کہ خوب صاحب فہم اور طلبہ کا فطرت شناس ہو، بغیر ان احتیاطوں کے اپنا تو عمر بھر کا تجربہ ہے کہ "کل" کا تریاق "آج" زہر ہی ثابت ہوتا ہے!

گھر میں کھیل کود کے لئے پردیس (سیتاپور) میں کوئی ہم سن لڑکا عزیزوں میں سے

تو تھا ہی نہیں، اور نہ سیول لین کی اس کوٹھی میں کسی ہمسائے اور ہمسائے زادے کا کوئی امکان تھا۔ سگے بھائی بھی ایک تھے اور ان سے بے تکلفی بھی تھی، پھر بھی سن میں کئی سال کی چھٹائی بڑائی کا کیا علاج تھا۔ گھر کی پروردہ لڑکیاں البتہ کھیل کے لئے کئی ایک تھیں، کم سن بھی اور میری ہم سن بھی (ہم میاں لوگوں کی زبان میں "لونڈیاں" یا "باندیاں") لڑکا بھی کوئی ایک آدھا اس طبقہ کا تھا۔ البتہ سن میں مجھ سے دو چار سال بڑا۔ بہرحال جو بھی تھیں یا تھے سب مرتبہ میں مجھ سے کم اور کہیں کم، میں مالک اور آقا، وہ سب غلام اور کنیزیں، میں میاں اور وہ سب کمینے۔ میں سب پر خیر، سب کا حاکم، جب جس کو جی چاہا پیٹ دیا، جس کو جو جی چاہا کہہ بیٹھا۔ یہی غنیمت ہے کہ زبان گالیوں پر نہیں کھلی تھی (اور اس کی لم صرف یہ ہے کہ اپنے باپ اور بھائی کو کبھی گالی دیتے نہیں سنا تھا) والد ماجد اور والدہ ماجدہ دونوں اپنی والی بڑی قدغن میری زبان درازیوں اور دست درازیوں دونوں پر رکھتے۔ اور والد ماجد سے میں ڈرتا بھی تھا، تاہم ان سے چرا چھپا کر تو موقع آخر مل ہی جاتا ——— اس صورت حال یعنی اپنے برابر والے ساتھی نہ ملنے سے دو نتیجے نکلے، ایک اچھا ایک برا، اچھا نتیجہ یہ کہ زبان اور کان دونوں بچپن بھر، گالی گلوج، اور فحش گندے مذاق سے محفوظ رہے، اور برا نتیجہ یہ نکلا کہ طبیعت عادی شروع ہی سے حکومت و حکمرانی کی ہوگئی، اور نفس کو چسکا بچپن ہی سے اپنی بڑائی کا پڑگیا۔ ساتھیوں سے احساس مساوات کا پیدا ہی نہ ہونے پایا، کبھی انھیں پیٹ دیا تو کبھی خود ہی ان کے پٹ گئے، اس کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔

کئی کئی پروردہ لڑکیاں گھر میں آخر جمع کیسے ہوگئیں! اس گتھی کو بھی تو سلجھاتے چلئے۔

میری پیدائش کا شاید پانچواں ہی سال تھا کہ ہمارے صوبہ میں دا اس وقت اس کا

نام NWP یا ممالک شمالی و مغربی تھا)، ایک شدید قحط پڑا، ایسا کہ قحط زدہ بے چاروں نے اپنی اولاد تک کو بیچنا شروع کر دیا خیر اس کی تو قانون سے ممانعت تھی۔ البتہ سرکاری محتاج خانوں میں لڑکیاں کثرت سے داخل ہونے لگیں اور اس کی اجازت حکومت سے تھی کہ جو چاہے انھیں پرورش کرنے کے لئے اپنے ہاں رکھ لے۔ والد مرحوم ڈپٹی تھے ہی (غالباً ضلع بستی میں)، انھیں بڑی تعداد میں لڑکیاں آسانی سے مل گئیں، کچھ تو انھوں نے اپنے عزیزوں مخلصوں میں تقسیم کر دیں اور کئی ایک اپنے ہاں رکھ لیں۔ تین ان میں سے کم سن تھیں، وہ بچارے اپنی ذات سے اس کا اہتمام رکھتے تھے کہ ان کے لئے کوئی ظلم زیادتی نہ ہونے پائے اور والدہ ماجدہ بھی حتی الامکان شفقت ہی کا برتاؤ ان کے ساتھ رکھتی تھیں لیکن قابو پانے کے بعد کون لحاظ "حقوق" اور احکام الٰہی کا رکھتا؟ معاشرہ اور برادری کا اصرار تھا کہ یہ سب لونڈی تو غلام ہیں، کمینے اور ہیچ، نہ ان کی کوئی عزت نہ کسی انسانی اکرام و احترام کے مستحق، سوا اس کے کہ انھیں پیٹ بھر کھانے کو دے دیا جائے، گویا یہ انسان تھے ہی نہیں، چوپائے تھے، جن کا محض قالب انسانی تھا —— اچھوت پن کی لعنت ہندوؤں تک کب محدود رہی تھیں، مسلمانوں میں خصوصاً ہم میاں لوگوں میں پوری طرح سرائت کر گئی تھی۔

خوش حال گھرانوں میں ایک اور مصیبت یہ تھی کہ یہ "زرخرید" چھوکرے اور چھوکریاں آقازادوں، اور آقازادیوں کی خدمت کے لئے شروع ہی سے نامزد (ALLOT) کر دیئے جاتے تھے، گویا حق مالکیت باضابطہ بھی فلاں صاحب زادہ کا فلاں چھوکرے اور فلاں چھوکری کے لئے ثابت ہو جاتا تھا! چنانچہ ایک چھوکرا مجھ سے تین چار سال بڑا، اور ایک چھوکری مجھ سے تین چار سال چھوٹی، دونوں میرے نام کے کر دیے گئے، اور میں عملاً ان کی قسمت کا مالک قرار پا گیا۔ اتنی کم سنی میں انتہائی خواجگی کا احساس اور پندار تفوق و

برتری جیسی مریضانہ بلکہ خبیثانہ ذہنیت پیدا کر سکتا ہے، ظاہر ہی ہے، اور پھر میں تو طبعًا بھی تند خو تھا ——— یہ چیز ظاہر تو "آج" ہے اس وقت کہاں تھی؟ آج واضح و صریح سہی، معاشرہ کی اس منزل میں سوچنے کے بعد بھی ذہن کا اُدھر منتقل ہونا دشوار تھا۔ اچھے اچھے نیک، ثقہ اور دیندار لوگ بھی ظلم و شقاوت کی اس رَو میں اندھوں بہروں کی طرح بہے چلے جا رہے تھے۔

نفس بہیمی آخر کُھل کھیلا، اور کیوں نہ کُھل کھیلتا، نفس تن تنہا خود ہی کیا کم ہے، پھر جب اُسے شہ دینے والی ساری برادری ہو، پورا ماحول ہو، ہر چیز میں کوئی نہ کوئی پہلو جرم و خطا کا نکال لیتا، ذرا ذرا سی بات پر بھی سخت سزا دیتا۔ اپنے کو ہر وقت بڑا سمجھتا اور ہر زیر دست کو ہر طرح حقیر و خوار سمجھتا، غرض شقاوت و سنگ دلی کا پورا اظہار، یہ اس صورت حال کا ایک لازمہ تھا، ادائے حقوق کی یاد تو خیر کوئی کیا دلاتا، شہ ہر طرف سے یہی ملتی رہتی کہ میاں آپ نے تو بڑی نرمی دکھائی ورنہ یہ پاجی تو اس سے کہیں زیادہ کڑی سزا کا مستحق تھا۔ لے دے کہ ایک والد ماجد ایسے تھے جو کبھی کبھی ٹوک دیتے اور والدہ ماجدہ بھی کبھی کبھی کچھ بیٹھے سبق پند و نصیحت کے دے نکلتیں، خیر ان بے چاری کی بات تو میں کیا خیال میں لاتا، رہے والد تو وہ ہر وقت موجود کہاں رہتے، کبھی کچہری گئے ہوئے ہیں، کبھی کہیں اور اِدھر ان کی آنکھ بچی، اُدھر میں نے ڈانٹ پھٹکار مار کٹائی کے کارنامے دکھانے شروع کر دئے۔ یہی غنیمت ہے کہ نوبت یہیں تک آکر کیسے رُک گئی، اس سے بڑھ کر کیوں نہ آگئی!

یہ ایک اخلاقی تذکرہ تو محض ضمناً آگیا، اور پھر اس کا تعلق محض اس سن کے ساتھ

مخصوص بھی نہیں۔ اس نے آگے کے بھی کئی سال اپنی لپیٹ میں لے لئے۔

ذکر پڑھائی کا چل رہا تھا، کتابی تعلیم کا سلسلہ بدستور جاری تھا اور ظاہر ہیں دنیا اس کو دیکھ دیکھ خوش بھی ہو رہی تھی، ٹوٹا پھوٹا، ٹیڑھا میڑھا خط لکھنا ۹۹ء ہی میں آگیا تھا بڑے ہو کر اپنے چچا صاحب کے کاغذات میں میں نے ان کے نام اپنا ایک خط ۹۹ء کا لکھا ہوا دیکھا اس وقت اپنے نام کے ساتھ "شیر" لکھتا تھا، کسی نے بتایا ہی ہوگا۔ اور اَب تو تین سال اور گزر گئے تھے۔ خاصے بڑے بڑے خط لکھنے لگا تھا۔

۱۹۰۰ء میں جب صوبہ کے ایک ہندو نواز و ہندی نواز لفٹننٹ گورنر اینٹنی میکڈانل نے اردو رسم الخط پر ضرب لگائی، اور صوبہ کی عدالتوں کے لئے دیوناگری رسم الخط کے بھی دروازے کھول دیئے تو علاوہ اور جلسوں کے ایک بڑا مرکزی واحتجاجی جلسہ لکھنؤ میں اُردو والوں نے کیا تو خوب یاد ہے کہ اس کے متعلق دو بڑے لمبے لمبے خط میں نے اپنے ایک ہم سن عزیز کو لکھ کر باندے بھیجے تھے ——— سن یاد کر لیجئے کہ اس وقت ۸ سال یا کچھ ہی زاید کا تھا۔

پڑھنے بلکہ پڑھ لینے کا شوق خدا جانے کہاں سے پھٹ پڑا تھا کتاب، رسالہ، اخبار، اشتہار، غرض جو چیز بھی چھپی ہوئی نظر کے سامنے پڑ گئی، پھر ممکن نہ تھا کہ بے پڑھے رہ جائے سمجھ میں پوری ادھوری جتنی بھی آئے اس سے کوئی بحث نہ تھی، پڑھ ڈالنا جیسے فرض تھا، اپنے ایک چچازاد بھائی عبدالحلیم مرحوم کا ذکر اوپر کر آیا ہوں، ان کا وجود عمر کے اس دَور میں میرے لئے ایک نعمت بلکہ آیۂ رحمت تھا، علمی و فکری، دینی، اخلاقی، تعلیمی ہر نقطۂ نظر سے۔ سب کچھ مجھے سُناتے، پڑھاتے رہتے تھے، اخیر ۱۹۰۳ء میں ان کا انتقال، دو ہی تین روز طاعون میں مبتلا رہ کر ہوگیا۔ تو میں دفعتہً ایک بڑے شفیق و مخلص مشیر و معلّم کے سایہ

عاطفت سے محروم ہوگیا، ان کی مغفرت اور حسن عاقبت کے لئے دعا روئیں روئیں سے نکلتی ہے۔

یہ لکھنا رہ ہی گیا کہ ۱۸۹۹ء میں جب سن ۶ سال کا ہوا تو رسم ختنہ ادا کی گئی، دریاباد سے ایک ہوشیار و ماہر فن جراح کو سیتاپور بُلایا گیا، اور انھوں نے ایک مختصر سے مجمع کے سامنے چابک دستی سے اس فرض کو انجام دیدیا۔ میں پہلے تو ذرا ڈرا، سہما ہوا تھا لیکن جب ذرا دیر قبل والد صاحب نے الگ بُلا کر ایک مختصر سی تقریر اس کی مذہبی اہمیت پر کی، تو کچھ تو ہمت اس سے بندھ گئی اور پھر جراح بھی ہوشیار تھے، تکلیف کچھ ایسی زائد نہ ہونے پائی۔ لیکن زخم بہرحال زخم ہی تھا، اندمال میں کئی دن لگ ہی گئے ـــــ تجربہ کے بعد اب یہ مشورہ پڑھنے والوں کو دیتا ہوں کہ اس مذہبی آپریشن سے بچہ کو جس قدر جلد فارغ کر دیا جائے، مثلاً زچہ خانہ میں، پیدائش کے ساتویں ہی دن، اتنا ہی بہتر ہے، ایک تو تکلیف کا احساس اس وقت بہت ہی ہلکا ہوگا، دوسرے زخم مندمل بہت جلد ہو جائے گا۔ بچہ ہاتھ پیر چلانے کے قابل اس وقت تک نہیں ہوتا۔ پھر سات، آٹھ برس کا بچہ دوسروں کے سامنے بلا ضرورت برہنہ ہی کیوں ہونا پڑے ـــــ لیجئے یہ سب اس طرح لکھ چلا کہ جیسے آئندہ کی "روشن خیال" دنیا عقیقہ اور ختنہ کی پروا بھی اسی طرح کرتی رہے گی۔

باب (۱۰)

اسکولی زندگی میں داخلہ

عمر کا نواں سال تھا اور سنہ ۱۹۰۱ء کہ رائے یہ ٹھہری کہ اب داخلہ اسکول میں کرا دیا جائے قرآن مجید ختم ہو چکا تھا اور ریڈر خاصہ چل نکلا تھا، فارسی بھی شُد بُد آگئی تھی، اور انگریزی کی پرائمر نکل چکی تھی۔ طے یہ پایا کہ داخلہ انگریزی کے اَپر پرائمری (اس وقت کے فورتھ کلاس یا چوتھے درجہ) میں کرایا جائے۔ یہ درجہ ہائی اسکولوں میں نہیں ہوتا تھا یہ برانچ اسکولوں میں ہوتا تھا اور انھیں کا یہ آخری درجہ شمار ہوتا تھا ـــــ یہ برانچ اسکول اصل شہر میں تھا۔ ہماری کوٹھی سے میل سوا میل دور۔

اسکول کا نام ہی نام اب تک سُنا تھا۔ اور ماسٹروں کی سختیاں اور لڑکوں کی شرارتیں، سُن سُن کر اسکول سے دہشت ہی دل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ شوق و رغبت ذرا بھی نہ تھی ـــــ بھرتی کرانے مجھے لے کر والد ماجد خود گئے۔ برانچ اسکول کے ہیڈ ماسٹر دیکھ کر نہال ہو گئے۔ کسی ڈپٹی کلکٹر نے ان کے ہاں آکر ان کی ہمت افزائی کب کی تھی۔ سرو قد ان کی پیشوائی کی، اپنی کرسی ان کے لئے خالی کر دی۔ لیکن والد صاحب اسکول کے قاعدے قانون سے ناواقف، داخلہ میرا بجائے چوتھے کے تیسرے میں کرا دیا۔ ایک درجہ اُتر کر ـــــ والد صاحب کا اسکول سے رخصت ہونا تھا کہ شدید احساس اپنی تنہائی کا پیدا ہوا۔ اس

احساس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اپنے کو جنگل یا ویرانے میں پائے، محض ہم جنسوں، ہم مذاقوں کا نہ ہونا اس کے لئے بالکل کافی ہے۔ چاہے ناجنسوں کا پورا میلا ہی لگا ہوا ہو۔ مثنوی کے شروع کے یہ شعر بھلا اس سن میں کان میں کیوں پڑنے لگے تھے، ان کی قدر تھوڑی بہت تو اس سن میں جاکر ہوئی ہے ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگار از وصل خویش

من بہر جمیعتے نالاں شدم
جفتِ خوش حالان و بدحالاں شدم

ماسٹروں اور لڑکوں سے لے کر در و دیوار تک ایک ایک چیز نامانوس، اجنبی نظر آرہی تھی، اور گویا کاٹنے کو دوڑی آرہی تھی ——— درجہ برآمدہ میں تھا، برآمدے سے ۵، ۶ گز کے فاصلہ پر گھر کے ایک ملازم صاحب میری تسکین کے لئے بیٹھے یا کھڑے تھے، میں ہر تھوڑی دیر کے بعد انھیں کی طرف منہ اٹھا کر دیکھ لیتا۔ لے دے کے یہی ایک ذریعۂ تسکین تھا، تنہائی کی بے کسی بھی کیا بُری بلا ہوتی ہے!

لڑکے سب بڑے ہی بڑے تھے، صرف ایک میرا ہم سن تھا۔ مسلمان طلبہ کلاس میں دو تین سے زیادہ نہ تھے، باقی سب ہندو، اور ماسٹر تو اسکول بھر کے سب ہی ہندو۔ تعلیمات کا صیغہ اس وقت مسلمانوں سے تقریباً خالی ہی تھا (جیسا کہ اب یعنی پاکستان بننے کے بعد پھر مسلمانوں سے خالی کیا جا رہا ہے) اس سن میں سابقہ پہلی بار ہندو ماحول سے پڑا، اب تک جتنے بھی ہندو دیکھنے میں آئے تھے (نیچ ذات کے سائیس، کوچوان یا اونچی ذاتوں کے چپراسی یا عملے والے یا پرائیوٹ ٹیوٹر) وہ سب بہر حال اسلامیت اور مسلمانوں سے دبے

ہی ہوتے تھے، برابری کرنے والے ہندو آج پہلی بار دیکھنے میں آئے۔

گھریلو معیارِ زندگی خاصا خوش حال لوگوں کا سا اور نیم رئیسانہ تھا۔ اسکولی (اور وہ بھی برانچ اسکول) معیار ظاہر ہے کہ اس سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا۔ پہلے ہی دن جب پیشاب کی ضرورت ہوئی اور اسکولی بیت الخلاء میں قدم رکھنا چاہا تو اسے اتنا گندہ اور بدبودار پایا کہ قدم اندر رکھا ہی نہیں جاتا تھا۔ گھر میں عادت بید کی کرسیوں پر بیٹھنے کی تھی، یہاں بیٹھنے کو ملی لکڑی کی کھُتری بنچ۔ وہ بھی بغیر تکیہ کے۔ یہی کیفیت چھوٹی بڑی ہر چیز میں نظر آئی۔ دوپہر کا کھانا باقاعدہ آدمی کے ساتھ گھر سے دسترخوان وغیرہ سے لپیٹ کر پہنچتا، یہاں اسکول میں اس کے لئے جگہ کہاں تھی۔ خیر درمیانی چھٹی کی گھنٹی کے وقت ایک خالی کمرے سے یہ کام لینا چاہا تو اچھا خاصہ ایک تماشہ بن گیا۔ ہر لڑکا جھانک رہا ہے! اور کھانے میں ایک گوشت کی ہڈی بھی تھی، بڑا مسئلہ اسے چوسنے کے بعد یہ پیش آیا کہ اسے پھینکا کہاں جائے!

پہلے اسکول جاکر گھبراہٹ اور دہشت کی دھندلی سی یاد تو ۵، ویں سال تک باقی ہے، کیا اندازہ اس وقت ہو سکتا تھا کہ زندگی کی ہر نئی منزل میں، عمر کے ہر نئے موڑ پر، کتنے مجھے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر دل دہلا دینے والے جان پر بن جانے والے پیش آنیوالے ہیں، جن کے سامنے یہ گھڑیاں بچوں کا کھیل معلوم ہوں گی! ——— اور پھر کیا ٹھکانہ ہے اس انتہائی گھبراہٹ والے دن (یوم الفزع الاکبر) کے ہول دل کا، جس کا پیش آنا اس ناسوتی زندگی کے بعد برحق ہے! ارحم الراحمین ان سطور کے لکھنے والے کو، اس کے سارے مخلصوں، عزیزوں، قریبوں کو، بزرگوں کو، اور ہر کلمہ گو کو اس سے محفوظ رکھے۔

اسکول کی آمد رفت شروع ہوگئی۔ میں ۱۰ بجے تک اسکول پہنچ جاتا اور ۴ بجے کے بعد واپس آنا معمول بن گیا، گھر کا ایک ملازم ساتھ ہوتا، کتابوں کا بستہ ان ہی کے ہاتھ میں ہوتا واپسی کے وہ پھر پہنچ جاتے۔ اسکول میں یہ امتیازی صورت میرے لئے مخصوص تھی، میں آخر ڈپٹی صاحب کا لڑکا تھا۔ کلاس ماسٹر ایک پنڈت جی تھے، اور ہیڈ ماسٹر ایک شریف کائستھ۔ میرا دونوں بہت لحاظ کرتے تھے اسی ڈپٹی زادہ ہونے کی بنا پر۔ ساتھ کے لڑکوں پر البتہ کچھ زیادہ اثر نہ جما۔

ہندو تہذیب و معاشرت سے واقفیت کا پہلا موقع ملا، ان کا سلام دونوں ہاتھ جوڑ کر کرنا، کھانے پینے میں مسلمانوں سے تو خیر ہوتا ہی، آپس میں بھی چھوت چھات برتنا، پنڈتوں کی تعظیم حد آخر تک کرنا، ان کے پیر چھونا، اس قسم کی باتیں پہلی بار علم میں آئیں۔ اسکول میں لڑکوں کو پٹتے ہوئے خوب دیکھا، بہ طور سزا کھڑے رہتے، اور بنچ پر کھڑا رہتے دیکھا، مرغا[1] بنتے ہوئے دیکھا، لڑکوں میں گنوار پن عام طور سے تھا۔ شہری تکلفات سے بالکل ناآشنا تھے۔ اور "اسٹرائک" "ہڑتال" "آزادی" "حقوق" وغیرہ کا نام بھی کسی نے اس وقت تک نہیں سُنا تھا —— خود سال کی ساری مدت میں سزا سے محفوظ رہا۔ کچھ تو اس لئے کہ کام میں سب سے اچھا رہتا تھا، اور پھر کچھ اثر اُسی ڈپٹی زادگی کا —— اسکول میں قدم رکھ کر جو چیز سب سے زیادہ نئی اور عجیب وہاں دیکھنے میں آئی، وہ وہاں کی زندگی میں فحش کی آمیزش تھی، فحش کلامی بھی اور فحش کاری بھی۔

[1] سزا کی یہ ایک سخت قسم تھی، لڑکے اکڑوں بیٹھ کر، سر جھکا کر، گھٹنوں کے اندر سے ہاتھ لاکر، دونوں کان پکڑتے تھے۔

لڑکے آپس میں وہ فحش گوئی کرتے اور بے تکلف اور بے جھجک وہ گالیاں زبان پر لاتے کہ گھر میں خیر انھیں سنتا تو کیا، کبھی خیال میں بھی وہ نہ آئیں اور اِدھر ماسٹر کی نظر بچی، کہ اُدھر کلاس میں ننگا پن شروع ہو گیا زبان سے گزر کر کبھی عملی بھی۔ تفصیل کاغذ کے صفحہ پر کیسے سب لائی جائے! اور کم سن ہونا تو گویا مہاپاپ یا جُرم عظیم تھا، کوئی کم سن لڑکا، خصوصاً اگر ذرا بھی قبول صورت ہو، اپنے اوباش ساتھیوں کی زد سے بچ ہی نہیں سکتا تھا ——— اور یہ حال جب سنہ ۱۹۰۱ء میں تھا، تو سنہ ۱۹۶۷ء کی ترقیوں کا تو پوچھنا ہی کیا؟

اسکول کی فیلڈ، اسکول سے ایک آدھ فرلانگ پر تھی، اور ہمارے گھر کی طرف آنے والے راستہ میں پڑتی تھی، جس دن کھیل ہوتا میں بھی اس میں شریک ہوتا۔ رواج کرکٹ کا زیادہ تھا، لیکن فٹ بال بھی ہو جاتا اور کبھی دوڑیں مقابلہ اور کبھی رسّے کی کھینچائی بھی۔ دونوں میں میں اوسط درجہ کا تھا اور یہی حال فٹ بال کا تھا۔ کرکٹ اچھا کھیلنا نہ آیا۔ ایک بار جب بیٹنگ کر رہا تھا اور گیند اچھل کر ناک پر پڑا اور خون کی تُلتلی جاری ہو گئی۔ یہی شکر ہے کہ ہڈی نہ ٹوٹی۔ اسپتال قریب میں تھا، فوراً جا کر مرہم پٹی کرائی اور پھر جب سے کرکٹ سے جی چُرانے لگا۔

باب (۱۱)

اسکولی زندگی نمبر (۱)

اُردو اور انگریزی میں تو بَرق تھا ہی (اور ہندی اس وقت تک اسکولی نصاب میں داخل ہوئی نہیں تھی)، حساب، جغرافیہ، اور ڈرائنگ کی تیاریاں پرائیوٹ ٹیوٹر صاحب نے گھر پر کرادی۔ امتحان کا وقت آیا تو تیسرے اور چوتھے دونوں درجوں کے امتحان میں بیٹھ گیا (اس وقت تک "ڈبل پرموشن" کا قاعدہ تھا) اور نتیجہ جب نکلا تو اپنے درجہ میں تو اول تھا ہی، اور اس سے اونچے یعنی چوتھے درجہ میں بھی نمبر بُرا نہ رہا۔ تیسرے یا چوتھے درجہ پر پاس ہو گیا ـــــ اسکول بھر میں دھوم مچ گئی۔ کامیابی کی یہ مثال اس وقت نادر سمجھی گئی۔ آج بھی یہ خیال کر کے خوشی ہوتی ہے کہ کم سے کم ایک مثال تو مسلمان طالب علم کی ناموری اور نیک نامی کی ملی۔ اور نام اس نے چُھچھورپن، شُہدپن، چوری چکاری میں نہیں پیدا کیا۔

اب برانچ اسکول سے ہائی اسکول میں آنا ہوا۔ اور اس کے ابتدائی یعنی پانچویں درجہ میں داخل ہوا۔ یہ اسکول ہماری کوٹھی سے قریب ہی تھا۔ کوئی سوا فرلانگ کے فاصلہ پر، اور شہر کی آبادی سے باہر۔ یہاں بھی گھر سے ایک خدمت گار ساتھ آتے صراحی گلاس اور میری کتابوں کا بستہ ساتھ لئے ہوئے۔ آمد و رفت عموماً پیدل ہی رہتی، کبھی کبھی

خصوصاً برسات کے موسم میں گھر کی گاڑی بھی لینے یا پہنچانے آجاتی۔ عیش کے یہ سامان یہ ٹھاٹھ اسکول بھر میں کسی اور کو میسر نہ تھے ——— زندگی خاصی رئیسانہ تھی، اوپر گزر ہی چکا ہے کہ گھر میں دو دو گھوڑے دو دو گاڑیاں تھیں۔

اسی سیتاپور ہائی اسکول میں عمر کے چھ سال یک لخت گزرے، ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۸ء پانچویں میں داخلہ ہوا اور دسواں پاس کر کے نکلا۔ چھ سال کی مدت اب پچھتر سال کی عمر میں بات ہی کیا لگتی ہے، کوئی اس کے معنی اس وقت اور اس سن و سال میں پوچھتا! اتنی بڑی، اتنی لمبی مدت، کہ جیسے اس کے طول و عرض کی کوئی انتہا ہی نہ تھی! یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک جگ بیت گیا، ایک قرن گزر گیا، اور اس اسکول میں آ کر نہ کبھی اسے چھوڑنا ہے اور نہ کبھی یہاں سے نکلنا ہے! وقت جیسے گزر نہیں رہا تھا، ساکن و ساکت کھڑا ہوا تھا ——— لڑکپن یہیں کھویا، نوجوانی یہیں پائی۔ جب داخل ہوا ہوں تو دسویں سال میں تھا، جب چھوڑا ہے تو سولہواں سال تھا۔ سبزہ آغاز بلکہ مونچھیں خاصی نمایاں۔ اور چہرے پر استرا پھیرنے کی نوبت بھی ایک آدھ بار آ ہی چکی تھی ——— آہ، قلم سے ابھی یہ کیا کیا نکل گیا؟ دسواں سال؟ اور سولہواں سال! ہائے! کبھی یہ سن بھی آج کے پیر فرتوت کا رہ چکا ہے؟ نہیں، نہیں، یہ سن کبھی اپنا کیا رہا ہوگا؟ ہاں کبھی یہ خواب دیکھ لیا ہوگا؟ کاش اس خواب سے جاگنا ہی نصیب نہ ہوتا! کتنی بھولی بسری یادیں ان سطروں کی تحریر کے وقت تازہ ہو گئیں۔ کیسی کیسی حسرتیں، کیا کیا تمنائیں زندہ ہو اُٹھیں! کیا معصومیت تھی، کیسے بھولے پن کس بے خبری کا زمانہ تھا! دنیا اس وقت کیسی رنگین، کتنی پُر بہار، کتنی دل فریب نظر آ رہی تھی!

ع گزر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی!

ع یک کاشکے بود کہ بہ صد جا نوشتہ ایم!

ع دو دن کو اے ضعیفی دیدے اُدھار بچپن!

شوخیاں تھیں تو معصومانہ، شرارتیں تھیں تو طفلانہ، قلب میں کہاں تھیں یہ قساوت اور کہاں تھی فسق کی یہ گہری چھائیں! ——— کاغذ پر اب نقوش کو کوئی کیسے منتقل کر دے! وہ تو صرف تمامتر اعمال کے کاغذ پر فرشتوں ہی کے قلم سے ثبت ہیں۔ محبت اس اسکول کی عمارت سے، کلاسوں سے، در و دیوار سے، فیلڈ سے، اس کے چھٹنے سے سالہا سال تک باقی رہی، جوانی بھر باقی رہی، اور بالکل تو اب بھی کب مٹی ہے؟

ہائی اسکول اس وقت تک دسویں درجہ تک ہوتا تھا، اور دسویں کو پہلے انٹرنس کہتے تھے، اور انٹرنس پاس اس وقت ایم اے پاس کا سا قابل و فاضل سمجھا جاتا تھا، میرے زمانہ میں نام بدل کر میٹریکولیشن ہو گیا اور پھر ہائی اسکول سرٹیفکٹ کہلانے لگا، پانچویں سے دسویں تک چھ درجے ہوتے تھے، اور ہر ہر درجہ کا ایک ایک ٹیچر۔ اسکول کا صدر ہیڈ ماسٹر کہلاتا، اور اس کے نیچے سکنڈ ماسٹر، تھرڈ ماسٹر وغیرہ، ان کے علاوہ ڈرائنگ ماسٹر اور پرشین ٹیچر، میرے ہی زمانہ سے ہندی ٹیچر، اردو ٹیچر، سنسکرت ٹیچر بھی ہونے لگے تھے، اور استاد فارسی کے سپرد تعلیم عربی بھی ہو گئی تھی۔ میرے ہیڈ ماسٹر بابو گھمنڈی لال بی۔ اے تھے۔ ذات کے کھتری، پہانی (ضلع ہردوئی) کے رہنے والے عام طور سے اپنے نام ہی کی طرح "گھمنڈی" (مغرور) مشہور تھے لیکن ہم لوگوں کو تو کبھی شکایت پیدا نہیں ہوئی والد مرحوم سے تو ہمیشہ مخلصانہ اور نیازمندانہ ہی ملتے رہے، دس بارہ ماسٹروں میں مسلمان ماسٹر دو تھے، ایک ڈرائنگ ماسٹر، جو عموماً پنجابی مسلمان رہا کرتے تھے، اسوقت

قاضی محمد حسین امرتسری تھے، اللہ ان کی مغفرت فرمائے، میرا بڑا خیال رکھتے تھے، دوسرے مولوی صاحب یعنی فارسی و عربی کے مشترک ٹیچر۔

اختیاری زبان کے انتخاب کا مسئلہ پانچویں سے نہیں چھٹے درجہ سے شروع ہوتا تھا، عربی اسی سال سے آئی، اب تک زبانیں صرف دو تھیں، فارسی اور سنسکرت، ہندو لڑکے بڑی ہی نہیں بہت بڑی تعداد میں فارسی لیتے، سنسکرت برائے نام ہی کوئی لیتا تھا، کچھ لڑکے سائنس اور کچھ ڈرائنگ کی طرف نکل جاتے۔ زبانوں میں مانگ سب سے زیادہ فارسی کی تھی، اور طلبہ کے علاوہ استاذ تک فارسی اور اُردو کے، زیادہ تر کائستھ ہی ہوتے، فارسی اور عربی کے سب سے پہلے اُستاد ہو کر حکیم مرزا محمد ذکی لکھنوی آئے۔ نخاس کی طرف کہیں رہتے تھے، خاندانی طبیب تھے، والد بھی طبیب تھے، اور چھوٹے بھائی حکیم محمد نقی تو ابھی چند سال اُدھر تک زندہ تھے اور شفا منزل گھیاری منڈی میں مطب کرتے تھے، عربی میں نے انھیں مولوی صاحب کے مشورہ و اصرار سے لی۔ ورنہ فارسی لینے جا رہا تھا۔ یہ مولوی صاحب بڑے ذہین، ذکی، طبیعت دار، اور لکھنویت مآب تھے، عربی میرے لئے بالکل نامانوس نہ تھی، اور پھر ان مولوی صاحب نے پڑھائی بھی بڑی شفقت کے ساتھ۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، اردو، عربی ہر مضمون میں میں اچھا تھا۔ بس ایک حساب میں کچّا تھا، اور کچّا "تھا" کیا معنی، یہ کہئے کہ اپنے کو کچّا بنا لیا، اور کچّا کر چھوڑا تھا، چھٹے میں لشتم پشتم نباہ ہو گیا، ساتویں میں آیا تو اپنے ہی بھائیوں نے چھیڑنا شروع کیا کہ "اب امتحان میں اوّل دوم آنے کا حال معلوم ہو گا، اب ارتھمیٹک کے ساتھ الجبرا اور یوکلیڈ بھی ہے اس وقت تک بجائے جامیٹری کے اقلیدس ہی داخل تھی، مسلمانوں کو ارتھمیٹک تو آتی

نہیں، نتیجہ ان فقروں کا، خاص اپنوں ہی کی زبان سے یہ نکلا کہ دماغ میں دہشت سماگئی، ادھر نام حساب کا آیا کہ ادھر وحشت شروع ہوگئی، حساب کا نام آیا کہ طبیعت اچاٹ ہوگئی، سوال سامنے آیا کہ دل دھڑکنے لگا، انجام وہی ہوا جو ہونا تھا، ساتویں کا امتحان ہوا تو اور سب چیزوں کے نمبر حسب معمول بڑے اچھے تھے، لیکن حساب میں پاس بھر کے بھی نہیں، فیل ہوا اور طالب علمی کی زندگی میں پہلی بار فیل ہونے سے دوچار ہوا! ــــــ نادان کی دوستی بھی کیسی مہلک اور عذاب جان ہو جاتی ہے، چھیڑنے والے اپنوں سے بڑھ کر اپنے تھے، لیکن بات کہاں سے کہاں پہنچی، اور چھیڑ کا نتیجہ کیسا دُور رس ثابت ہوا، یہ واقعہ اتنی صراحت کے ساتھ اس لئے درج کر رہا ہوں کہ پڑھنے والے اس سے سبق لیں اور سمجھ لیں کہ اس عالم اسباب میں بے جا ہنسی دل لگی بھی کیسی خطرناک ہو جاتی ہے۔

ساتویں سے "ترقی" (پروموشن) پاکر آٹھویں آیا، جسے اس وقت کے کچھ قبل تک مڈل کلاس کہتے تھے، اور اس کا پاس کر لینا بھی ایک وجۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ اس کا امتحان ہوا تو ساتویں کی طرح اس میں بھی ریاضی میں فیل نکلا، والد صاحب قدرۃً ناخوش اور میری طرف سے مایوس ہو گئے، اور فیصلہ ہو گیا کہ انگریزی تعلیم چھڑوا کر مجھے عربی پڑھائیں اور ذریعہ معاش فن طب کو بنائیں۔ طب یونانی اس وقت تک ایک معزز ذریعہ معاش تھا۔ میں خود اس فیصلہ سے بڑے سوچ میں پڑ گیا۔ اور افسردہ رہنے لگا ــــــ سوچتا ہوں کہ اگر اس فیصلہ کا عملی نفاذ ہو گیا ہوتا تو میں آج کیا اور کہاں ہوتا؟ بہتر ہوتا یا بدتر، یہ تو خیر چھوڑیئے، لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ اس سے کتنا مختلف ہو کر رہتا! زندگی کی ساری راہ ہی بدل گئی ہوتی۔ زندگی کی سمت و نوعیت متعین کرنے میں کتنا بڑا دخل ایسے ہی "اتفاقات" کو ہوتا ہے، نادان انسان، اپنی فہم و بصیرت کے مطابق، انھیں "اتفاق" "اتفاق" کہتا

کرتا ہے، اسے کیا خبر کہ ایسا ہر اتفاق، کیسے گہرے حکیمانہ نظام تکوینی کا ایک جزو لاینفک ہوتا ہے!

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے؟
پتّہ بھی کہیں حکم بن ہلا ہے؟

ادھر تو یہ کھچڑی پک رہی تھی، ادھر ایک اور ہی گل کھل کر رہا۔ اسی سال سے ایک نیا امتحان آٹھویں والوں کا کھل کر رہا۔ حکم یہ آیا تھا کہ سولہ برس سے کم سن کے اچھے ذہین وہونہار لڑکے انتخاب کر کے لکھنؤ بھیجے جائیں، جن کا امتحان سررشتۂ تعلیم کی طرف سے "ہائی اسکول اسکالرشپ سرٹیفکٹ" کے نام سے ہوگا۔ میں اس انتخاب میں آسانی کے ساتھ آگیا اور اسکول کے ایک نئے ٹرینڈ ٹیچر نے بڑی شفقت و توجہ سے ہم چند لڑکوں کو اپنی نگرانی میں تعلیم دینا شروع کی، امتحان دیئے گیا اور نتیجہ جب گزٹ میں چھپ کر آیا تو میں پاس تھا، اور وظیفہ کا مستحق!

اس نے والد صاحب کے فیصلہ کا رُخ ہی بدل دیا۔ میری نالائقی لیاقت میں تبدیل ہوگئی، مایوسی کی جگہ اُمید نے لے لی، اور میری اسکولی تعلیم خوشی خوشی جاری رہی۔ اور میں عزت کے ساتھ نویں میں آگیا۔ نواں درجہ اسکول میں اونچا اور معزز درجہ تھا۔

اسکولی زندگی عام طور پر نیک نامی ہی سے بسر ہوئی، چھٹے درجہ میں آیا تو کلاس کا مانیٹر (مکتبوں کی پرانی اصطلاح میں "خلیفہ") مقرر ہوگیا۔ مانیٹر وہی ہوتا تھا جس کی ساکھ ماسٹر اور ساتھیوں دونوں کی نظر میں قائم ہو، یہ ساکھ کہنا چاہیئے کہ ہر درجہ میں اہم ہوتی ہے قائم رہی، مسلمان لڑکے اور زیادہ عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے رہے، دسویں میں

آیا، تو مسلمان طلبہ کا حسن ظن اور بڑھا، اور میں بھی مسلمانوں کے ہر معاملہ میں پیش پیش رہنے لگا، جامع مسجد سے اسکول سے فاصلہ پر تھی، نمازی لڑکے جمعہ کو وہاں جانا چاہتے تھے، لیکن یہ بھی چاہتے تھے کہ آدھے دن کی غیر حاضری نہ لکھی جائے، میں اس تحریک کا علم بردار تھا اور انگریزی میں ایک بڑی سی عرض داشت (بہ طور میموریل) لکھ کر پیش کی، اور خاصی کامیابی رہی۔ دسواں کلاس ہیڈ ماسٹر خود لیتے تھے، مجھ سے اتنا حُسن ظن انھیں پیدا ہو گیا کہ کلاس کو سمجھانے کے لئے جب بلیک بورڈ پر بھیجنا ہوتا، تو مجھی کو بھیجتے۔ یہاں تک کہ ریاضی کے گھنٹے میں بھی، دوسرے لڑکے جب جاتے تو ہیڈ ماسٹر کی مرضی نہ پہچان پاتے اور اکثر اُلجھن اور بڑھا دیتے۔

یہ سب تو تھا، لیکن ریاضی کی کمزوری بدستور چلی جا رہی تھی، یہاں تک کہ نویں سے دسویں میں جو آیا تو پاس ہو کر نہیں بلکہ وہی ترقی پا کر۔ جب بڑا امتحان قریب آنے لگا تو خود ہیڈ ماسٹر کو فکر پیدا ہوئی یہ لڑکا اور چیزوں میں فرسٹ ڈویژن کے نمبر لانے والا ہے، کہیں ریاضی میں لڑھک نہ جائے، آدمی سمجھ دار و تجربہ کار تھے، تشخیص یہ کی کہ اس کمزوری کا باعث نافہمی یا کج فہمی نہیں بلکہ محض کم مشقی او وکم توجہی ہے۔ ساتھ کے ایک کائستھ اور اچھے ریاضی داں لڑکے کو لگا دیا کہ چھٹی کے بعد اسکول کے برآمدے میں بیٹھا، آدھ گھنٹے اس سے سوالات کی مشق اپنے سامنے کرا دیا کرو۔ وہ لڑکا بھی بڑا شریف نکلا، پرائے کام کو اپنا کام سمجھ لیا، پابندی سے مشق کرانا شروع کر دی، میں نے اپنی والی بہت کچھ کوشش اسے باتوں میں لگانے کی کر ڈالی، وہ میرے بھرّے میں نہ آیا۔ اپنی ڈیوٹی پوری ہی کر کے رہا کیا، اور شرافت کا کمال اس سے بڑھ کر یہ دکھایا کہ اس وقت تو خیر کیا معاوضہ قبول کرتا امتحان کے ایک عرصہ کے بعد جب میں نے والد صاحب کی طرف سے ایک ہلکی سی رقم

ایک خط کے ساتھ پیش کی، تو اس نے کسی طرح نہ قبول کیا، حالاں کہ بے چارہ بری طرح حاجت مند بھی تھا! ——— شریف آخر ہر قوم میں ہوتے ہیں اور ان صاحب کا شمار تو میرے محسنوں میں ہے۔ نام لکھے دیتا ہوں، پیارے لال سریواستوا۔ سندیلہ ضلع ہردوئی کے باشندے تھے، میٹرک میرے ساتھ ہی وہ پاس کر کے کیننگ کالج لکھنؤ میں آئے، مگر ان کا کورس سائنس کا تھا، یک جائی کا موقع نہ مل سکا، کوئی اونچا امتحان پاس کر کے سائنس ہی کی کسی شاخ میں ڈپٹی انسپکٹر ہو گئے۔ شریف کی بھی کیا بات ہوتی ہے سنہ ۱۹۶۰ء کے اخیر میں میرے بھائی صاحب کا انتقال ہوا، خبر پانیر میں پڑھ کر، سالہا سال کے بعد یک بیک نمودار ہوئے، خاتون منزل میرے پاس تعزیت کو آئے اور بولے تو یہ بولے کہ "آج آپ کے بھائی کا نہیں، میرے بھائی کا انتقال ہوا ہے"!

امتحان سنہ ۱۹۰۸ء میں ہوا، جون میں نتیجہ آیا، تو میں دوسرے درجہ میں پاس تھا۔ عجب نہیں کہ انگریزی وغیرہ کے نمبر درجہ اول کے آئے ہوں، اور حساب میں درجہ سوم کے اور میزان کے لحاظ سے درجہ دوم رہا ——— مارچ ۱۹۰۸ء کی کوئی اخیر تاریخ ہو گی اور اسکولی حاضری کا بالکل اخیر دن کہ سہ پہر کے وقت ہمارا کلاس آخری بار اکٹھا ہو کر اسکول کے ہر کلاس اور ہر ماسٹر سے رخصت ہونے نکلا وہ مؤثر منظر مدتوں تازہ رہا، اور اس کا دھندلا سا نقش آج بھی موجود ہے۔ جدائی اور رخصتی کا کون منظر مؤثر نہیں ہوتا؟ ——— جو اسکول مہینے دو مہینے نہیں، چھ سال تک اپنا گھر بنا رہا تھا، اب اس میں آنا بیٹھنا، کبھی نصیب نہ ہو گا؟ ساتھیوں کے مل بیٹھنے، ہنسنے بولنے کا آج آخری دن ہے! بالکل آخری دن! یہ چھ سال اس سن کے پیمانۂ زماں کے لحاظ سے، بیس سال کے برابر تھے، اور اتنے سال

گزارے بھی کس طرح تھے! رو دھو کر، منہ بسور کر نہیں، پریشانیوں اور فکر مندیوں کے ساتھ نہیں، خوب آزادیوں کے ساتھ، پوری بے فکریوں کے ساتھ، انتہائی زندہ دلی کے ساتھ، آج جدائی اسی اسکول سے ہو رہی تھی، چپہ چپہ اس کا عزیز ہو گیا تھا، گوشہ گوشہ اس کا دل و دماغ میں رَس بس گیا تھا! دل کیسے نہ مسلتا، قلق کیسے نہ ہوتا! —— کون اس وقت بتاتا کہ اے غافل، نادان چھوکرے! ابھی تجھ پر گزری ہی کیا ہے، ابھی تو زندگی کی عمارت — کی چوکھٹ پر تو نے قدم رکھا ہے، ابھی تو کتنے درد و قلق، کتنے رنج و صدمے، کتنی مایوسیاں اور حسرتیں، قسمت میں قدم قدم پر لکھی ہوئی ہیں، اور اس ناسوتی زندگی کے ختم پر جو دھڑکا اور اندیشہ ولعذاب الآخرۃ اکبر کا لگا ہوا ہے، اس کا کوئی ذکر ہی نہیں!

باب (۱۲)

اسکولی زندگی نمبر (۲)

اس اسکولی زندگی کا بیان ایک لمبے باب میں ختم ہو گیا متعلقات سلسلہ میں ابھی بہت کچھ باقی ہے۔

ساتویں میں تھا کہ کچھ تو اسکولی ساتھیوں اور کچھ باہر والوں کی تحریک و ترغیب سے ایک پڑھنے لکھنے، بحث و گفتگو کا کلب "فرینڈز کلب" کے نام سے قایم ہوا، شریک غالب مسلمان ہی تھے، دو تین ہندو بھی تھے۔ ہفتہ وار جلسے ہر اتوار کو صبح کبھی کسی اور ممبر کے ہاں ہوتے تھے اور کبھی ہماری کوٹھی کے ایک برآمدے میں۔ اکثر لکھے ہوئے مضمون پڑھے جاتے، کبھی زبانی مباحثے بھی ہو جاتے، زیادہ تر اردو ہی میں، عنوان عموماً مرنجان مرنج قسم کے رکھے جاتے، تاکہ کسی مذہبی یا سیاسی ردّ و کد کی نوبت نہ آئے۔ ٹینس کا کھیل بھی کبھی کبھی شام کو ہماری کوٹھی کے لان پر ہو جاتا۔ لکھنؤ سے نکلنے والا ایک انگریزی روزنامہ منگایا جاتا اور اردو کے دو ایک ہفتہ وار، اور ایک آدھ ماہنامہ۔ اصل روح رواں جو صاحب تھے، ایک میرے بھائی صاحب، دوسرے ایک اور صاحب جو اب مدت ہوئی مرحوم ہو چکے ہیں۔ اسوقت طالب علمی ختم کر کے نئے نئے دیوانی ملازمت میں داخل ہوئے تھے اور شعر و ادب کا اچھا مذاق اور خاصی بصیرت رکھتے تھے ــــ دو ایک مضمون میں نے بھی پڑھے، مثلاً

"تعلیم نسواں" پر کہ یہ موضوع اس زمانہ میں خوب زوروں پر تھا۔ اور اب کچھ زیادہ یاد نہیں آتا، بہرحال علمی، ادبی، مجلسی زندگی کا کچھ نہ کچھ سلیقہ تو اس سے آ ہی گیا۔

اخبار بینی، مضمون نگاری، بلکہ داغ بیل کی حد تک تصنیف و تالیف کا سلسلہ اسی اسکولی دورِ زندگی میں پڑ گیا تھا۔ تفصیلات ان شاء اللہ دوسرے عنوانوں کے تحت آئندہ ملیں گی۔

اوپر گزر چکا ہے کہ پڑھنے، بلکہ پڑھ ڈالنے کا چسکا بچپن ہی سے پڑ گیا تھا۔ اسکولی زندگی میں یہ دُھن اور بڑھی ——— ۴ بجے اسکول سے چلا آ رہا ہوں۔ سہ پہر کا ناشتہ بلکہ کھانا انتظار کر رہا ہے، آتے ہی کھانے پر نہیں بلکہ آتے ہوتے اخباروں پر گرتا ہوں، انھیں کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا ہوں، جب کہیں کھانے کو ہاتھ لگاتا ہوں، کھاتا جاتا ہوں، اور ساتھ ساتھ آئی، ڈی، ٹی (لکھنؤ کا انگریزی روزنامہ) پڑھتا جاتا ہوں۔ ایک مثال ہوئی اسی پر قیاس کر کے دن رات کی پڑھائی کا کر لیجئے، اور پڑھائی بھی کیسی؟ اندھا دھند، نہ کافی روشنی کا دھیان، شام کا جھٹپٹا ہو یا صبح کا دھندلکا، آنکھوں پر زور دے دے کر بس پڑھے چلا جا رہا ہوں۔ اور نہ اس کی سُدھ کہ پڑھتے وقت سیدھا بیٹھ تو جاؤں، اندھا دُھند لیٹا ہوا ہوں یا چت پڑا، کہ کتاب آنکھوں کے سامنے اڑی ہوئی ہے، بتانے والا، ٹوکنے والا کون تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھوں کی بینائی اپنے ہاتھوں خراب کر ڈالی اور بالکل ہی نزدیک بین ہو کر رہ گیا۔ گز دو گز فاصلہ کی چیزیں صاف نہ سوجھتیں۔ کلاس میں بلیک بورڈ پر جو کچھ لکھا جاتا اسے خاک نہ پڑھ پاتا۔ نویں درجہ میں پہنچا تو عینک لگانا ناگزیر ہو گئی۔

بچپنا بھی کیا چیز ہوتا ہے! بجائے تاسف و قلق کے آنکھ کی معذوری اور عینک کی

محتاجی پر اور خوش ہوا کہ جیسے کوئی خوش نما زیور پہننے کو مل رہا ہے؟ لکھنؤ آیا اور بھائی صاحب کے ساتھ جا کر نظیر آباد و امین آباد کے چوراہہ پر عین نکڑ پر جو بڑے نمایاں سائن بورڈ کے ساتھ دوکان "ڈاکٹر" کرم حسین کی تھی، ان کے ہاں سے بڑے خوش خوش عینک خریدی، نام کے ڈاکٹر صاحب محض عینک فروش و عینک ساز تھے، مگر ان کی دوکان اس وقت خوب چل رہی تھی، اور خود یہ ڈاکٹر صاحب اس کے کچھ روز بعد بڑے پُر جوش قسم کے قومی مسلمان ہو گئے۔ اللہ مغفرت کرے۔ عینک کیا ہاتھ آئی کہ جیسے آنکھیں کھل گئیں "غیب" کا کتنا بڑا حصہ "شہود" میں آ گیا۔ اس دن کی خوشی کا کیا پوچھنا عینک صرف دُور بین تھی یعنی فاصلہ کی چیز دیکھنے کے لئے لیکن اس چودہ سال کے چھوکرے نے اسے نزدیک اور دُور ہر کام کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جاگتے بھر ایک منٹ کی جدائی اس سے گوارا نہ تھی۔ یہ بد پرہیزیاں اور بے احتیاطیاں، آخر کب تک رنگ نہ لاتیں۔ آنکھیں اور زیادہ چوپٹ ہو کر رہ گئیں۔ آہ، وہ بچپن کی بے وقوفیاں اور نادانستہ خود آزادیاں! لیکن پڑھائی کی اس دُھن کے باوجود یہ نہ ہوا کہ کھیل کود کے میدان میں پھسڈی رہ جاؤں۔ شروع شروع تو کرکیٹ کا شوق غالب رہا، اسکول میں تو کم، گھر پر زیادہ بجائے چمڑے کے سخت گیند کے، ربڑ کا ٹینس والے گیند سے کھیلے جاتا، نوکروں چاکروں یا ان کے لڑکوں کی ٹیم بنا کر۔ پھر شوق فٹ بال کا غالب آ گیا، اور نویں دسویں تک یہی شوق برقرار رہا۔ ادھر سہ پہر ہوا، اور دن چھٹی کا ہو یا پڑھائی کا، ادھر میں اسکولی فیلڈ پہنچ گیا اور لگا فٹ بال میں الٹی سیدھی کِکیں لگانے، اور اس دن کی کچھ نہ پوچھئے، جب بارش کے پانی یا کسی اور معذوری سے یہ معمول ٹل جاتا، کتنا کھلتا اور طبیعت کیسی جز بز ہو کر رہتی۔ بندوں سے لے کر نعوذ باللہ اللہ میاں تک پر جھنجلاتا۔ نام اسکول کی

فرسٹ الیون میں تو کبھی نہ آیا۔ البتہ ٹیم جب کبھی باہر کھیلنے کے لئے جاتی تو یہ فرمائش کپتان سے ضرور جڑ دیتا کہ میرا نام اکسٹرا میں رکھ دیا جائے۔ ٹیم میں جگہ زیادہ تر "ہاف بیک" کی ملتی، اس کی مشق زیادہ تھی۔ اونچے درجوں میں جب پہنچا تو رغبت ٹینس کی جانب بھی ہوئی۔ کوٹھی میں ٹینس کورٹ موجود تھا۔ بھائی صاحب اس میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلتے، مجھے اپنے سن والے نہ ملے، اس لئے کچھ زیادہ جی نہ لگا۔

ماسٹروں، استادوں کا اثر نوعمری میں زیادہ ہوتا ہے مار پیٹ اور سزاؤں سے تو اسکول بھر گویا بچا ہی رہا۔ تاہم ماسٹروں کے رعب و داب سے دل کبھی خالی نہ رہا۔ ساتویں درجہ کے ماسٹر بڑے جفاکش، فرض شناس اور قابل ملے، آٹھویں درجہ کے ایک خصوصی ماسٹر جو نئے ٹرینڈ ماسٹر تھے مجھ سے خصوصی حُسن ظن رکھتے تھے بار بار یہ فقرہ اس نااہل کے لئے استعمال فرمایا کرتے۔ YOU ARE SURE TO MAKE A MARK IN THE WORLD

ایک اور ماسٹر سائنس پڑھانے آتے، میں ان کے کلاس میں نہ تھا، تاہم مجھ سے بہت خوش رہے اور ہیڈ ماسٹر تو میرے حق میں پیکر شفقت و کرم ہی رہے، یہ سب ماسٹر صاحبان ہندو تھے۔

مسلمان استادوں میں مرزا محمد ذکی لکھنوی اور مولوی سید حیدر حسین لکھنوی دونوں شیعہ تھے دونوں سے مجھ سے خوب نبھی بلکہ مولوی محمد ذکی صاحب کو تو اپنا خاص محسن سمجھتا ہوں۔ عربی میں نے انھیں کی زور زوری سے لی۔ ان دونوں کے بعد فرنگی محل کے مشہور مدرس مولوی عظمت اللہ صاحب آگئے۔

نفحۃ الیمن پر انھیں کا حاشیہ ازالۃ المحن کے نام سے ہے، ان سے تو گویا بالکل عزیزانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے عربی شد بُد جو کچھ مجھے آئی، اس میں بڑا دخل انھیں کی توجہ و شفقت کو ہے، انھیں کے بھانجے اور داماد لکھنؤ کے ایک معروف واعظ و میلاد خواں مولوی صبغت اللہ شہید تھے، اور بہت بعد کو میرے مخصوص مخلصوں اور بے تکلف دوستوں میں شامل ہوئے، اور اخیر ۱۹۶۴ء میں بہ حالت سفر کلکتہ میں انتقال کیا۔ ایک دوسرے بھانجے مولوی سخاوت اللہ مرحوم تھے۔ سیتاپور میں اپنے ماموں کے ساتھ ہی رہتے، ان کے لڑکے مفتی محمد رضا فرنگی محلی اس وقت میرے مخلصوں میں ہیں۔

عادات و کردار پر بڑا اثر ساتھ کے لڑکوں کا پڑتا ہے، اور اب کیا بتایا جائے کہ ساتھ کے لڑکے عموماً کیسے تھے، اسکولوں کا ماحول اب جتنا گندہ ہے، اس سے تو بہرحال کم، پھر بھی اسی نوعیت کا اس وقت بھی تھا، اور بعض لڑکے تو بہت ہی گئے گزرے تھے، کہنا چاہیے کہ ہر قسم کی خباثت و شیطنت کے پُتلے، اور مسلمان لڑکے بھی اس صف سے الگ نہیں، ایک مشہور لڑکے کا شیطانی اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا، لیکن الحمد للہ بات زیادہ نہیں بڑھنے پائی، خانگی ماحول کی پاکیزگی کام آئی ——— محرّم کے زمانہ میں سیتاپور میں بھی خوب دھوم دھام ہوتی اور نویں محرّم کو عورتوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں زیارت کے لئے نکلتیں۔ ایک ہندو لڑکے نے پٹی پڑھائی کہ وہ رات بڑی مزیدار ہوتی ہے، عورتوں کے جسم خوب مس کرنے کو مل جاتے ہیں، والد صاحب سے رات بھر گھومنے کی اجازت مانگی، نئی فرمائش پر اُنھیں حیرت ہوئی، لیکن بہرحال اجازت مل گئی۔ گھر سے چلا اِسی شیطانی ارادہ سے، لیکن طبعی شریفانہ جھجک آڑے آئی، ایک بار بھی ہمّت نہ قدم آگے

بڑھانے کی ہوئی، نہ ہاتھ بڑھانے کی، جیسا گیا تھا ویسا ہی واپس آگیا ـــــ اسی ایک نمونہ سے اندازہ میری حرکتوں کا کیا جا سکتا ہے۔

طلبہ کے انبوہ میں ایک اور تنہا استثنائی مثال ایک ملیح آبادی خان زادے کی تھی، جوان تھے، عمر میں مجھ سے بڑے درجہ میں مجھ سے نیچے۔ پڑھائی لکھائی میں تو بس واجبی سے تھے، لیکن اخلاق و شرافت میں اپنی مثال آپ۔ اخلاقی زندگی کے اعتبار سے ایک "ہیرو" کے مرتبہ پر۔ کیا بورڈنگ اور کیا اسکول، سب پر ان کا اخلاقی رعب قائم، ڈھیٹ سے ڈھیٹ لڑکوں کی بھی مجال نہ تھی کہ ان کے سامنے کوئی گندہ فقرہ بول سکے۔ عقائد و عبادات میں بھی بڑے پختہ، بے چارے جلد ہی انتقال کر گئے۔ اللہ ہر طرح مغفرت فرمائے نام عبدالباری خاں۔ ایک اور ملیح آبادی کا بھی اچھا اور شریفانہ سابقہ رہا۔ علی حسن خاں نام تھا، بعد کو آب کاری انسپکٹر ہو گئے تھے ـــــ سن کوئی سا بھی ہو، انسان اگر عزم کرلے کہ نیکی و شرافت کی راہ پر قائم رہے گا تو شیطان میں اتنی قدرت نہیں کہ اسے زبردستی راہ سے ڈھکیل کر الگ کر دے۔

ساتویں درجہ میں تھا اور عمر کے بارہویں سال میں کہ شہر میں ایک تھیٹر آیا، سینما کا کوئی نام بھی اس وقت نہیں جانتا تھا تھیٹر ہی سب سے زیادہ فیشن ایبل تفریح تھی، کمپنی معمولی سی تھی بلکہ گھٹیا درجہ کی، لیکن چھوٹے سے شہر میں اس کے آنے سے ایک ہلچل پڑ گئی، تو چل، میں چل، سب ہی اس پر ٹوٹنے لگے، والد صاحب اس وقت ریٹائر ہو کر اب میونسپل بورڈ کے سکریٹری تھے، تھیٹر والوں کو زمین انھیں کی اجازت سے ملی، ان کے وہ لوگ بڑے ممنون و کرم ہوئے۔ کئی فری پاس انھیں دے گئے، خیر والد صاحب

کو توان کی مذہبیت تھیٹر جانے کی کہاں اجازت دیتی ہیں ہی ان کا پاس لے کر کسی کسی دن جاتا ــــــ کوئی محض ناچ رنگ کی محفل ہوتی، تو مجھے بھی جانے کی اجازت نہ ملتی۔ لیکن یہ تھیٹر تو صاحب لوگوں کی لائی ہوئی چیز تھا۔ اور فرنگستان کی راہ سے آئی ہوئی ہر چیز کا رعب دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ اس لئے اس تماشہ بینی اور تھیٹر بازی میں کوئی خاص مضائقہ نہیں سمجھا گیا، اسے صرف ثقاہت اور تقویٰ کے منافی سمجھا گیا، بلکہ اسکول کی تعلیم نے تو تھیٹر اور ڈرامے کا شمار فن لطیف یا آرٹ میں کر دیا تھا۔ اور میں بلا کسی شرم یا جھجک کے اپنا یہ شوق پورا کرتا رہا ــــــ کتنے گانے انھیں لوگوں کی زبان سے سن کر زبانی یاد کر لئے تھے۔ تنہائی میں بڑے شوق سے انھیں گنگنانے اور ان نقالوں کی نقالی کرنے کا ایک مستقل مشغلہ ہاتھ آگیا۔

آٹھویں میں آیا اور وہ کمسنی ابھی نہیں ٹلی ہوئی تھی کہ ایک ڈرامہ اپنے اسکول کے اندر، ہیڈ ماسٹر کی سرپرستی اور ایک ٹرینڈ ماسٹر کی نگرانی میں ہوا۔ پوشاکیں انھیں تھیٹر والوں سے مانگ کر آئیں۔ ڈاکوؤں کے سردار کا پارٹ مجھے ملا۔ اور میرے پارٹ کی دھوم مچ گئی، تماشائیوں کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے سچ مچ کا ڈاکو نکل آیا!

نویں یا دسویں میں آیا تو اسکول میں تقسیم انعام کی تقریب انگریز ڈپٹی کمشنر کی صدارت میں ہوئی۔ سہ پہر کا وقت تھا، اس میں بھی ایک انگریزی مکالمہ ہوا۔ بادشاہ جو جنگل میں راہ بھٹک گیا تھا، اس کا پارٹ مجھے ملا، اور اس پارٹ پر بھی خوب واہ واہ ہوئی ــــــ "صاحب" کی تقلید میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا، اور کس کی مجال تھی کہ ان چیزوں پر حرف رکھ سکے؟

اسکولی زندگی کا کوئی واقعہ، تعلیمی سلسلہ کا خیال میں نہیں آتا۔

باب (۱۳)

کالجی زندگی نمبر (۱)

مئی جون کی بڑی اسکولی چھٹی کا زمانہ دو سال سے دریاباد میں بسر ہو رہا تھا۔ والد صاحب بدستور سیتاپور میں رہتے۔ والدہ ماجدہ ہم تینوں کو لے کر دریاباد آجاتیں، اور کئی ہفتے یہیں رہتیں ـــــ جون ۱۹۰۸ء کی شروع کی کوئی تاریخ تھی کہ میٹریکولیشن کے نتیجہ والا گزٹ آیا (اس وقت تک نتیجہ صرف گورنمنٹ گزٹ یو، پی میں نکلتا تھا اور روزناموں میں چھپنے کا رواج نہیں ہوا تھا) اور اب کیا بتایا جائے کہ اُمید و بیم کے کِن ملے جُلے شدید جذبات کے ساتھ گزٹ کھولا اور پھر دیکھنا شروع کیا، ایک ہی دو منٹ کے بعد اپنا نام سکنڈ ڈویژن میں مل گیا۔ خوشی جیسی ہوئی ظاہر ہی ہے، ہوتی اس سے بھی بڑھ کر، لیکن بھائی صاحب اُسی سال انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں بیٹھے تھے اور ان کا نتیجہ بھی اسی گزٹ میں تھا، وہ بیچارے پاس نہ ہو سکے، اور اسی لئے میری اپنی خوشی بھی بُجھی بُجھی سی رہی ـــــ خالہ زاد بھائی حکیم عبدالحسیب صاحب جو بعد کو لکھنؤ کے ایک نامور طبیب ہوئے اور شفاء الملک وغیرہ کے خطاب سے سرفراز، تعلق و رابط کے لحاظ سے حقیقی بھائی کے حکم میں داخل تھے، اس وقت تک دریاباد ہی میں مطب کرتے تھے، آٹھ بجے صبح انھیں کے کمرے میں گزٹ دیکھا تھا اور وہ بھی کس طرح ان جذبات و مسرت میں شریک رہے

تھے ——— آج وہ جذبات دوبارہ کیسے پیدا کر لئے جائیں! ——— والدہ ماجدہ اندر تھیں، ان تک انھیں کی اولاد میں سے ایک کے لئے خوش خبری اور دوسرے کے لئے بدخبری ایک ساتھ پہنچانا تھی، بھائی صاحب تو بیچارے مغموم وہیں باہر بیٹھے رہے، میں ہی اندر آیا اور رُک رُک کر خبر والدہ کو پہنچائی۔

اب کالج کی تعلیم کا راستہ صاف تھا۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں نام کیننگ کالج لکھنؤ میں لکھ گیا۔ انٹرمیڈیٹ کا چلا ہوا اور عام فہم نام ایف' اے (فرسٹ ایرانِ آرٹ) تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کا وجود اس وقت کہاں تھا، یہ تو کوئی ۱۲ سال بعد ۲۰ء میں قائم ہوئی۔ لکھنؤ کے سب کالج الہ آباد یونیورسٹی کے ماتحت تھے اور ایف اے کا امتحان تو دو سال کے کورس کے بعد، یونیورسٹی کا ہی ایک امتحان ہوتا تھا (انٹرمیڈیٹ بورڈ کوئی الگ نہ تھا) کیننگ کالج (جو بعد کو یونیورسٹی کالج بنا) اس وقت قیصر باغ کے جنوبی پہلو کے عین وسط میں تھا۔ شاندار عمارت وہی جس میں اب (۱۹۷۶ء میں) میوزک کالج قائم ہے۔ ہر اُستاد پروفیسر کہلاتا تھا۔ لکچرر، ریڈر وغیرہ کے امتیازات اس وقت نامعلوم تھے۔ پرنسپل کا انگریز ہونا تو خیر لازمی تھا۔ باقی اور بھی کئی اُستاد (تاریخ، فلسفہ، معاشیات، ادب' انگریزی، فزکس، وغیرہ کے) انگریز ہی ہوتے ——— یہ تفصیلات ضروری ہیں تاکہ اس وقت کا نقشہ، جس حد تک بھی ممکن ہو ذہن کے سامنے رہے (لارڈ کیننگ نام ایک پُرانے وائسرائے کا تھا، اور اسی کی یادگار میں اودھ کے تعلقہ داروں نے یہ کالج قائم کیا تھا) کالج جولائی کے شروع میں کھلا، اور میں سیتاپور سے لکھنؤ منتقل ہو آیا۔ وطنی تعلق دریاباد سے بہت کمزور پڑ چکا تھا، اور اس سے کہیں زیادہ تو سیتاپور اب وطن معلوم ہو رہا تھا

۶ برس کا لگاتار قیام، اور پھر اس سن میں، مدت کچھ کم ہوئی؟ سیتاپور کی دل چسپ صحبتیں اسکول اور اس کے متعلقات کی بہت یاد آتی رہیں، لیکن سیتاپور اول تو لکھنؤ سے کچھ ایسا دور نہیں تھا، چھوٹی لین باوجود اپنی سست رفتاری کے تین گھنٹے میں پہنچا دیتی والدین وہیں موجود تھے، اور پھر چھٹیاں کالج میں کثرت سے ہوتی رہتیں، سیتاپور کے پھیرے جلد ہی جلد ہوتے رہتے اور سب سے بڑی بات یہ کہ زمانہ کوئی سی بھی یاد، بہت عرصہ تک چلنے ہی کب دیتا ہے نئی نئی دل چسپیاں لکھنؤ میں پیدا ہوتی گئیں، اور سیتاپور کی دل چسپیاں ان کے آگے سرد بلکہ گرد ہوتی گئیں۔

فاطر کائنات نے اپنی پیدا کی ہوئی دنیا کا نظام ہی کچھ ایسا رکھ دیا ہے، لڑکپن کو جوانی، اور جوانی کو ضعیفی کس تیزی کے ساتھ ڈھکیلتی، ریلتی پیلتی چلی جاتی ہے! کالج جولائی کے غالباً پہلے عشرہ میں کھلا۔ میں آیا، اور بآسانی داخل ہو گیا۔ داخلہ میں اب جو غضب کی چپقلش ہوتی ہیں، اس وقت کہیں اس کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ کالج میں داخلہ سے کہیں اہم سوال لکھنؤ میں مکان کا تھا۔ قریبی عزیزوں کا ایک بڑا وسیع وآرام دہ مکان، محلہ مشک گنج میں موجود تھا، لیکن ایک تو کالج سے اس کا فاصلہ ذرا زیادہ تھا۔ دوسرے وہ مکان بلکہ محلہ بھی "اولڈ فیشن" کا تھا، اور کم سنی کی جدت پسندی پر یہ قدامت زدگی ایک بار تھی۔ حسن اتفاق سے بڑے بھائی (عبد المجید صاحب) لکھنؤ میں پیشتر سے رہ رہے تھے، پڑھائی میں اب بچارہ مجھ سے ایک ہی سال آگے رہ گئے تھے، اور قیصر باغ ہی کے ایک مکان میں "بدنام زمانہ" تعلقدار صاحبان اپنے مکانوں کا ایک آدھ کمرہ طالب علموں کے لئے وقف رکھتے تھے اور اسے کار خیر سمجھ کر بڑی خوشی سے انھیں دے دیا کرتے تھے۔ سندیلہ کے ایک چھوٹے سے تعلقدار چودھری نصرت علی مرحوم تھے، بھائی صاحب کو

انھیں نے اپنے مکان میں جگہ دے دی تھی، قدرتاً میرے قیام کا انتظام بھی انھیں کے ساتھ ہوا، آکر دیکھا تو کمرہ نہ تھا اچھا خاصہ مستقل مکان تھا، چھوٹے بڑے تین کمرے، برآمدہ، غسل خانہ، پاخانہ، باورچی خانہ، غرض طالب علمی کے معیار سے بہت اچھا مکان، بغیر ایک پیسہ خرچ کئے ہوئے مل گیا —— اللہ ان چودھری صاحب کو کروٹ کروٹ جنّت عطا فرمائے۔

قیصر باغ کی وہ پرانی شاہی تاریخ تو خیر چھوڑیئے، جب وہ شاہی بیگمات، شاہزادہ شاہزادیوں کا رمنہ تھا۔ بلکہ خود جہاں پناہ واجد علی شاہ جہاں اپنا وقت خوش وقتیوں میں گزارتے رہتے تھے، میری طالب علمی کے زمانہ میں اپنی اُجڑی ہوئی حالت میں سہی، قیصر باغ لکھنؤ کا ایک معزز، پُر رونق گل و گلزار محلہ تھا، اور فیشن ایبل ہونے کے لحاظ سے بھی قدیم و جدید کا سنگم۔ سارے مکانات ایک زمانہ میں قصر شاہی کے ملحقات و متعلقات تھے، اب اودھ کے تعلقہ داروں کے قبضہ میں تھے، اور ہر ایک ان میں سے بجائے خود قصرِ مُعلّیٰ۔ چودھری صاحب کا مکان، قیصر باغ نمبر ۸ کہلاتا تھا اور اسے اپنی شرافت و وضعداری کی مستقل علامت بنائے ہوئے تھے کہ اپنے مکان میں کچھ طلبہ کو ہمیشہ جگہ دیتے رہیں۔ اور ان کے مکان سے کیننگ کالج کا فاصلہ کل فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کا تھا، ۲، ۲½ منٹ کا راستہ —— سیتاپور چھوٹنے کا غم یقیناً تھا۔ لیکن یہ خوشی اس پر غالب آتی گئی کہ اب رہنے کو لکھنؤ ملے گا۔ اپنی تمام علمی، ذہنی، مادّی دلچسپیوں کا زمانہ تھا اور وہ بھی بغیر کسی خاص نگرانی کے، گویا پوری آزادی کے ساتھ، عمر ایک بار پھر یاد کر لیجیے کہ اس وقت ۱۶ سال کی تھی۔

کالج کا رعب شروعِ شروع میں اچھا خاصہ پڑا، اپنے کو سب سے جونیر کلاس میں پا کر یہ اثر پڑنا قدرتی تھا، اور اسی طرح اس کا رفتہ رفتہ دور ہونا بھی قدرتی تھا۔ انگریزی زبان کا مضمون لازمی تھا اور اس کے دو پرچے ہوتے تھے، ایک پرچہ ٹکسٹ بکس (کتب نصاب) کا اور دوسرا ترجمہ اور مضمون نویسی کا، اختیاری مضمون تین لیے ہوتے تھے، میں نے منطق، تاریخ، اور عربی کو اختیار کیا (اُردو اس وقت تک یونیورسٹیوں میں داخل نہیں ہوئی تھی) تاریخ لینے کو تو لے لی، لیکن اس سے مراد تاریخ ہند، تاریخ مشرق وغیرہ نہیں بلکہ صرف تاریخ انگلستان تھی، اس میں دل بالکل نہیں لگا، طبیعت برابر اُچاٹ ہی رہی مضمون خود ہی میرے لئے خشک تھا، اس پر اس کے پڑھانے والے صاحب بہادر بالکل ہی اکھڑ یا خشن نکلے، ان کے کلاس کی حاضری ہی سے وحشت ہوتی۔ عربی کا ذوق اسکول سے لے کر آیا تھا، کچھ دن اس نے ساتھ دیا، لیکن رفتہ رفتہ جوں جوں اس میں ضعف آتا گیا، عربی کی قدر و وقعت بھی گھٹتی گئی، تیسرا اختیاری مضمون منطق تھا، اس میں البتہ خوب جی لگا۔ اس کی ایک آدھ کتاب انگریزی اور عربی میں میں نے اسی وقت دیکھ ڈالی تھی۔

جب اسکول میں نویں کا طالب علم تھا، ظاہر ہے کہ اس وقت سمجھ میں کیا آتیں، پھر بھی موٹی موٹی باتیں تو آ ہی گئی تھیں، اور ذہن فن سے نامانوس نہیں رہا تھا۔ یہ موانست اس وقت بڑی کام آئی، اور طبیعت کو اس سے مناسبت جو پیدا ہوئی تو علاوہ درسی کتاب DEDECTIVE LOGIC کے چھوٹی بڑی اور کتابیں اس فن کی لائبریری سے لے لے کر پڑھ ڈالیں۔ فزیالوجی اور سائیکالوجی کورس میں نہ تھیں لیکن ان کا بھی جو شوق پیدا ہوا، تو اُلٹے سیدھے ان کی کتابیں بھی چاٹنا شروع کر دیں، لائبریری میں بیٹھ کر بھی اور لائبریری سے نکلوا کر بھی گھر پر۔ انگریزی زبان تو لازمی ہی تھی۔ مطالعہ

اس کی درسی کتابوں سے متعلق تو کچھ واجبی ہی سا رہا۔ البتہ دوسرے پرچہ یعنی ترجمہ اور مضمون نویسی (COMPOSITION) میں خوب جی لگا۔ انگریزی رسالے اور اخبار جو بھی ہاتھ آگئے، بس وہ گھونٹ ڈالے۔ دو تین اونچے ہفتہ وار لندن کے آتے تھے، ان پر ٹوٹ کر گرتا تھا۔ انھیں سے انگریزی تحریر پر تھوڑی بہت جِلا ہوگئی ـــــ پہلے سال کا جب سالانہ امتحان ہوا تو منطق میں درجہ بھر میں اوّل آیا، اور خیال ایسا پڑتا ہے کہ انگریزی کے بھی دونوں پرچوں میں۔

کتابوں کی ہوس جو شروع سے تھی، وہ اب قیام لکھنؤ میں پوری ہوتی نظر آئی۔ شہر میں قابل ذکر لائبریری ایک رفاہ عام لائبریری تھی، سٹی اسٹیشن کے جنوب و مشرق میں جگت نرائن روڈ کے گھماؤ پر، اور بلند باغ کے قریب۔ اس کی شاندار عمارت اب بھی قائم ہے۔ انگریزی کتابوں کا ذخیرہ اچھا خاصہ تھا، اور انتظام بھی عمدہ تھا ہندو مسلمان شیر و شکر نظر آتے تھے، اور شام کے وقت کئی کئی تازہ اخبار انگریزی اور اردو کے میز پر دکھائی دیتے تھے۔ ایک دوسری لائبریری ورما لائبریری کے نام سے قائم تھی، اور نظیر آباد اور بازار جھاؤلال کے درمیان ایک گلی کے اندر واقع تھی، شہر کے مشہور لیڈر بابو گنگا پرشاد ورما اسی عمارت میں رہتے تھے، اور ان کے دونوں اخبار سہ روزہ ایڈوکیٹ (انگریزی) اور ہندوستانی (اردو) یہیں سے نکلتے تھے، یہی لائبریری اپنی ترقی یافتہ صورت میں گنگا پرشاد میموریل لائبریری کے نام سے ایک عالی شان عمارت میں امین الدولہ پارک کے جنوبی رُخ پر قائم ہے۔

یہ اس وقت کتابوں کے لحاظ سے تو کچھ یوں ہی سی تھی۔ البتہ انگریزی کے تازہ اخبار یہاں خوب مل جاتے تھے۔ تیسری لائبریری ایک معمولی سی، میوزیم (عجائب گھر) کی عمارت

لال بارہ دری کے متصل تھی۔ یہی آگے چل کر اور بہت بڑھ کر پبلک لائبریری بنی۔ ان تینوں سے جی بھر کر کام لیا اور اب عمر کا وہ دور تھا کہ رفتہ رفتہ مذہب سے آزاد ہو چکا تھا۔ اور کسی قسم کے کھیل کود میں بھی نہیں پڑا تھا، اس لئے سہ پہر اور شام عصر و مغرب کا سارا وقت بلا کسی خلل کے کتابوں کی نذر کرتا ـــــ ناشکری ہوگی اگر اس موقع پر اپنے بھائی صاحب کا ذکر کرنا بھول جاؤں، لائبریریوں کے گشت کا چسکا اول اول انھیں نے ڈالا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا ذوق زیادہ تر بجائے کتب بینی کے اخبار بینی تک محدود رہا تھا۔

چوتھی اور سب سے بڑی لائبریری خود اپنے کالج کی تھی اس سے فائدہ اتنا اٹھایا کہ کالج چھوڑنے کے کچھ عرصہ بعد، جب ایک بار سرٹیفکٹ لینے کی ضرورت اپنے پرنسپل صاحب سے ہوئی، تو انھوں نے سرٹیفکٹ میں یہ لکھا کہ اُس طالب علم سے زیادہ میرے علم میں کسی دوسرے نے لائبریری سے کام نہیں لیا ہے۔ ـــــ اور صورت واقعہ کچھ تھی بھی ایسی ہی کہ ادھر ذرا موقع ملا اور میں کلاس سے کھسک کر لائبریری میں آداخل ہوا۔ کبھی اس الماری کے پاس کھڑا ہوں اور کبھی اس الماری کے پاس۔ اور آزادی سے جو کتاب چاہی نکال کر پڑھنا شروع کر دی۔ اس وقت کتابوں کے نکالنے پر یہ پابندیاں اور بندشیں کہاں تھیں۔ سہ پہر سے شام تک کا عام معمول رفاہ عام لائبریری میں رہنے کا تھا۔ تھوڑے ہی دن میں سمجھے اور بے سمجھے، کچا پکا بہت کچھ مطالعہ کر ڈالا۔

مسلمان اُستاد اصل کالج میں صرف ایک تھے، مولوی نورالعزیز ایم، اے، استاد فارسی، عربی کی تعلیم کا کوئی انتظام اصل کالج میں نہ تھا بلکہ اس کی ایک

خصوصی شاخ اورنٹیل ڈپارٹمنٹ (شعبہ مشرقی) میں تھا۔ اس صیغہ کی عمارت بھی اہل کالج سے الگ، قیصر باغ کے مشرقی رُخ کے خاتمہ پر دو چار چھوٹے کمروں کی تھی، عربی کے گھنٹے میں یہیں جانا ہوتا تھا۔ عربی لینے والے ہوتے ہی کے تھے، جب بہت ہوئے تو چار کی تعداد پہنچی۔ ایف اے میں ان چار عربی لینے والوں میں ایک بنگالی ہندو بھی تھا، غالباً برہمو سماج تھا۔ ایک شیعہ طالب علم کا ساتھ بھی برابر رہا۔ اس شعبہ میں دو اُستاد رہا کرتے تھے، ایک شیعہ عالم اور ایک سُنّی۔ قاعدے سے ہر کلاس کے لئے باری ہر سال ایک ایک استاد کی پڑتی تھی۔ میرے لئے باری شیعہ اُستاد کی آئی، اور عجب اتفاق کہ چار سال تک مسلسل باری انھیں اُستاد کی رہی۔ سُنّی کلاس میں جانے کی نوبت ایک دن بھی نہ آئی۔ سنّی اُستاد اس وقت کے فرنگی محل کے ایک ممتاز معقولی عالم، شمس العلمآ مولوی ابوالغنا عبدالمجید صاحب تھے۔

باب (۱۴)

کالجی زندگی نمبر (۲)

کالج کی زندگی میں قدم رکھتے ہی عقائد کی دنیا کہنا چاہئے کہ زیر و زبر ہونا شروع ہوگئی، تفصیل تو ایک باب میں آئے گی۔ یہاں سلسلۂ بیان میں بس اتنا سمجھ لیجئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس مسلمان قالب کا قلب باضابطہ مرتد ہوئے یا کوئی دوسرا مذہب قبول کئے اسلام اور ایمان سے یکسر خالی ہوگیا۔ یہاں تک کہ دو سال بعد شروع سنہ میں جب انٹرمیڈیٹ کا فارم بھرنے کا وقت آیا تو مذہب کے خانہ میں بجائے مسلمان لکھنے کے "ریشنلسٹ" لکھ دیا۔ یہ تفصیل اب خوب ذہن میں نہیں، بہرحال دو سال کے اندر ہی اندر یہ نوبت آگئی تھی کہ اپنے کو مسلمان کہلانے میں تکلف ہونے لگا تھا، بلکہ اس انتساب سے اپنے کو ایک طرح کی شرم آنے لگی تھی۔ انٹرمیجیٹ بھر اپنا مستقل قیام لکھنؤ ہی میں رہا۔ اور والدین سیتاپور ہی میں مقیم رہے۔ بڑی چھٹیاں تو لازمی طور پر اور کبھی ایک آدھ دن والی چھٹی بھی سیتاپور ہی میں گزارتا (دریاباد سے ابھی کوئی تعلق ہی نہ تھا) دونوں جگہ کے معیار زندگی میں خاصہ فرق تھا۔ لکھنؤ میں زندگی محض طالب علم کی تھی۔ سیتاپور کی زندگی خاصی خوش حالی کی تھی، والد صاحب اب چار سو ماہوار کما رہے تھے، (دو سو ماہوار پنشن کے اور دو سو ماہوار مشاہرہ میونسپل سکریٹری کا، اور ۱۰ – ۱۹۰۹ء کے چار سو بلا شائبہ مبالغہ ۱۹۶۷ء

کے تین ہزار سے اوپر کے برابر تھے۔ کوئی مقابلہ ہی جب کی اور اب کی قیمتوں کا نہیں، سیتاپور میں اوسط درجہ کا سامان امارت موجود تھا۔ کوٹھی، گھوڑا گاڑی وغیرہ۔ انٹرمیڈیٹ کا پہلا سال بھائی صاحب کے ساتھ قیصر باغ نمبر ۸ میں گزرا۔ دوسرے سال ہمارے ان محسن چودھری صاحب پر کوئی افتاد پڑی، اور ہم لوگ محلّہ مشک گنج کے ایک مکان میں منتقل ہو آئے۔ یہ ایک بہت بڑا مکان ہمارے ایک سندیلوی عزیز قریب کا تھا اور خالی پڑا ہوا تھا۔ اسے ہم دونوں نے آباد کیا۔ اور ایک آدھ اور دریابادی عزیز بھی یہیں آگئے۔

اسکول میں فٹ بال کا شوق تھا، لکھنؤ آکر سارا وقت کتابوں، رسالوں کی چاٹ میں لائبریریوں کی نذر ہونے لگا۔ اور فٹ بال کیا معنی، کسی بھی کھیل کے لئے کوئی وقت نکلتا تو کہاں سے، کالج میں ایک ڈرامیٹک سوسائٹی تھی، آتے ہی اس میں دلچسپی لی، مگر فرسٹ ایر والے کی بساط ہی کسی کی نظر میں کیا تھی، شکسپیر کا ایک ڈرامہ غالباً MID - SUMMER NIGHT DREAM کھیلا جانے والا تھا، اس کی تیاریوں میں لگا رہا، شاید ریہرسل کی بھی نوبت آگئی تھی، پھر یاد نہیں کہ کیا بجوگ پڑ گیا۔ بہر حال ڈرامہ اسٹیج نہ ہو سکا ——— لفظ "تعلیم" و "اعلیٰ تعلیم" سے مرعوب بلکہ مسحور ہو کر، جو پرانے قسم کے مسلمان والدین اپنی اولاد کو بے تحاشہ انگریزی کالجوں میں جھونکتے جاتے تھے یہ بات ان کے سوچنے کی تھی "تعلیم" کو وہ اپنے مکتبوں اور مدرسوں پر، اپنے دیوبند و فرنگی محل پر قیاس کر رہے تھے، جہاں گانے بجانے کی آواز ہی کان میں پڑ جانا ایک جرم تھا۔ یہاں تو اس کے برعکس گانا بجانا داخل ہنر اور دلیل کمال تھا۔ اور نقّالی سے بچنا کیسا ایکٹ کرنا اور سکھایا جاتا تھا۔ اچھی ایکٹنگ (نقالی) کی تو داد دل بھر کر دی جاتی

اور انعام اور تحفے جو ملتے وہ الگ، ایسے ماحول میں لڑکے کو ڈال کر، سادہ دل مسلمان والدین کا یہ توقع رکھنا کہ لڑکا پارسا، صالح، اور کسی درجہ میں متقی ہو کر نکلے گا، کس غضب کی سادہ لوحی تھی!

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

کا موقع اگر یہ نہیں، تو اور کیا ہوگا ——— یہی غنیمت تھا کہ اس وقت تک "مخلوط تعلیم" (CO- EDUCATION) کا قدم درمیان میں نہیں آیا تھا، اور بنی ٹھنی لڑکیوں کو ہم نشینی شوقین لڑکوں کی میسر نہ تھی، پھر بھی ماحول جیسا بھی تھا، وہ کیا کچھ تھوڑا تھا!

کالج میں ایک مجلس علمی تقریری ایسوسی ایشن بھی تھی، اصلاً انگریزی تقریری مباحث کی مشق کے لئے، گنجایش کبھی کبھی تحریری مقالوں کی بھی نکل آتی، بولنے اور تقریر کرنے میں اپنے شرمیلے پن کی بنا پر، میں کچا اور بودا ہمیشہ سے تھا، سنیچر کو کالج آدھے دن کا ہوتا، اور اس کے بعد اسی مجلس کا جلسہ ہوتا، شریک تو میں ہر جلسہ میں ہوتا، لیکن بولنے کی ہمت چار سال کی مدت میں بس دو ہی ایک بار کی۔ ایک بار مباحثہ گوشت خوری پر ہوا، مخالفین کثرت سے بولے، جوش میں آکر میں موافقت میں کھڑا ہوگیا اور دو چار منٹ کچھ بک بکا لیا۔ اور ایسی ہی نوبت شاید ایک اور آئی ہو، البتہ بیٹھے بیٹھے دوسرے مقررین کو مدد اچھی خاصی دیا کرتا، کسی کو کوئی نکتہ بتا دیا کسی کو برجستہ کوئی انگریزی مقولہ یا شعر یاد دلا دیا، کوئی چبھتا ہوا فقرہ کسی کے کان میں ڈال دیا۔ تحریری مقالوں میں البتہ شیر تھا، لیکن نوبت ان کی بھی ساری مدت میں کُل دو بار آئی، بڑی تیاریوں کے بعد پہلی بار

کی سائیکالوجی سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ اب تو یہ سائنس کا ایک حصّہ ہے اس وقت فلسفہ کا ایک جزو تھا)، اور ہاں عام علمی اور ادبی رسالے خوب پڑھتا رہتا۔ اس سے معلومات انگریزی لٹریچر سے بھی متعلق کافی رہتیں ـــــ ایک دن جنرل انگلش کے کلاس میں کیمرن صاحب سوال کر بیٹھے کہ اس وقت انگریزی کا بہترین ناول نگار کون ہے؟

جن لڑکوں کو اپنی ناول بینی پر ناز تھا، وہ جواب دینے لگے، کیمرن صاحب ایک ایک کے نام پر انکار کرتے رہے، کسی نے کہا جارج برنارڈ شا، کسی نے میری کاریلی کا نام لیا، میری زبان سے نکلا ٹامس ہارڈی، اس پر خوش ہو کر وہ بولے کہ ہاں، بس تم نے ٹھیک نام لیا۔ لیکن میرے ساتھی جھنجھلائے اور ایک بنگالی نے کہا کہ تم بڑے جھوٹے نکلے، کہا کرتے تھے کہ میں ناول پڑھتا ہی نہیں، آج حال کھل گیا، حالاں کہ واقعہ وہی صحیح تھا ناول واقعی میں پڑھتا نہ تھا، البتہ ناولوں اور ناول نگاروں سے تھوڑی بہت واقفیت جو تھی یہ ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ وغیرہ کی برکت تھی، اور ٹامس ہارڈی کا نام تو اپنے انھیں استاد کیمرن صاحب کی زبان سے کسی اور موقع پر سُن چکا تھا۔

اُردو شعر سننے اور سمجھنے کا ذوق شروع ہی سے تھا۔ کالج میں آ کر کچھ تُک بندی بھی شروع کر دی۔ فسٹ ایر میں تھا کہ ایک ساتھی کی ہجو میں ایک نظم کہی، تفصیل اس کی بھی آئندہ آئے گی۔

سکنڈ ایر میں تھا کہ آرٹ (نقاشی وغیرہ) کے ایک ماہر فن ڈاکٹر انند کشور کمار سوامی سیلونی ثم لندنی ہندوستان کی سیاحی کرتے ہوئے لکھنؤ وارد ہوئے، دنیا کی موسیقی پر کوئی کتاب لکھ رہے تھے، لکھنؤ میں گوئیوں کے فن کا نمونہ تلاش کر رہے تھے، کالج کے

جب تھرڈ ایر یعنی بی۔ اے کے پہلے سال میں آیا تو مقالہ جان اسٹوارٹ مل پر تھا۔ اس برطانوی مفکر و فلسفی سے عقیدت اس وقت درجۂ عشق کو پہنچی ہوئی تھی۔ مقالہ کیا تھا، فلسکیپ کے ۳۰، ۳۲ صفحوں کا ٹائپ کیا ہوا رسالہ تھا، خود نہیں سنایا تھا، مجلس کے سکریٹری کو سنانے کے لئے دے دیا تھا۔ وہ خود بھی ایک اچھے اور انگریزی کے خوش لہجہ مقرر تھے، صدر جلسہ میرے شفیق استاد مسٹر کیمرن تھے، رسالہ کی ضخامت دیکھ کر گھبرا اُٹھے اور بولے THIS ISQVITE A BOOK یہ تو "کتاب کی کتاب ہے" مقررہ وقت ۲۰ منٹ کا تھا، اس میں وہ کیا ختم ہوتا، صدر نے رعایتہً ۵ منٹ اور دیئے، جب بھی نہ ختم ہوا تو باقی حصہ چھوڑ دینا پڑا ـــــ صدر صاحب کو مقالہ پسند آیا۔ کئی ہفتوں بعد پہلا انعام انھیں سے ملا اور میں نے بجائے نقد کے کتابیں حاصل کیں۔

دوسرا مقالہ کالج چھوڑتے وقت تعلیم کے کسی پہلو پر لکھا۔ خاصے مطالعہ کے بعد انعامی یہ بھی قرار پایا، مگر اس پر انعام درجہ دوم کا ملا۔ کالج میں ہندو مسلم کشمکش تھی، گو بہت زیادہ نہیں، مجھے مبارک باد دینے والوں میں ہندو بھی تھے۔ میری مضمون نگاری اسی زمانہ سے مسلم ہوگئی تھی، بی۔ اے میں ESSAY WRITING کے گھنٹے میں میرا ہی نمبر اول رہتا۔ ایک ٹسٹ امتحان میں پرچہ خود کیمرن صاحب نے دیکھا اور مجھے نمبر ۱۰۰ میں ۸۲ دیئے۔ اُردو رسالے تو خیر وقت کے بڑے سے بڑے بھی میرے مضمون کے منتظر رہنے لگے تھے، انگریزی تحریر کی بھی مشق خاصی ہوگئی تھی، یہاں تک کہ ولایتی پرچوں میں بھی میرے دو ایک مضمون نکل گئے تھے، تفصیل مستقل عنوان کے تحت میں آئندہ آرہی ہے۔

انگریزی مطالعہ ادبیات کا بہت کم رہا۔ اور ناول و افسانے تو گویا چھوئے ہی نہیں بھرمار انگریزی مطالعہ میں فلسفہ و نفسیات کی کتابوں کی رہی ۱۲ــ۱۱ء کی سائیکالوجی کو شاید

ایک سینئر ساتھی نے میرا تعارف ان سے کرادیا اور میں لکھنؤ میں گویّوں تک ان کا واسطہ بنا میرے ساتھ جاکر انھوں نے وقت کے مشہور کشمیری طائفہ فضل حسین کا مجرا سنا اور شہر کے نامور رقاص بندادین کے ہاں بھی میں انھیں لے گیا (یہ حقیقت سالہاسال بعد کو کھل کر لکھنؤ میں پکّے گانے کے استاد اور بھی لوگ تھے، اس وقت میرے ذہن کی بھی رسائی وہاں تک نہ ہوئی) ـــــ لکھنؤ میں ناچ رنگ کے اڈّوں کی کیا کمی تھی اور مجھے آزادی بھی ایک بڑی حد تک حاصل تھی، لیکن اسی فطری شرم و حیا کا اقتضا "مجھے یا خاندانی شرافت کا، کہ کبھی ایسی رنگین محفلوں میں قدم رکھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ اور طالب علمی بھر ان حلقوں میں آمد و رفت بس انھیں دو ایک سنجیدہ و ثقہ موقعوں تک محدود رہی۔

لباس اپنا اس دور میں بھی وہی رہا، جو عموماً مسلمان شریف زادوں کا تھا، شیروانی اور تنگ مہری کا پاجامہ، ٹوپی گرمیوں میں دوپلّی، شروع سردی میں فیلٹ اور بعد کو سیاہ بال دار ٹوپی، البتہ دل میں آرزو بلکہ ہوس برابر کوٹ پتلون کی رہی رغبت اور مرعوبیت دونوں کی بنا پر۔ بھائی صاحب سوٹ پہننے لگے تھے۔ ایک روز وہ لکھنؤ سے باہر گئے ہوئے تھے، میں نے بکس سے ان کا پتلون نکال، خود ڈانٹ لیا، اور اس کی جیب میں ہاتھ ڈال، امین آباد اور اس کے ملحقات کے پھیرے کرنے شروع کر دیئے کہ ہر جاننے پہچاننے والے کی نظر مجھ پر پڑ جائے، اور دو سال بعد جب بی، اے میں تھا تو والد صاحب سے اجازت ہندوستانی قسم کے یعنی بند گلے والے کوٹ اور پتلون کی، جوں توں لے لی، اور پھر خوب ہی ارمان نکالے ـــــ کیسی کیسی نادانیاں، حماقتیں اس سن میں سر پر مسلط رہی ہیں۔

باب (۱۵)

کالجی زندگی نمبر (۳)

انٹرمیڈیٹ کا امتحان اپریل ۱۹۱۰ء میں ہوا، مئی جون کی بڑی چھٹیوں میں حسب معمول سیتاپور آیا۔ اور یہیں تھا کہ نتیجہ آگیا، کامیاب رہا، اور سکنڈ ڈویژن ملا، منطق اور جنرل انگلش میں نمبر یقیناً اوّل درجہ کے آئے ہوں گے اور عربی اور اسپشل انگلش میں دوسرے درجہ کے، اور تاریخ انگلستان کے خشک مضمون میں مرکھپ کے نمبر تیسرے درجہ کے آگئے ہوں گے، اور یوں کسی طرح دوسرے درجہ میں نکل آیا ـــــ خیر جس روز نتیجہ آیا ہے، اس روز کی خوشی اب تک یاد ہے، اور خالی خوشی ہی رہتی تو ٹھیک تھا، جی نہیں، خوشی سے بڑھ کر اتراہٹ تھی، فخر و ناز اس پر کہ اب میں معمولی طالب علم نہیں، بی، اے کا طالب علم ہوں، اور بی، اے ہو جانے میں اب دیر ہی کتنی ہے؟ بی، اے کی اہمیت اس درجہ دل میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا طالب علم ہونا بھی فخر کے لئے کافی تھا۔ اور اتنا تو واقعہ ہے کہ جو وقعت اس وقت بی اے کی تھی، وہ آج پی ایچ ڈی کو بھی حاصل نہیں، خوب یاد ہے کہ کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں سہ پہر کے وقت سڑک پر ٹہلتا جاتا تھا، اور دل ہی دل میں اپنے کو مبارک باد دیتا جاتا تھا کہ میرا اب کیا پوچھنا، اب بی، اے ہوں بی اے! ــــ انسان غریب، بچپن سے لے کر پیرانہ سالی تک عمر کے ہر دَور میں کن کن خوش خیالیوں

میں کیسی کیسی خود فریبیوں میں مبتلا رہا کرتا ہے، ایک مغالطہ سے نجات ہونے نہیں پاتی کہ نفس اپنے کو دوسرے مغالطہ میں پھنسا دیتا ہے۔

جولائی میں لکھنؤ آکر بی۔اے کے پہلے سال، یا اس وقت کی بولی میں کالج کے تھرڈ ایر میں داخل ہو گیا۔ اب مضمون یہ چار تھے، انگلش ٹکسٹ، جنرل انگلش، فلسفہ و عربی، ان میں سے دو آخری مضمون اختیاری تھے، اور پہلے دو لازمی۔ فلسفہ سے شوق بہت بڑھا ہوا تھا، اور اس کی تین شاخیں درس میں تھیں، الہیات (میٹافزکس) اور اخلاقیات (ایتھکس)، اور نفسیات (سائیکالوجی) ان تینوں میں نفسیات سے ذوق خصوصی تھا۔ اور منطق کے بعد (جو ایف اے پر ختم ہو گئی تھی) اب یہی مضمون سب سے زیادہ رغبت و پسند کا تھا۔ کالج لائبریری میں جتنی بھی کتابیں اس موضوع پر تھیں، اپنے خیال میں تو سب ہی چاٹ گیا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو کچھ یقیناً رہ گئی ہوں گی) MIND وغیرہ رسالے بھی بڑے چاؤ سے پڑھتا تھا۔ اونچا علمی سائنسی ہفتہ وار NATURE بھی پابندی سے پڑھا کرتا، اس میں طبیعات، فلکیات، حیاتیات وغیرہ کے علاوہ نفسیات پر بھی کبھی مضمون ہوتے تھے۔ یاد ہے کہ جس پرچہ میں کوئی نوٹ اس قسم کا نکلتا اس پر ٹوٹ کر گرتا۔ اور تھوڑا بہت جو کچھ بھی سمجھ میں آتا، بہرحال اسے بے پڑھے نہ چھوڑتا پڑھتے پڑھتے ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ نفسیات ہی کے کسی موضوع پر ایک مراسلہ اس میں بھیجا۔ غالباً ۱۳ء میں جو چھپ بھی گیا۔ اور کسی نامور استاد فن، غالباً پروفیسر میک ڈوگل کا جواب بھی اس میں نکلا۔ اور خیال پڑتا ہے کہ دوسرا مراسلہ بھی اسی میں بھیجا اور وہ بھی چھپا۔

ندوہ کا بورڈنگ اس وقت پُل جھاؤلال کی ایک بڑی عمارت میں تھا، اور میں قیصر باغ میں رہتا تھا۔ چار پانچ فرلانگ کا یہ فاصلہ ایک روز میں طے کرتا اپنی عربی کے لئے اور ایک روز وہ طے کرتے اپنی انگریزی کے لئے۔ غرض اس طرح جوں توں عربی کی منزل پار ہوگئی ——— کسے خبر تھی کہ عربی کے اس شُد بُد جاننے والے سے حکیم مطلق اپنے کلام بلاغت نظام کی خدمت لے کر رہے گا؟

تھرڈ ایر بھر یعنی جولائی ۱۹۱۰ء سے اپریل ۱۹۱۱ء تک قیام کیننگ کالج کے بادشاہ باغ ہوسٹل میں رہا۔ کالج اب قیصر باغ سے اُٹھ آیا تھا اور بادشاہ باغ میں خود کالج کی عمارت ابھی مکمل ہو نہیں پائی تھی، اس لئے ہوسٹل کے قریب ہی کی ایک دوسری عمارت "اسکول آف آرٹس" میں کالج کے کلاس لگتے رہے۔ ہوسٹل کی زندگی کا یہ پہلا تجربہ، زندگی بھر میں ہوا، بھائی صاحب اب ملازمت (نائب تحصیل داری) میں داخل ہو کر باہر جا چکے تھے، اور لکھنؤ میں طالب علمی کے لئے میں تنہا رہ گیا تھا۔ ہوسٹل اس وقت ایک ہی تھا اور بعد کو صوبہ کے گورنر کے نام پر ہیوٹ (HEWET) ہوسٹل کہلایا۔ وسط میں ایک بہت بڑی بارک اور شمال وجنوب دونوں رخوں پر چھوٹی بارکیں، تینوں دو منزلہ جنوبی بارک مسلمانوں کے لئے مخصوص، اس کی نچلی منزل میں شروع کا ایک کمرہ مجھے ملا، گھر میں جن آسائشوں کا خوگر تھا، وہ یہاں کہاں نصیب۔ پاخانہ کمرے سے اچھا خاصہ دور، اور غسل خانہ تو اور دُور۔ کھانے کے کمرے تک جانے کے لئے خاصی مسافت طے کرنا پڑتی ——— نوجوانی کے سن نے یہ زحمتیں کچھ زحمتیں معلوم ہی نہ ہونے دیں، اور ایک تعلیمی سال کی مُدت ہنسی خوشی کٹ گئی۔ اس سن میں خاصہ خشک اور اکل کھرا

ملنے جاتا۔ شاد جاتا اور نہال ہو کر واپس آتا۔ جی یہی دعا کرنے کو چاہتا ہے کہ اللہ میاں نے ان کا انجام بخیر کیا ہو ــــــ ایک اور مہربان استاد مسٹر سی، جے براؤن تھے، یہ خالص انگریز تھے، اور انگریزی ادب کا کلاس لیتے۔

فلسفہ اور پھر ملحدانہ فلسفہ کی ہماہمی اور گھما گھمی میں عربی غریب دب کر کچل کر رہ گئی، اب نہ اس کے لئے وقت ملتا، اور نہ مذہبیت کے ختم ہو جانے کے بعد اب اس کی تحصیل کا کوئی داعیہ و مُحرک ہی کب باقی رہ گیا تھا۔

پھر اُستاد جو پہلے ملے، وزیر گنج کے مولوی محمد صادق صاحب، وہ تو بہت خوب تھے، شوق اور محنت دونوں سے پڑھاتے، لیکن ان کی قائم مقامی ختم ہونے پر مستقل سابقہ جن استاد صاحب سے پڑا، وہ باوجود اچھی استعداد کے، شوق کام سے زیادہ باتوں کا رکھتے تھے، اور غالب کی ہجو ان کا محبوب موضوع تھا۔ ہم لوگ یہی باتیں چھیڑ دیتے، اور گھنٹہ یوں ہی ختم ہو جاتا، غرض ان سب کا نزلہ بچاری عربی پر گرا۔ بی اے کا کورس اچھا خاصہ اونچا تھا۔ نثر میں انتخابات ابن خلدون، مقامات حریری و مقامات بدیع وغیرہ کے تھے، اور حصۂ نظم میں کلام تنبی اور ابو تمام وغیرہ کا شامل تھا۔ اگر سمجھ کر اور جی لگا کر پڑھ لیتا تو چھوٹا موٹا ادیب عربی کا بن سکتا تھا، لیکن پڑھتا جب تو۔ خیر اور امتحانوں میں تو لشتم پشتم نکل گیا۔ فکر سالانہ امتحان کے وقت پیدا ہوئی۔ اگر کہیں ایک مضمون میں بھی رہ گیا تو بڑی کرکری ہوگی۔ ایک ندوی طالب علم مولوی عبد الباری سے جو اب ۱۹۶۷ء میں مولانا شاہ عبد الباری ہیں، پرانی دوستی تھی بے تکلفی و یگانگت کی حد تک پہنچی ہوئی اور اتفاق سے وہ نئے نئے انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے تھے، بس ان سے باہمی شاگردی کی ٹھہر گئی، ان سے کہا کہ آپ میرا عربی کورس نکلوا دیجئے اور میں آپ کی انگریزی دیکھ لیا کرونگا۔

لائبریریوں سے استفادہ کے علاوہ اپنی بہت ہی محدود بساط کے مطابق، خود بھی سائیکالوجی اور منطق پر کتابیں منگاتا رہا (اس وقت تک کتابوں کی یہ گرانی کہاں تھی)، فلسفہ کی دوسری شاخوں کا مطالعہ بھی جاری تھا۔ اور چوں کہ عقائد پر الحاد غالب آتا جارہا تھا، کتابیں بھی قدرتًہ ان ہی کی زیادہ پڑھتا جو مُلحد یا نیم مُلحد ہوتے اور گوا فلاطون ارسطو، سُقراط، ڈیکارٹ وغیرہ سے بھی کبھی بے نیاز نہیں رہا، لیکن اصل شغف بیکن (BECAN) ہیوم (HUME) لاک (LOCKE) مِل (MILL) ہیکل (HAEKAL) اسپنسر (SPENSER) ہکسلی (HUXLEY) ڈارون (DARWIN) وغیرہ سے تھا۔ مِل کو اس کثرت سے پڑھا تھا کہ اس کے ٹکڑے حفظ ہو گئے تھے، اور عقیدت اس سے عشق کے درجہ کو پہنچ گئی تھی۔ غیر ملحد بلکہ صریح مذہبی ماہرین نفسیات میں ایک ولیم جیمس (WILLIUM JAMES) سے البتہ بہت ہی جی لگا۔ اس کی کتاب ٹکسٹ بک آف سائیکالوجی تو کورس میں داخل تھی۔ اس کی اور بھی کتابیں پڑھ ڈالیں؛ اور اس کی ضخیم دو جلدوں والی پرنسپلز، آف سائیکالوجی کو تو خرید کر رکھا ــــــ کالج کے اندر ہی نہیں، کالج کے باہر بھی شہرت میری فلسفیت اور الحاد دونوں کی ہو گئی۔

فلسفہ و نفسیات کے استاد ایک شریف، فرض شناس، اور مذہبی خیال کے انسان مسٹر ام، پی کیمرن (CAMERAN) تھے، انگریز نہیں، بلکہ اسکاچ تھے، بعد کو ڈاکٹری اعزازی ڈگری سے سرفراز ہوئے۔ اور لکھنؤ یونیورسٹی بن جانے پر اس کے وائس چانسلر بھی رہے۔ جنرل انگلش اور شکسپیر کے گھنٹے انھیں کے ہوتے تھے، خوش خلق تھے، اور پڑھانے کے فن کے ماہر، مجھ سے برابر خوش رہے، اور میں تو جیسے ان پر فدا تھا۔ مسیحیوں کے فرقۂ میتھوڈسٹ سے تعلق رکھتے تھے، کبھی کبھی ان کی کوٹھی پر بھی ان سے

تھا۔ بہت کم ساتھیوں سے پینگ بڑھے، اور ہوسٹل کی ہر وقت کی دھما چوکڑی لیے تو بالکل ہی الگ رہا۔ ہر کمرہ ایک ہی ایک لڑکے کے لئے تھا، میرے کمرے سے متصل کمرہ محمد حفیظ سید کا تھا۔ سن میں مجھ سے کئی سال بڑے لیکن پڑھائی میں صرف ایک سال آگے تھے، ضلع غازی پور کے دیہات کے رہنے والے تھے اور پیدائشی شیعہ، لیکن شیعیت کے ساتھ اسلام کو بھی خیرباد کہہ چکے تھے، اور بڑے چکر لگانے کے بعد اب تھیاسوفسٹ تھے، اور ہندو علوم اور ہندو تصوف و فلسفہ کے گرویدہ (سننے میں آیا کہ کچھ دن آریہ سماجی بھی رہ چکے تھے) پینگ انھیں ایک سے بڑھے، قدر مشترک قید اسلام سے رہائی تھی، فرق اتنا تھا کہ میں محض ملحد یا منکر تھا، اور وہ بچارے آدھے بلکہ تین چوتھائی ہندو تھے، میرے بڑے ہمدرد و غم گسار ثابت ہوئے، ایک مرتبہ مجھے بڑا تیز بخار آیا، خدمت و تیمار داری بالکل عزیزوں کی سی کی۔ مزید حالات دوستوں کے تحت ملیں گے ——— ایک اور دوست اسی ہوسٹل میں سید باقر حسین پیدا ہوئے، خوش اور خوش پوش، پٹنہ کے رہنے والے اور وہاں کے مشہور بیرسٹر سر سلطان احمد کے چھوٹے بھائی، وہ یہاں علی گڑھ سے آئے تھے، اور علی گڑھ ہی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے، انگریزی تحریر و تقریر میں برق، کالج چھوڑنے کے کچھ ہی دن بعد بچارے مرحوم ہو گئے ——— ضلع اُناؤ کے جگت موہن لال روان بھی اسی ہوسٹل میں تھے، آگے چل کر علاوہ اپنے ضلع کے ایک بڑے وکیل ہونے کے اُردو کے بھی معروف شاعر ثابت ہوئے۔

اپنی "عقلیت الحاد" و تفلسف کے باوجود سوشل حیثیت سے مسلمان اب بھی بدستور رہا۔ وضع و لباس، کھانا پینا، رہنا سہنا، بالکل مسلمانوں کا سا، اور ملنا جلنا سب

مسلمانوں ہی کے ساتھ دین اسلام چھوڑ دیا تھا، لیکن اسلامی تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت نہ چھوڑ سکا۔ اور اسلام سے ارتداد کے باوجود کسی دوسرے مذہب یا اس کے عقائد سے لگاؤ ذرا نہ پیدا ہوا، بلکہ ملت اسلامی کے شعائر (مثلاً گوشت خوری) کی تو تقریر و تحریر میں حمایت ہی کرتا رہا ـــــــ ایک لطیفہ بھی اسی سلسلہ میں پیش آیا۔ غالباً اکتوبر ۱۹۱۱ء کا زمانہ تھا، لکھنؤ میں، پادریوں کی ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد ہوئی، بڑی بڑی دُور کے مبلغ اور مشنری اس میں جمع ہوئے۔ انھیں میں مشہور مناظر ڈاکٹر زویمر (ZUEMER) کتاب "اسلام" کے مصنف بھی تشریف لائے، یہ انگریزی ہی کی طرح عربی پر بھی قادر تھے۔ مشاہیر علم و فضل سے ملنے کے شوق کے ماتحت ان سے بھی ملنے گیا۔ اور اپنے رفیق مولوی عبدالباری ندوی کو ہمراہ لیتا گیا۔ بات چیت شروع ہوئی، اور پادری صاحب نے زور و شور سے اسلام پر اینڈے بینڈے اعتراضات شروع کئے۔ ندوی صاحب تو خیر عربی میں جواب دیتے ہی، یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ میں بھی اسلام کی نصرت و حمایت میں برابر انگریزی میں جواب دیتا رہا ـــــــ عقلی تعلق تمام تر منقطع ہو جانے کے بعد جذباتی تعلق اسلام سے قائم رہا ـــــــ "دین اسلام" کی غیرت و حمیت کا تو خیر کہنا ہی کیا، لیکن مسلم قومیت کی غیرت و عصبیت بھی ایسی چیز نہیں کہ اس کی ہنسی اُڑائی جائے۔

ایک روز اتفاق سے بھائی صاحب اپنی ملازمت سے مجھ سے ملنے وارد ہوگئے، سہ پہر کا وقت تھا، باتوں میں رات ہوگئی، اب سواری وہاں کہاں ملتی (اس وقت ہوسٹل کے اردگرد کوئی آبادی نہ تھی)، ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ صاحب

ایک تند خو انگریز تھے، میں اجازت مانگنے گیا کہ رات کو انھیں یہیں رہنے دیا جائے، نہ مانا، اب بڑی مشکل پڑی، اتنی رات میں کہاں جائیں، بڑی ردّ و کد کے بعد آخر جب میں نے کہا کہ وہ بھی ایک ذمہ دار سرکاری افسر، اسسٹنٹ تحصیل دار ہیں، جب جا کر صاحب بہادر نرم پڑے۔

باب (۱۶)

کالجی زندگی نمبر (۴)

اوپر والد صاحب کے حالات کے ذیل میں گزر چکا ہے کہ وہ نومبر ۱۹۱۰ء میں سیتاپور سے لکھنؤ منتقل ہو آئے۔ تعلقہ گڑھی بھلول کے نائب ہو کر، اب ۱۹۷۶ء میں کوئی کیا بتائے کہ ۱۹۱۰ء کے تعلقہ دار، اور تعلق داری کیا چیز تھی! خیر پنشن ملا کر اب آمدنی پانچسو ماہوار کی از سرِ نو قائم ہو گئی۔ اور یہ یاد داشت پھر تازہ کر لیجئے کہ اس وقت کے پانچسو آج کے ساڑھے چار ہزار کے برابر ہوتے۔ اور مکان، سواری چپراسی وغیرہ نقد مشاہرہ کے علاوہ! کبھی کبھی دیہات بھی چلے جاتے، ورنہ مستقل قیام لکھنؤ میں۔ چند مہینہ کے قیام مشک گنج کے بعد مکان بھی اب قیصر باغ میں مل گیا۔ چودھری نصرت علی کا وسیع و آرام دہ مکان، اور والدہ، ہمشیرہ، بھاوج، نوکر چاکر وغیرہ سب اس میں آرام سے رہنے لگے۔ میں بھی کچھ روز بعد ہوسٹل سے اُٹھ کر یہیں آگیا۔ اب سائیکل میرے پاس تھی، کالج آنے جانے میں کوئی دقت نہ تھی، معیشت میں خوش حالی کا دَور دَورہ آگیا تھا۔ کالج بھی اب اپنی مستقل عمارت میں آگیا تھا۔ اور میں بھی اب بی اے فائنل میں تھا ــــــ گرمیوں میں کالج ڈھائی مہینہ کے لئے بند ہوا، صرف لائبریری کھلتی تھی، ہفتہ میں فلاں فلاں دن صبح کے وقت، کوئی اور آئے یا نہ آئے میرا پہنچ جانا ضروری تھا۔

سنہ ؁ تھا کہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا نیا ایڈیشن (گیارہواں) ۳۵ ضخیم جلدوں میں لائبریری میں آگیا۔ دیکھنے کا اشتیاق اس درجہ غالب تھا کہ نیند آنا مشکل ہوگئی۔ خدا خدا کرکے زیارت لائبریری میں ہوئی، لیکن لائبریری کے گھنٹے محدود، یہاں شوق نامحدود، اتنے سے تسکین کیا ہوتی۔ جوئندہ یابندہ۔ آخر خبر ملی کہ کالج کے فلاں ہندو طالب علم، مجھ سے ایک سال جونیر، رئیس اور رئیس زادے نے اپنے ہاں منگالی ہے، شوق کے پیروں سے دوڑ کر نہیں، شوق کے پروں سے اڑ کر ان کے ہاں ناخواندہ مہمان بن کر پہنچا، اور اپنا تعارف اپنی زبان سے کرایا۔ وہ بچارے ایسے بھلا مانس نکلے کہ بلاتکلف اس کی اجازت دے دی کہ ایک ایک جلد لے جایئے اور گھر پر اطمینان سے پڑھئے —— اس دن کی خوشی بیان میں نہیں آسکتی جب پہلی جلد گھر پر لایا ہوں۔ باریک، نفیس انڈیا پیپر پر تھی بیٹھ کر اور لیٹ کر کبھی میز پر رکھ کر اور کبھی ہاتھ میں لے کر، ہر طرح اور ہر ڈھب سے پڑھنا شروع کر دی۔ کتاب کیا ملی، دولت ہفت اقلیم ہاتھ آگئی۔ اسے زیادہ مبالغہ نہ سمجھئے شاید پہلے کہیں کہہ آیا ہوں کہ کتابوں سے ایک نسبت تعبدی قائم ہوگئی تھی۔ بس چلتا تو انھیں کلیجہ سے لگاتا، چومتا، چاٹتا، ان کی پوجا کرتا!

آنکھیں خراب پہلے ہی سے تھیں اور نزدیک بینی کی علت میں عینک اسکول ہی سے لگانا شروع کر دی تھی۔ کالج میں آکر پڑھنے کا ہوکا اور بڑھ گیا۔ اور بے احتیاطیاں بھی اسی نسبت سے بڑھتی گئیں، دھیمی اور دھندلی روشنی میں پڑھنا، چت لیٹے ہوئے پڑھنا، تیز روشنی آنکھ پر پڑتی ہوئی میں پڑھنا، اس قسم کی ساری ہی بدپرہیزیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بصارت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ پھر نہ جسمانی ورزش کا التزام، نہ کھانے کے اوقات و نوعیت کا کوئی نظم و انتظام، نہ اور قواعد صحت کا اہتمام، صحت قدرۃً

خراب ہی رہنے لگی۔ کہیں زکام کہیں قبض، اور کہیں گلے میں خراش، یہ معمولات میں داخل ہوگیا۔ دانتوں کی صفائی کی طرف سے الگ بے توجہی ہوتی، پرہیز نہ تیز برف سے کیا نہ کھولتی ہوئی چائے سے ——— مسواک اور وضو کا کیا ذکر، کلی بھی پوری طرح نہ کرتا دانت توجوانی ہی میں ایسے ہو گئے جیسے ادھیڑ سن میں ہونے تھے۔ یہ سب تفصیل اسلئے لکھ دیتا ہوں کہ شاید کوئی نوجوان اس سے سبق حاصل کریں، آنکھ، دانت، معدہ، سب ہی اللہ کی بڑی نعمتیں ہیں، ان میں سے ہر نعمت بے بدل، اور نعمت کی قدر، نعمت کے زوال کے بعد ہی ہوتی ہے۔ دوا علاج میں بے شک بڑا اثر ہے، لیکن جو نقصان اعضائے جسم کو مسلسل بے احتیاطیوں، بے پروائیوں، بدپرہیزیوں سے پہنچ جاتا ہے، اس کی تلافی بہتر سے بہتر علاج سے بھی ممکن نہیں۔

کالج اور ہوسٹل کے رفیقوں، شفیقوں میں سے دو ایک کے نام اوپر آچکے ہیں، ان میں سے ڈاکٹر محمد حفیظ سید صاحب بعد کو بھی میرے اوپر خاص کرم فرماتے رہے اور باوجود بار بار کی رنجشوں اور تلخیوں کے میرے بہت سے کاموں میں شریک و معین رہے۔ دسمبر ۱۹۶۶ء میں وفات پائی۔ ایک اور خصوصی مخلص صاحبزادہ ظفر حسین خان مرادآبادی تھے، لکھنؤ میں بھی قرابتیں رکھتے تھے، کلاس میں مجھ سے ایک سال جونیر تھے، بڑے اچھے مقرر تھے، اور لکھنے والے بھی خاصے، فلسفہ اور تعلیمات اور انگریزی ادب کے رسیا۔ انسپکٹر آف اسکول کے عہدے سے پنشن لی، خان بہادر ہوتے، شیعہ کالج لکھنؤ کے پرنسپل رہے، شیعہ بس برائے نام تھے، عملاً سنی ہی، وفات غالباً ۶۰ء میں پائی اور مجھے بڑا رنج دے گئے۔ دو سال مجھ سے سنیر انور علی فاروقی گوپامئوی تھے، بڑے پختہ مسلمان

ایم، اے، ایل ایل بی کر کے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے، جوانی ہی میں وفات پائی، غالباً ۱۹۲۲ء میں
خان بہادر سید کلب عباس جنھوں نے بعد کو ایڈوکیٹ، اور شیعہ کانفرنس کے سکریٹری دونوں
حیثیتوں سے نام پیدا کیا۔ یہ بھی میرے کالج کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ جوش تقریر میں
اس وقت بھی ممتاز تھے[۱] جواں مرگ متین الدین ردولوی، جو آگے چل کر لکھنؤ میں
فوجداری کے نامی وکیل ہوئے۔ اور بڑے گاؤں کے احسان الرحمٰن قدوائی بیرسٹر بھی
کالج کے خصوصی ساتھیوں میں تھے۔ ساتھیوں کے یہ چند نام اس وقت بے تکلف یاد
پڑ گئے۔ ورنہ کتنے ساتھی اس وقت شیر و شکر تھے، اور اب ان کے نام یاد کرنے سے
بھی یاد نہیں پڑتے، کون اس وقت کہہ سکتا تھا کہ چند ہی سال کے الٹ پلٹ میں یہ
ایسے نسیاً منسیا ہو جائیں گے!

کالج سے باہر بھی بہت سے بزرگوں، کرم فرماؤں سے تعلقات کی بنیاد اسی کالجی
دور میں پڑی، اور ان میں سے بعض کی شفقت و دستگیری عمر بھر کام آئی۔ سب کے
نام درج کرنے کہاں ممکن ہیں۔ ہاں کوئی بیس نام جو اہم ترین ہیں، اور اس وقت یاد
بھی پڑ گئے درج ذیل ہیں۔

(۱) مولانا شبلی، کہنا چاہیے کہ میری تحریری، تصنیفی زندگی کی جان مولانا شبلی ہی تھے،
عقیدت مندا سکول ہی کے زمانے سے ان کی کتابیں اور مضامین پڑھ کر ہو چکا تھا۔ کالج
کے زمانے میں ان کے ہاں حاضری کثرت سے دیتا رہا۔ اور اخیر میں تو ان کے ہاں کے
حاضر باشوں میں ہو گیا تھا۔ جو علمی و ادبی فیض ان کی صحبت سے حاصل رہا، اس کا اب

---

[۱] ان کا بھی انتقال مولانا کی وفات سے کچھ قبل ہو گیا۔ (عبدالقوی)

اندازہ کرنا ہی مشکل ہے۔ نومبر ۱۹۲۶ء میں وفات پائی، اور اس سے کوئی ایک سال قبل لکھنؤ چھوڑ دیا تھا۔

(۲) مولانا ابوالکلام آزاد۔ تعارف ان سے مولانا شبلی ہی کے ساتھ ہوا اور جب تک مولانا شبلی لکھنؤ میں رہے، یہ انھیں کے ہاں آکر مقیم ہوتے رہے، باوجود بعض تحریری بے لطفیوں کے ان سے نیاز بڑھتا ہی رہا۔

(۳) مولوی عبدالحلیم شرر مشہور ناول نگار، ادیب و مورخ، بہت دن کٹرہ بزن بیگ خان میں رہے تھے، وہاں تک رسائی تو بہت کم ہی ہو پاتی تھی، البتہ اور مختلف تقریبوں میں ملاقات اکثر ہو جاتی۔

(۴) مرزا محمد ہادی مرزا در سوا، عالم و شاعر و ناول نگار۔

(۵) پنڈت بشن نرائن در صدر کانگریس ۱۹۱۱ء انگریزی کے ادیب و مفکر، اردو کے شاعر و ناقد

(۶) بابو گنگا پرشاد ورما، اپنے زمانے کے با اثر و نامور کانگریسی لیڈر۔

(۷) پنڈت برج نرائن چکبست، شاعر و ناقد۔

(۸) حامد علی خاں، بیرسٹر، ادیب و شاعر۔

(۹) مولانا سید سلیمان ندوی، رفتہ رفتہ عزیزوں کے حکم میں داخل ہو گئے۔ علمی اعتبار سے میرے مکرم و محترم۔

(۱۰) راجہ اور بعد کو مہاراجہ سر علی محمد خاں، والی محمود آباد، میرے مالی محسن، والد مرحوم کے مخلص و معتقد۔

(۱۱) مہدی حسن (صاحب "افادات مہدی") ادیب و انشا پردازی میں کر

خصوصی مخلص۔

(۱۲) حاجی ظفر الملک، ایڈیٹر النّاظر۔

(۱۳) مولانا شاہ عبد الباری فرنگی محلی، ممتاز علما میں تھے۔

(۱۴) حضرت اکبر الہ آبادی، نامور شاعر و مفکّر۔

(۱۵) مولوی عبد السلام ندوی صاحب شعر الہند۔

(۱۶) مولوی مسعود علی ندوی۔ منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ۔

(۱۷) جوان مرگ شیخ ولایت علی قدوائی بمبوق۔

(۱۸) چودھری محمد علی ردولوی۔ ظریف و ادیب، صاحب طرز انشا پرداز۔

(۱۹) مولوی عزیز مرزا، پنشنر ہوم سکریٹری دولت آصفیہ، سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ۔

(۲۰) مولوی سید محفوظ علی بدایونی۔ ادیب و ظریف۔

کالج ہی میں تھا کہ ایک مختصر علمی مجلس میری صدارت میں قائم ہوئی۔ معیار اونچا تھا۔ موضوع کوئی فلسفیانہ ہوتا۔ ہر ہفتہ کوئی مقالہ پڑھا جاتا اور کچھ دیر اس پر مذاکرہ رہتا۔ ممبر کُل پانچ تھے، دو کالج کے ساتھی اور دو ندوی۔ ان میں ایک نیا نام مولوی محمد شبلی اعظم گڑھی کا تھا۔ جو ندوہ کے متعلم تھے، ندوہ والوں سے تعلقات اس زمانے میں گہرے ہو گئے تھے ـــــ کالج ہی کے زمانے میں دار العلوم ندوہ کی جدید اور موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد صوبہ کے انگریز لفٹنٹ گورنر نے رکھا۔ شاندار جلسہ ہوا، اور مولانا شبلی نے اپنی نظم دلآویز لحن میں سنائی۔ ۱۹۱۲ء میں ندوہ کا ایک دھوم دھام کا جلسہ سید رشید رضا مصری کی صدارت میں ہوا۔

۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کا غلغلہ بلند ہوا، لکھنؤ اس کا اصل مرکز تھا، اس کی فاؤنڈیشن کمیٹی کے صدر راجہ صاحب محمود آباد یہیں رہتے تھے، اس لئے اس کے چھوٹے بڑے اجلاس بھی زیادہ تر یہیں ہوتے تھے۔ بڑے بڑے معرکے کے جلسے یہیں دیکھے۔ دسمبر ۱۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں بہ طور ڈیلی گیٹ شریک رہا۔ مسوری اور علی گڑھ کے سفر اسی کالجی دَور میں ہوتے۔ ۱۱ء کی گرمیوں میں چودھری شفیق الزماں حکیم عبدالحبیب کو لے کر مسوری گئے، اور ان کے ساتھ مجھے بھی لے گئے۔ پہاڑ پہلی بار دیکھا۔ اسی سال ہمشیرہ کے ساتھ اگلاس ضلع علی گڑھ گیا۔ ان کے شوہر ڈاکٹر محمد سلیم صاحب وہیں تعینات تھے، واپسی میں علی گڑھ، ڈیڑھ دو دن ٹھہرتا اور کالج دیکھتا آیا۔ دو صاحبوں کی ملاقات سے بڑا متاثر آیا۔ ایک ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سندیلوی (ریٹائرڈ پروفیسر عربی الہ آباد یونیورسٹی)، جو اس وقت یہاں ایم اے کے طالب علم تھے۔ اور دوسرے ڈاکٹر سید ظفرالحسن مرحوم جو اس وقت ایم اے کر چکے تھے، بعد کو جرمنی سے آ کر وہاں مدتوں فلسفہ کے پروفیسر رہے اور علم و فضل کے ساتھ دینداری میں بھی قابل رشک حد تک ترقی کر گئے تھے

باب (۱۷)

کالجی زندگی نمبر (۵)

بی اے کا امتحان اپریل ۲۱ء میں ہوا، امتحان کے لئے الہ آباد جانا پڑتا تھا۔ گیا، اور قیام اپنے عزیز قریب بھائی احمد کریم کے ہاں رکھا، اس وقت بیرسٹر تھے، اور اسٹیشن سے قریب ہی خسرو باغ میں رہتے تھے، ہفتہ عشرہ رہنا ہوا، سائیکل ساتھ لیتا گیا تھا، اسی پر امتحان گاہ جاتا آتا تھا۔ فاصلہ ۲۔ ۲½ میل سے کیا کم ہوگا۔ صبح سویرے جاتا تھا، دوپہر کے قبل واپس آجاتا تھا۔ اسی دوران قیام میں حاضری حضرت اکبر کے ہاں بھی رہی۔ کلام پر فریفتہ پہلے ہی سے تھا۔ شخصی نیاز اب حاصل ہوا۔ سراپا لطف و کرم پایا۔ بات بات میں ایک بات پیدا کرنے، خود کم ہنستے، دوسروں کو اپنے کلام سے خوب ہنساتے ـــــــ نتیجہ جون میں آیا، سکنڈ ڈویژن پاس تھا۔ دل نے کہا کہ فلسفہ اور جنرل انگلش میں نمبر اول درجہ کے آئے ہوں گے، اسپیشل انگلش میں دوسرے کے، عربی میں تیسرے کے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اب فکر آگے پڑھنے کی ہوئی اور ایم اے فلسفہ میں کرنے کی۔ لکھنؤ میں اس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ صوبہ بھر میں اس وقت ایم اے میں فلاسفی صرف دو جگہ تھی۔ بنارس کے کوئنس کالج میں اور علی گڑھ میں۔ بنارس میں پڑھانے والے نامور تھے۔ اور بنارس قریب بھی تھا۔ لیکن دوسری سہولتیں قیام وغیرہ کی علی گڑھ ہی میں معلوم ہوئیں۔ اور آخری رائے

دہیں کی قائم کی، گو علی گڑھ کے لڑکوں کی شہرہ عالم شوخی و شرارت سے اپنی شرمیلی طبیعت گھبرا بھی رہی تھی۔ گزشتہ سال علی گڑھ میں عبدالستار صدیقی اور ڈاکٹر ظفرالحسن سے مل بھی آیا تھا (یہ ذکرابھی کچھ قبل آچکا ہے) اور یہ تاثر لے کر آیا تھا کہ علی گڑھ کے زمین و آسمان ہی لکھنؤ سے مختلف ہیں، یہاں کے مسلمات وہاں کے مشتبہات میں داخل اور وہاں کے محکمات یہاں کے متشابہات میں شامل۔ بہرحال علی گڑھ جا کر پڑھنا مقدر ہو چکا تھا۔

علی گڑھ کا تعلیمی سال اس وقت تک بجائے جولائی کے اکتوبر سے شروع ہوتا تھا۔ اس لئے ڈھائی تین مہینے کا وقفہ اور مل گیا۔ والد ماجد اسی اکتوبر کے شروع میں حج کو روانہ ہو رہے تھے، انھیں پہنچانے بھائی صاحب کے ہمراہ بمبئی گیا، اور واپس آکر علی گڑھ روانہ ہو گیا۔ زندگی میں یہ پہلا اتفاق، والدین سے جدا ہو کر، وطن و جوار وطن سے دور، پردیس میں رہنے کے ارادہ سے جانے کا تھا۔ سفر اس سے قبل بے شک مسوری اور بمبئی کا کر چکا تھا۔ لیکن ان کی نوعیت اس سے بالکل الگ تھی، قافلہ کا ساتھ، اپنے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں، اونچے درجہ کا ٹکٹ، اور پھر مدت سفر چند روزہ، اور مقصد سفر تفریح یا مشایعت، علی گڑھ کا سفر، ہر پہلو اور ہر اعتبار سے ان سے الگ تھا۔ فکروں اور ذمہ داریوں کا ایک انبار سر پر ——— سن اب ۲۰ سال کا تھا، لیکن کتابی دنیا سے گویا پہلی بار قدم عملی زندگی میں رکھ رہا تھا۔ "بھنورے میں پلا ہوا" یہ فقرہ کتابوں میں کہیں پڑھا تھا۔ وہ اپنے اوپر حرف بہ حرف صادق تھا بجز پڑھنے لکھنے کے، نہ کسی چیز کا تجربہ، نہ اٹکل، نہ سلیقہ، ہر چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی ایک پہاڑ معلوم ہو رہی تھی، ہر قدم پر ملازم کا محتاج، اور خدمت گار کا سہارا ڈھونڈنے والا نہ اپنا بستر بچھانا آتا تھا، نہ اپنے ہاتھ

سے لالٹین جلا پاتا! چلا اور بسم اللہ ہی غلط کی، پہلی بات تو یہی کہ ایک خدمت گار ساتھ لے کر چلا، گویا طالب علمی کے بجائے کسی عہدہ یا منصب کا چارج لینے جا رہا تھا۔ وہی عادت جو شروع سے نیم رئیسانہ زندگی کے چونچلوں کی پڑی ہوئی تھی۔ بغیر خدمت گار کے سفر ممکن ہی کیوں کر ہے، یہی سمجھ میں نہیں آرہا تھا ——— پھر علی گڑھ اسٹیشن سے سیدھا کالج جانے کے بجائے، سول لین میں ایک رئیس کی خالی اور سنسان کوٹھی میں جا کر اترا، رئیس خود کہیں دیہات میں رہتے تھے، اور یہ کوٹھی ان کی نیم ویران سی پڑی تھی۔ ایک عزیز قریب نے تعارف نامہ ان کے نام بھیج دیا تھا۔ اور ان رئیس بچارے نے بڑی خوشی سے وہاں اترنے کی اجازت دے دی تھی۔ مکان دار نے جو کمرہ دکھلایا، وہ خاصہ بوسیدہ اور خستہ تھا، اور برسات جو ابھی ختم ہوئی تھی، اس سے برسات زدہ بھی تھا۔ پھر کالج کی عمارت بھی کچھ ایسی خراب نہ تھی۔ جن خدمت گار صاحب کو ساتھ لے گیا تھا، وہ مجھ سے بڑھ کر بدحواس خیر جوں توں، حیران و پریشان، کالج کے صحن میں پہنچا تو ایک دنیا ہی دوسری نظر آئی، وہ ہجوم، وہ طلبہ کے ٹھٹ کے ٹھٹ، کہ الامان، آنکھیں وحشت سے، اور اس سے بھی بڑھ کر دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں! طالب علم ہوں گے تو بس سیکڑوں ہی کی تعداد میں لیکن اپنی سراسیمگی کو اس وقت ہزاروں نظر آتے! ہر ایک کے ہاتھ میں نامۂ اعمال کی طرح داخلہ کا فارم، نفسی نفسی کا عالم، ہر ایک اپنے حال میں گرفتار، داخلہ کا دن ایک نمونۂ رستخیز! کھانے پینے کا ہوش کسے تھا، دوپہر ڈھل گئی اور میں ادھر سے ادھر مارا مارا پھرتا رہا!

کالج میں انگریز پرنسپل مسٹر ٹول (TOULE) ایک ضابطہ پرست حاکم کی شخصیت رکھتے تھے، فارم پر منظوری کرانے کے لئے آخر میں انھیں کا سامنا کرنا پڑتا تھا

حاضری ہوئی اور معاً پھٹکار اس پر پڑی کہ کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے کیوں ہیں۔ دفتر کے ہیڈ کلرک بابو رفیع احمد خاں شاہ جہاں پوری بڑے ذی رسوخ اور صاحب تدبیر تھے بہر حال مشکل کسی طرح حل ہوئی، اور فارم پر دستخط ہو گئے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ کالج اور ہوسٹل کے کل مطالبوں کے لئے روپیہ کچھ کم پڑ رہا ہے، بدحواس ہو کر لکھنؤ بھائی صاحب کو تار دیا کہ اتنا روپیہ تار پر بھیج دیجئے۔ خیر روپیہ تو وہ بھیجتے ہی۔ یہ انھوں نے بہت اچھا کیا کہ فارم پر پتا کالج کے مشہور استاد ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کا لکھ دیا ـــــــ ہوسٹل میں جگہ پانے کا مرحلہ کالج کے داخلہ سے بھی سخت تھا۔ گریجویٹ طلبہ کے لئے ہوسٹل اس وقت دو ایک مخصوص تھے۔ اور عام ہوسٹلوں سے بہت فاصلہ پر۔ خوب یاد ہے کہ جب ایک پراکٹر صاحب کے پاس پہنچا تو یہ صاحب دوسروں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے، اجنبیت محض کے باوجود فرط اخلاق سے مجھے بھی کھانے کی دعوت دی، ادھر بھوک بھی خوب تھی، اور چاول کے ساتھ آلو کا تازہ سالن دیکھ کر طبیعت اور بھی للچا اٹھی تھی لیکن شرمیلاپن ہر چیز پر تھا۔ اور دستر خوان پر جا بیٹھنے کی ہمت کہاں سے لاتا۔ جواب میں مری آواز سے معذرت کر دی۔ ان بچارے نے پوچھا کہ داخلہ کس درجہ میں ہوا ہے، جواب میں عرض کیا کہ "ففتھ ایرمیں" وہ یہی سمجھے کہ "فرسٹ ایرمیں"۔ قصور ان کی سماعت کا نہ تھا، حلق تک تو خشک ہو رہا تھا، جواب ثابت و سالم ان کے کان تک کیوں کر پہنچتا ـــــــ

پرووسٹ صاحب کا نام محمد فاروق ایم اے تھا۔ گورکھپور کے رہنے والے ایم اے ریاضیات میں تھے، اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے شاگرد رشید۔ دیوانہ گورکھپوری تخلص کرتے تھے، اور شعر و ادب میں بھی برق تھے۔ دو سال بعد ان سے دلی میں دوستی پیدا ہوئی اور خوب پینگ بڑھے۔

خیر کن مشکلوں سے یہ منزل بھی طے ہوئی اور رہنے کو جگہ ایک نیم ویرانے میں ملی۔ یہ ہوسٹل ایک بنگلہ میں تھا (A-K-KBANGALOW) اے، کے، کے بنگلہ) کہلاتا تھا۔ کوئی صاحب عبدالقادر خاں نامی تھے، ان کے نام پر اور جس رقبہ تک کالج کی آبادی اس وقت تک تھی، اس سے بہت دور تھا۔ اسی سال گریجویٹوں کے ہوسٹل کے لئے کرایہ پر لے لیا گیا تھا۔ کالج کے باورچی خانہ سے کھانا وہاں تک پہنچتے پہنچتے بالکل ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔

مردم بیزار عمر کے اس حصے میں اچھا خاصہ تھا اور تنہائی خدا سے چاہتا تھا خدا کا لفظ محض محاورۂ زبان کی لپیٹ میں آگیا، ورنہ اس وقت خدا کا قائل ہی کہاں تھا) اور یہ مقصد یہاں بڑی حد تک حاصل تھا۔ ہوسٹلوں کی عام چہل پہل اور دھما چوکڑی کیا معنی، معمولی چلت پھرت بھی یہاں نہ تھی۔ اور نہ کسی دوکان یا بازار کا ہنگامہ، رہنے والے طلبہ کل ۱۶، ۲۰ کی تعداد میں، سب گریجویٹ اور بعض داڑھی والے بھی۔

ہر کمرے میں دو دو، چار چار پلنگ، میرے حصہ میں بنگلہ کا غسل خانہ آیا۔ اور آیا کیا معنی، میں نے اپنی پسند سے اسے لیا، کہ بنگلہ کا سب سے بعد کا کمرہ یہی ہے، اور بلا شرکت غیرے میرے قبضہ میں رہے گا، لڑکوں میں خوب چرچا اور مضحکہ رہا کہ "یہ نئے فلسفی صاحب کون وارد ہوتے ہیں، جو بجائے کمرے کے غسل خانہ میں مقیم ہیں" ——

پہلی ہی چھٹی میں لکھنؤ آیا اور اپنے ان خدمت گار صاحب شعبان علی مرحوم (متوفی ۱۹۶۲ء کو لکھنؤ میں چھوڑ گیا اور ابکی ان کے بجائے ایک کم عمر چھوکرے محب علی نامی کو ساتھ لایا۔ اس کی سوتیلی ماں نے میری رضاعت کی تھی اور اس طرح یہ میرا سوتیلا رضاعی بھائی ہوا۔ زندگی کے اس دور میں بھلا ان رشتوں کی کیا قدر، اور ان کی کیا خبر تھی - حق رفاقت پوری دیانت اور اخلاص کے ساتھ ادا کر کے اور میرے ساتھ ۱۹۲۹ء میں حج

کر کے، ان حاجی محب علی ھنے ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔

علی گڑھ لڑکوں کا جی لگ جانے کے لئے مشہور ہے، لڑکے اس کے پیچھے اپنے وطن تک بھول جاتے ہیں! اپنا حال اس کے برعکس ہی رہا۔ ایک تو یوں ہی اکل کھرا، اور پھر لکھنؤ اپنی جاذبیت کے لئے مشہور ہی ہے، جب تک یہاں رہا، دل برابر لکھنؤ میں اٹکا رہا۔ ڈاک کی راہ ہر روز دیکھتا رہا۔ بریلی والی گاڑی اسی ہوسٹل کے سامنے سے گزرتی، اسے حسرت و ارمان کے ساتھ آتے جاتے دیکھتا رہتا۔ کہ یہ لکھنؤ کی طرف جاتی اور اس کی طرف سے آتی ہے! ــــــ اس زمانہ تک لکھنؤ کے لئے بجائے کان پور کے بریلی ہی کا راستہ عام تھا۔

دسمبر کے اخیر عشرے میں بڑے دن کی چھٹیوں میں لکھنؤ آیا ہوا تھا کہ مکہ معظمہ سے والد ماجد کے انتقال کی اطلاع دفعتہً ملی۔ ڈاک اس وقت جہاز سے یہاں ایک مہینے میں آتی تھی، یک بیک یہ خبر ملنے سے جو کچھ گزری وہ تو گزری ہی، یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ میری مالی حالت اسی وقت سقیم ہوگئی۔ پنشن کی آمدنی بند ہی ہوگئی۔ اب فکر یہ کھڑی کہ میری پڑھائی کیوں کر جاری رہ سکے گی۔ بھائی صاحب کی اول تو تنخواہ ہی کیا، اور پھر ان کی نائب تحصیل داری بھی مستقل نہیں، آج قائم مقامی مل گئی، اور کل پھر خالی۔ سارا سہارا والد مرحوم کی ہی آمدنی کا تھا ــــــ خیر شروع جنوری میں علی گڑھ آگیا اور یہاں سے ایک موثر اور مفصل خط راجہ صاحب محمود آباد کو لکھا۔ والد مرحوم جب حج کو جا رہے تھے تو میرا ہاتھ ان ہی کے ہاتھ میں دے گئے تھے، راجہ نے اپنی شرافت کا پورا ثبوت دیا، بھائی صاحب لکھنؤ میں جب ان سے ملنے گئے تو میری پڑھائی کا ماہانہ خرچ دریافت کیا، انھوں نے کہا کہ ۴۰ روپیہ ماہوار اور ۱۲ مہینے کے لئے، گویا کل ۴۸۰۔ بولے کہ نہیں ماہانہ بجائے

۴۰ کے ۵۰ رکھو اور مدت بھی بجائے ۱۲ مہینے کے ۱۶، کل ۸۰۰ اور اس کے بعد یہ رقم میرے نام لکھنؤ کے ایک بینک میں جمع کرادی! شرافت اور حسن سلوک کی ایسی مثالیں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان راجہ صاحب محمود آباد کو تو آپ نے پہچان لیا ہوگا۔ بعد کو مہاراجہ ہوئے، سر علی محمد خان، والیٔ محمود آباد جو سرکاری اور علمی حلقوں میں بہت پیش پیش رہے۔

علی گڑھ میں فلاسفی کی تعلیم ضابطہ سے تھی ضرور، لیکن استاد مسٹر اکٹرلونی اب کیا بتایا جائے کہ کیسے تھے، بہرحال استاد تھے، اور ہر شاگرد کے لئے قابل عزت۔ بچارے نے کچھ ہی روز بعد کسی دماغی الجھن کا شکار ہو کر خودکشی کرلی۔ کلاس اپنے گھر پر لیتے، وہ بھی بجائے دن کے شروع رات میں۔ کورس کی کتابوں میں سے ایک پرچہ کے LOGIS کی کتاب سرے سے دستیاب ہی نہ ہوئی! ساتھی تین اور تھے، ان سے بھی کچھ پینگ نہ بڑھے، سب سے الگ تھلگ سا رہا کیا۔ کالج میں ایک فلاسوفیکل سوسائٹی بھی تھی، اس میں ایک بار تقریر کے لئے کھڑا ہو گیا۔ موضوع تھا حیات بعد الموت، ولیم جیمس کے کتابچہ IMMORTALITY کو خوب پڑھ کر اور تیار ہو کر گیا تھا، مگر تقریر پھسپھسی سی رہی، کچھ زیادہ چل ہی نہ سکا۔ جلسہ کی صدارت پروفیسر تیمور نے کی، غالباً احمدی (قادیانی) عقیدے کے تھے ــــــ علی گڑھ کا یونین ایک ہندگیر شہرت رکھتا تھا۔ اس کے جلسوں میں شرکت کا اتفاق شاید ایک آدھ ہی بار ہوا ہو، البتہ اس کے ریڈنگ روم میں رسالوں، اخباروں کے پھیر میں اکثر آنا جانا رہتا۔

ملنے جلنے والوں میں یہاں لے دے کر ایک تو لٹن لائبریری کے مُسن لائبریرین تھے مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب (سابق مدیر "قند پارسی") شاگرد رشید امیر مینائی

ظاہر ہے کہ سن میں مجھ سے بہت بڑے تھے، اور مزاج کے خشک بھی مشہور تھے، اس کے باوجود مجھ پر بہت مہربان رہے۔ اور دوسرے تھے سید ظفر الحسن ایم اے ابھی جرمنی جاکر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر نہیں آئے تھے لیکن ان کی فلسفہ دانی کی شہرت اب بھی تھی، ان کے ہاں اکثر حاضری بھی سہ پہر کو ایسے وقت دیتا جب وہ چائے پیتے ہوتے، تازہ گلاب جامنوں کے ساتھ۔ چائے کا شوق تو اس وقت مجھے نہ تھا، البتہ تازہ گلاب جامن کھانے میں آجاتے۔ ان دو کے علاوہ تیسرے نمبر پر کچھ ربط یونین کے نائب صدر، شیخ عبدالرحیم بی اے، ایک پنجابی نوجوان چھریرا جسم، ذہین چہرہ مہرہ، انگریزی کے بڑے اچھے مقرر، ال ال بی کے طالب علم تھے، بعد کو پنجاب کے ایک نامی ایڈوکیٹ ہوئے اور صدق کے سلسلہ میں مجھ سے مدتوں مخلصانہ مراسلت جاری رکھی۔

عربی زبان و ادب کے سینیر استاد اس وقت ایک جرمن فاضل و مستشرق تھے جوزف ہوروِیز، کبھی کبھی ان کے ہاں بھی حاضری رہی، بڑی شفقت سے پیش آتے، ان کے بعض سینیر شاگردوں سے کچھ جرمن زبان بھی پڑھنا شروع کیا، مگر شدبد سے آگے بڑھنے کی نوبت نہ آئی ـــــ مولوی ضیاء الحسن علوی کاکوروی ندوی تو اپنے جوار ہی کے تھے، پرائیوٹ بی اے کرنے کے بعد یہاں عربی میں ایم اے کر رہے تھے، کبھی ان سے بھی ملاقات ہو جاتی ـــــ اور ایک صاحب اپنے ہوسٹل ہی میں تھے، صورۃً مولوی صاحب ریش۔ مولوی عبدالقادر بھاگل پوری بی اے، کسی مضمون میں ایم اے کر رہے تھے، ان کا کمرہ بالکل متصل تھا۔ عقیدۃً احمدی (قادیانی) تھے۔ ان کی استعداد علمی کا ذکر خیر مولانا ابوالکلام سے لکھنؤ میں سن چکا تھا۔ مجھے بجائے کسی قسم کے کھیل میں حصہ لینے کے جب کتابوں ہی میں غرق پاتے تو کہہ اٹھتے کہ آپ کو تو کتابوں سے نسبت تعبّدی

حاصل ہے۔

اکابر علی گڑھ میں محبت و عقیدت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سے پیدا ہوئی، خوب سُرخ سفید، صورۃً انگریز تھے، فوجداری کے نامور بیرسٹر، بہت اچھے مقرر، کبھی کبھی طالب علمانہ حیثیت سے ان کے ہاں بھی حاضری دے آتا۔ ایک بار اسی دوران میں مولانا شبلی، علی گڑھ آئے اور شہر میں اپنے بھتیجے اقبال احمد ایڈوکیٹ (بعد کو سر اقبال احمد جج ہائی کورٹ الہ آباد) کے ہاں ٹھہرے۔ قدرۃً سلام کے لئے حاضر ہوا۔

باب (۱۸)

کالجی زندگی نمبر (۶)

ایم اے پریویس (سال اول) کا امتحان مارچ ۱۹۱۳ء میں ہوا، الہ آباد جانا پڑا، لکھنؤ کی طرح علی گڑھ بھی اس وقت الہ آباد یونیورسٹی ہی کے ماتحت تھا) یونیورسٹی صوبہ بھر میں بس یہی ایک تھی، اور سب جگہوں کے کالج اسی کے ماتحت۔ بھائی احمد کریم (جن کا مہمان بی اے کے امتحان کے وقت ہوا تھا) اب الہ آباد سے جا چکے تھے، اور اتنی ہمت نہ تھی کہ حضرت اکبر الہ آبادی کے ہاں مان نہ مان میں ترا مہمان بن کر جا اُترتا، ایک حفیظ سید البتہ الہ آباد میں تھے، مگر وہ ٹیچر ٹریننگ کالج کے ہوسٹل میں خود ہی ایک کمرے میں تنگی سے بسر کر رہے تھے۔ خیر ان بچارے نے میرے ٹھہرنے کا انتظام مولانا شبلی کے چھوٹے بھائی اور الہ آباد کے ممتاز ایڈوکیٹ، مولوی اسحاق نعمانی کے ہاں کرا دیا۔ جارج ٹاؤن میں رہتے تھے، شرافت مجسم تھے، خوش دلی سے اپنے ہاں رکھا، اور قیام بھر خوب خاطریں کرتے رہے —— خیر امتحان دینے کو تو دے آیا مگر کامیابی میں خاصہ شبہ رہا۔ اور اس کے کئی کئی سبب تھے، ایک تو یہی کہ کورس میرے مذاق کا نہ تھا میں عادی برطانیہ کے تجربی EMPIRICIST فلاسفر ہوم، مل، اسپنسر وغیرہ کا۔ اور کورس میں کتابیں جرمنی کے معنوی IDEALIST فلاسفہ کانٹ، ہیگل وغیرہ کی۔ دوسرے یہ کہ

استاد صاحب مجھ نافہم کے معیار سے کچھ یوں ہی سے نکلے۔ تیسرے ایک پرچہ کی کتاب SIGWARTOS LOGIC سرے سے بازار میں دست یاب ہی نہیں ہوتی تھی، چوتھے یہ کہ میں نے اس اندھیر کی شکایت میں ایک مراسلہ لیڈر (الہ آباد) میں چھپوا دیا تھا، یہ بھی وقت کے ماحول کے لحاظ سے ایک جُرم تھا۔ بہر حال اسباب جو بھی ہوں، یا محض میری نالائقی ہی سمجھی جائے، نتیجہ جب آیا تو میں فیل تھا۔ اب کیا کیا جائے! اتنی ہی پڑھائی کا انتظام کس مشکل سے ہو پایا تھا ——— رائے آخری یہی قرار پائی کہ آگے پڑھا ضرور جائے۔

اسی درمیان میں یعنی شروع جون میں ایک چھوٹا سا سفر کلکتہ کا بھی کر آیا تھا، ضرورت کوئی خاص اور ایسی نہ تھی مگر اس نوعمری کا سن، خوامخواہ سیّاحی کا شوق سر پر سوار ہو گیا چلا تو پہلے بنارس اُترا، حفیظ سید چھٹیوں میں وہیں تھے، سنٹرل ہندو کالج اور اسی کی کسی عمارت میں ایک دو دن ٹھہرا اور برابر سبزی ترکاری پر گزر کیا، گوشت کا چھوڑنا ایک وقت بھی بار ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر بھگوان داس سے ملا۔ کتابیں پڑھ کر گرویدہ ہو ہی چکا تھا۔ عجیب بزرگ تھے، فلسفی تو خیر تھے ہی، ساتھ ہی ہندو جوگ کے طریقہ کی خوب ریاضتیں کئے ہوئے، آنکھوں میں چمک، چہرہ پر ایک طرح کا نور، باتیں بڑی حقیقت سنجی کی کرتے رہے، اور میرا الحاد کسی نہ کسی حد تک ان کی روحانیت سے متاثر رہا (وجدان کبھی کبھی یہ کہتا ہے کہ اگر ان کا بھی خاتمہ ٹیگور اور مسز نائیڈو کی طرح ایمان پر ہوا ہو تو رحمت الٰہی سے کچھ بعید نہیں ہے) ——— بہر حال کلکتہ پہنچا، اور خدمت گار بھی سفر میں ساتھ ساتھ۔ پہلے ایک ہندو کلاس فیلو کے ہاں گیا، ان کا مکان بہت ہی تنگ نکلا، پھر خیال آیا کہ مولانا ابوالکلام کے ہاں چلوں، اور ان سے کسی سستے ہوٹل کو دریافت کروں، وہاں جو پہنچا تو مولانا کسی طرح نہ مانے اور زبردستی اپنا مہمان بنا لیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی بھی اس وقت وہیں الہلال میں کام کر رہے تھے، اور وقت کے ایک اچھے اہل قلم و صاحب علم مولانا عبداللہ عمادی بھی۔ اور ایک اور صاحب۔ اور میزبان نے اکرام مہمان کا پورا حق ادا کر دیا، اور شاید چار پانچ دن کے بعد میں لکھنؤ واپس آگیا۔

یہ سفر کلکتہ درمیان میں جملۂ معترضہ سا آگیا تھا، ہاں تو اب فکر وہی پڑھائی کی ہوئی علی گڑھ اب دوبارہ جانے کو جی بالکل نہ چاہا۔ آخر میں رائے دلّی کی قرار پائی۔ مسیحیوں کا سینٹ اسٹیفن کالج خاصی تعلیمی شہرت رکھتا تھا۔ پرنسپل اور استاد فلسفہ دونوں نیک نام تھے اور بڑی بات یہ کہ مشہور انگریز پادری اینڈریوز ای ایس ریٹائر ہو کر یہیں رہ رہے تھے۔ اگست ۱۳ء میں پہنچا اور یہ پہلی بار تھا کہ طالب علم نے سفر بغیر خدمت گار کو جلو میں لئے کیا اور ہوسٹل میں قیام کیا۔ کمرہ اپنی مرضی کے مطابق ملا۔ اینڈریوز صاحب کی خدمت میں حاضری دے کر جی خوش ہوا، اور اپنے استاد مسٹر شارپ سے بھی اچھا اثر قبول کیا۔ پڑھائی شروع ہوئی، اور کلاس میں حاضری دینے لگا، لیکن ابھی چند ہی روز ہوتے تھے کہ پیوپلز بنک (PEOPLES BANK) کے دیوالہ نکل جانے کی خبر آگئی ہائیں اب کیا ہوگا، والد مرحوم تھوڑی بہت جمع پونجی جو چھوڑ گئے تھے سب اسی بینک میں تھی، سو وہ یوں ٹھکانے لگ گئی۔ طبیعت ڈانواڈول ہوئی کہ اب تو دہلی میں قیام کرنے اور پڑھائی جاری رکھنے کا دروازہ ہی بند ہوگیا!

اِدھر تو یہ ہوا، اور دماغ کو راہ میں ایک بڑا روڑا اٹکتا ہوا معلوم ہوا، اُدھر قدرت الٰہی کو ایک طرفہ ماجرا منظور ہوا، دو ہی چار مہینہ قبل جذباتی زندگی کا ایک بالکل ہی نیا

دھندا شروع ہوگیا تھا!

سِن اب ۲۱ سال کا تھا، اور شادی کی بات چیت خاندان ہی میں جہاں بچپن سے لگی تھی، ادھر سے میں بالکل بے رخی اختیار کئے ہوئے اور یکسر غیر مُلتفت تھا، اور اپنی مسلّم خشک مزاجی کے ہوتے ہوئے نہ خود میرا خیال کبھی گیا، اور نہ کسی اور کا، کہ میرا التفات کسی اور کی طرف بھی کبھی ہوگا۔ مشیت الٰہی کو اسی محاذ پر مجھے شکست دینا منظور ہوئی اور دل بُری طرح ایک دوسری عزیزہ کی محبت میں مبتلا ہوگیا۔ اس کی تفصیلات تو مستقل عنوان کے ماتحت آگے آئیں گی، یہاں ربطِ بیان کے لئے بس اتنا سُن لیجئے کہ لکھنؤ سے یہ جدید دل چسپی اب میرے لکھنؤ سے باہر کہیں قیام رکھنے کی راہ میں خود ایک سنگِ گراں بن گئی! لکھنؤ سے باہر جی لگنے کی اب صورت ہی نہ تھی، اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ مل گیا۔ طبیعت کو عُذر قوی، اس بینک کے دیوالیہ ہو جانے سے ہاتھ آگیا کہ اب باہر رہنے کا خرچ کہاں سے نکل سکتا ہے۔ سلسلۂ تعلیم چھوڑ چھاڑ کر دہلی سے لکھنؤ آگیا۔ اور دل کو یوں سمجھا لیا کہ جو علمی منزلت ایم اے پاس کر کے حاصل ہوتی، وہی میں برس دو برس میں فلسفیانہ مضامین لکھ لکھ کر گھر بیٹھے حاصل کر لوں گا! —— نفس کتنا بڑا حیلہ ساز اور بہانہ باز واقع ہوا ہے! کیسی کیسی صورتیں گڑھ لیتا اور کیا کیا امکانات فرض کر لیتا ہے!

کیا انسان ضعیف البیان، اور کیا اس کے حوصلہ اور ارادے! اس کے منصوبے اور اس کے ذہنی نقشے! اگر کہیں تعلیم مکمل ہوگئی ہوتی اور فلسفہ کی ڈگری حاصل کر کے کسی کالج میں فلسفہ کا استاد ہوگیا ہوتا، تو زندگی کا رُخ آج سے کتنا مختلف ہوتا! کیا ہوتا یہ تو کون کہہ سکتا ہے! لیکن آج سے کتنا الگ ہوتا، یہ تو ہر ایک کہہ ہی سکتا ہے۔

اور یوں اپنی اصطلاحی طالب علمی کا دور ختم ہوگیا گو حقیقۃً طالب علم اب بھی ہوں، عمر کے ۵۰ ویں سال میں طالب علمی کی سطح سے ذرا بھی بلند نہیں ہوا ہوں ظاہر بین اور بہتلائے فریب دنیا، عالم، فاضل، قابل جو کچھ سمجھے، اور جس لقب سے چاہے پکارے، اپنی حقیقت تو اپنے ہی پر خوب روشن ہے، آج تک نرا طالب علم ہوں، وہ بھی اعلیٰ نہیں، ادنیٰ قسم کا اور نہ بالغ النظر اور نہ جیدّ الاستعداد کسی علم وفن میں نہیں بلکہ کچا اور ادھ کچرا علم وفن کے ہر شعبہ میں بلا استثناء۔ غرض اس طرح طالب علمی کا جو اصطلاحی و رسمی زمانہ سمجھا جاتا ہے، وہ عمر کے ۲۱ ویں سال ستمبر ۱۳ئہ میں ختم ہوگیا۔ آہ وہ زمانہ، تلخیاں وناکامیاں، مایوسیاں تو لازمۂ بشریت ہیں، ہر عمر کے ساتھ لگی ہوئی، لقد خلقنا الانسان فی کبد۔ لیکن اس کے باوجود وہ زمانہ کتنی بے فکری کتنی آزادی کتنی غیر ذمہ داری کا تھا! وہ زندگی کا ہلکا پھلکا پن کہاں سے واپس لے آیا جائے!

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت!

چار سال کے سن میں بسم اللہ ہوئی، نویں سال اسکول میں داخلہ ہوا گویا طالب علمی کی کُل عمر ایک حساب سے ۱۷ سال کی ہوئی اور ایک حساب سے ۱۲ کی!——ہائے کیا خیال اس وقت تھا کہ اب یہ دن پھر نہیں آنے کے! یا ایک ایک دن ایک ایک لمحہ ان کا کتنا قیمتی، اور کتنا قابل قدر ہے! دل تڑپ تڑپ کر رہے گا اور ذرا دنی جھلک بھی ان دنوں اور راتوں کی نصیب نہ ہوگی!

جوانی تجھ کو اب لاؤں کہاں سے!

کاش کوئی اس وقت اس موٹی سی حقیقت کا سمجھا دینے والا، سُجھا دینے والا

دل میں اُتار دینے والا مل گیا ہوتا! عارف رومیؒ نے تو ساری ہی عمر کو، عمر کے ہر دور کو ایسا ہی قیمتی بتایا ہے ؎

داد ند عمرے کہ ہر روزے ازاں
کس نداند قیمت آں در جہاں
خرج کردم عمر خود را دمبدم
در دمیدم جملہ را در زیر و بم

بار الٰہا آپ نے تو عمر کی وہ نعمت دی تھی کہ اس کے ایک ایک دن کی بھی قیمت دنیا جہاں میں کوئی لگا ہی نہیں سکتا، اے نادان کہ یہ بے بہا نعمت میں نے کس بے دردی کے ساتھ گنوا دی فضولیات کے آتش کدے میں اُسے مٹھیوں بھر بھر کر جھونک دیا۔

جو قوتیں، صلاحیتیں، جو توانائیاں اس وقت موجود تھیں کاش ان کے اقل قلیل حصّہ کی بھی قدر اس وقت ہو گئی ہوتی! ____ حسرتوں کا کوئی شمار، اضاعتوں کے انبار کی کوئی حد بھی ہے!

یک کاشکے بود کہ بہ صد جا نوشتہ ایم!

کوئی مانے یا نہ مانے، ابھی چند سال قبل تک اپنے کو خواب میں بارہا ہی طالبعلم دیکھا ہے، کبھی کچھ، کبھی کچھ، لیکن بہر صورت و حال طالب علم ہی! ____ تحت الشعور میں وہی جن کی طرح چھپا ہوا بیٹھا ہے!

آج جب اس عہد کا جائزہ حافظہ کی عینک سے لے رہا ہوں، تو اُستادوں کے ہجوم میں گنتی کی چند صورتیں بڑی ممتاز و منوّر نظر آ رہی ہیں، مسلمانوں ہی کی نہیں بعض

غیر مسلموں کی بھی۔ ان کے عقائد و اعمال ان کے ساتھ، بہرحال میرے سابقہ میں تو وہ شریف ہی ثابت ہوئے۔ ان کے نام ان اوراق میں چھوڑ جانا اپنے لئے مایۂ سعادت سمجھتا ہوں۔

(۱) مولوی حکیم محمد علی اطہر، جنھوں نے بسم اللہ کرائی۔

(۲، ۳) اسکول کے استاد عربی، مولوی سید محمد ذکی لکھنوی، اور ان سے بھی بڑھ کر مولوی عظمت اللہ فرنگی محلی۔

(۴، ۵) ماسٹر دولت رام بی اے، اور ہیڈ ماسٹر بابو گھمنڈی لال بی اے۔

(۶، ۷، ۸) کیننگ کالج کے اُستادان انگریزی پروفیسرات ٹی راے، اور سی جے براؤن، اور دونوں سے کہیں بڑھ کر استاد انگریزی و فلسفہ اور بعد کو پرنسپل ایم، بی، کیمرن۔

اللہ ان سب محسنوں کو ان کے لائق جزائے خیر دے۔ خیال دوڑاتا ہوں تو پاتا ہوں کہ نہ کسی استاد کا حق شاگردی ادا ہوا، اور نہ کسی رفیق درس کا حق رفاقت ــــ نوعمری خود ہی کیا کم خودبین و انانیت پسند ہوتی ہے، پھر جب الحاد و بے دینی اس میں شامل ہو جائے تو مستی ظاہر ہے کہ دو آتشہ سہ آتشہ کی پیدا کر دیتا ہے، جو کچھ بھی کر گزرتا تھوڑا تھا، آیا گیا خاک بھی نہیں، بس ایک نشہ بلکہ بھوت زعم و پندار ہی کا سوار رہا۔

اللہ اللہ اس دَور کا کبر و پندار، انانیت و خود پرستی! خوب یاد ہے کہ ایک بار جب بی اے کے آخری سال میں تھا اور کچھ مضمون انگریزی اور اُردو کے رسالوں میں نکل چکے تھے۔ ایک روز غسل کر رہا تھا، ادھر جسم پر پانی ڈالتا جاتا اور ادھر دل ہی دل

میں بڑبڑاتا بھی جاتا تھا کہ خاندان والے جاہل میرے علم وکمال کو کیا جانیں اور میری قدر کیا پہچانیں! استغفراللہ، استغفراللہ، صد نفریں اس رعونت پر، ہزار ملامت اس شیخی پر!

تھا زور کبھی خود بینی کا کرتے ہی کیا تھے ہم ہم کے سوا

اور اب تو زباں پر کچھ بھی نہیں رب اغفر وارحم کے سوا!

ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخسرین۔

باب (۱۹)

ازدواجی زندگی نمبر (۱)

بچپن ابھی مشکل ہی سے ختم ہوا تھا، یعنی سن کُل ۸، ۹ سال کا تھا کہ بات چیت خاندان ہی میں، اور خاندان کیا معنی، حقیقی چچازاد بہن کی ایک بہت ہی چھوٹی بچی کے ساتھ قرار پاگئی، بچپن کی نسبت کا اس وقت عام رواج تھا، اور کم سنی ہی میں بات لگ جانا ایک بڑی کامیابی اور خوش نصیبی سمجھی جاتی تھی، یہ بھی دستور تھا کہ یہ بات چیت والدین یا گھر کے بڑے بوڑھے ہی ٹھہراتے، بچپن کی رضامندی معتبر تو یوں بھی شاید نہ ہوتی، لیکن دستور اتنی بھی پوچھ پاچھ اور رضامندی لینے کا لڑکوں اور لڑکیوں سے نہ تھا، بعض گھرانوں میں رسم منگنی کی ایک شاندار تقریب بھی منائی جاتی۔ ہمارے گھر میں ایسا نہ تھا۔ یہ لڑکی سن میں مجھ سے کوئی آٹھ سال چھوٹی رہی ہوگی، اور صورت شکل کی بڑی اچھی تھی، لیکن مجھے اس سن میں شادی بیاہ کا کوئی تصور ہی نہ تھا، اس لئے اس منگنی کی خبر اُڑی پڑی اِدھر اُدھر سے کان میں تو پڑ گئی، لیکن بس اس سے آگے کوئی بات نہ ہوئی نہ کسی نے براہ راست مجھ سے کسی قسم کی پوچھ پاچھ کی ضرورت سمجھی، نہ کوئی سوال میری پسند ناپسند کا پیدا ہوا، بڑوں سے تو خیر گفتگو کا کوئی امکان ہی نہ تھا، اپنے کسی ہم نشین عزیز سے اگر میں نے کبھی کچھ کہا سنا بھی اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا بھی، تو اس نے

بھی سُنی ان سنی کردی ۔ اور بات اس قابل ہی نہ سمجھی کہ اسے کسی بڑے تک پہنچایا جائے
اسکول کا دور ختم ہوا اور میں کالج میں آگیا۔ سن بھی کوئی ۱۶، ۱۷ کا، اب کبھی کبھی شادی کا خیال آنے لگا، دل کو ٹٹولا تو کوئی کشش اس لڑکی کی بابت نہ پائی، وہ خوب صورت تھی، سلیقہ مند تھی، خوش اطوار تھی، لیکن بہرحال دیہات کے ماحول میں پرورش پا رہی تھی، اور بھولی بھالی تھی، علوم و فنون کی تعلّی اور شہر کی چلت پھرت سے کوسوں دور اور یہ مجھ فرنگیت زدہ اور سُودہ ''ریشنلسٹ'' کی نگاہ میں سَو جرموں کا ایک جُرم، سو عیبوں کا ایک عیب تھا۔

دیکھتے دیکھتے ۱۳ء آگیا، اب میں ۲۱ سال کا تھا اور بی اے کر چکا تھا، والد مرحوم کی وفات کو بھی چند ماہ ہو چکے تھے، لکھنؤ میں رہ رہا تھا کہ ایک قریبی رشتہ کے ماموں صاحب باندے سے لکھنؤ آئے، اور اپنی بہن یعنی میری والدہ کے پاس رسم تعزیت کو آئے ان کے ایک لڑکے میرے بے تکلف دوست بھی تھے، ان کے سامنے اس نسبت سے اپنی ناپسندیدگی بلکہ بیزاری کا اظہار کر چکا تھا، اور انھوں نے اپنے والد تک یہ خبر پہنچا دی تھی، انھوں نے میری والدہ ماجدہ سے اس کا تذکرہ کرایا، ان بچاری، اللہ کی نیک اور سیدھی بندی کو پہلے تو اس کا یقین ہی نہ آیا، لگی لگائی نسبت کو چھوڑ دینا اس وقت کے معاشرے میں ایک سنگین جرم تھا۔ ان بچاری کی خود بھی اس میں کتنی بدنامی تھی، آخر کو یقین کرنا ہی پڑا، اور کتنا دُکھ ان کے دل کو پہنچ کر رہا ——— مجھ اکل کھرے اور فرنگیت مآب کو والدہ ماجدہ کی نہ نازک پوزیشن کا کوئی احساس تھا نہ ان کے جذبات کی کوئی پرواہ ——— اس وقت کے میرے خیالات کی بنا پر سب کو یقین آگیا کہ میں خاندان میں شادی سرے سے کروں گا ہی نہیں، باہر سے کسی فرنگن یا نیم کرسٹان قسم کی

عورت کو بیاہ لاؤں گا۔ قیاس بجائے خود کچھ بے جا نہ تھا، لیکن قدرت کو انتظام کچھ اور ہی منظور ہوا۔

خاندان کی ایک شاخ شہر باندا (بند یلکھنڈ) میں آباد تھی، سن میں مجھ سے بہت بڑے، بلکہ میرے والد کے ہم سن لیکن رشتہ میں میرے حقیقی خالہ زاد بھائی۔ شیخ محمد یوسف الزماں رئیس شہر تھے، ان کے لڑکے بالے زیادہ تر و اکثر لکھنؤ ہی میں رہا کرتے، لڑکے کا نام مسعود الزماں تھا، سن میں مجھ سے کچھ بڑے، انٹرمیڈیٹ میں دو سال تک میرے ساتھ پڑھے ہوتے، اس وقت بیرسٹری پاس کرنے ولایت گئے ہوئے تھے۔ ان سے چھوٹی ان کی دو بہنیں تھیں، بڑی عصمت النسأ کی شادی اسی مارچ ۱۳ء میں لکھنؤ کے نوجوان بیرسٹر ڈاکٹر ناظر الدین حسن ایم اے ال ال ڈی سے ہو چکی تھی (بعد کو وہ حیدرآباد جا کر جج ہائی کورٹ اور ناظر یار جنگ ہوئے، وفات ابھی ۱۹۶۶ء میں پائی ہے) چھوٹی بہن کا نام عفت النسار تھا، اسی شادی کے اہتمام میں پانی سے بھیگ کر سخت بیمار پڑ گئیں۔ ٹانگوں میں شدید درد علاج معالجہ بہت کچھ کر ڈالا، نفع خاطر خواہ نہ ہوا —— یہ وہ زمانہ ہے کہ میں نے ہپناٹزم کا عمل اپنی سائیکالوجی دانی کی راہ سے نیا نیا سیکھا تھا اور خوب اس کی مشق پڑی ہوئی تھی، بیماروں کو منٹوں میں اچھا کر دیتا تھا۔ عزیزوں اور جاننے والوں کے محدود حلقہ میں میری مانگ خاصی رہنے لگی تھی، ایک عزیز نے میری یہ شہرت ان باندے والوں تک پہنچا دی، ایک دن دیکھتا کیا ہوں کہ ان کے ہاں کی ایک ماما، انھیں صاحبزادی کی کھلائی، میرے ہاں موجود اور یہ دردناک پیام لئے ہوئے "سنتی ہوں آپ سب کی دوا کرتے ہیں، اور میں اتنی سخت تکلیف میں

پڑی ہوئی ہوں، ایک مجھی کو نہیں پوچھتے"!

کہہ دیا کہ "اچھا آؤں گا" اور سہ پہر کو اپنے مکان واقع نئے گاؤں (موتی لال بوس روڈ) سے سائیکل پر بیٹھ، ان کے ہاں پہنچ گیا وہ لوگ قیصر باغ نمبر ۲۲ میں تھے، کوئی پانچ فرلانگ کا فاصلہ ہوگا۔ یہ لوگ قریب ہی کے عزیز تھے، میرے حقیقی خالہ زاد بھائی کا خاندان تھا، کسی سے پردہ نہ تھا، لڑکیاں سب سامنے آتی تھیں، ہم لوگوں کے ہاں برابر آمد و رفت رہتی تھی، خود اس لڑکی کا بارہا سامنا ہوچکا تھا لیکن اس وقت تک تھا اتنا جھیپو اور شرمیلا کہ کبھی نظر بھر کر دیکھا ہی نہ تھا، غرض میں پہنچا اور بکمال معصومیت کے ساتھ اس کمرے میں نیم تخلیہ کرا کے عمل ہپناٹزم (تنویم مقناطیسی) کا شروع کیا۔ ایک چمکیلا بٹن دکھا کر غنودگی طاری کر دی اور یقین دلانے والے لہجہ میں الفاظ بار بار اس طرح کے دُہراتے رہا کہ "درد گیا" "اب بالکل گیا" "اب تم اچھی ہو رہی ہو، اب بالکل اچھی ہوگئی ہو" —— ہاتھ پھرانے یا "پاس" کرنے کا کام بجائے اپنے، مریضہ کی خالہ کے ہاتھ سے لیتا جاتا تھا اور اسی لئے ان کو مریضہ کے پلنگ پر بیٹھا رہنے دیا تھا۔ اتنی احتیاط طبعی حجاب کی بِنا پر اس وقت بھی تھی، کہ جسم کے کسی حصہ کو اپنا ہاتھ نہیں لگنے دیا —— دو چار منٹ قبل کہاں تو کراہ رہی تھیں، اور کہاں اب جو آنکھ کھولی، تو درد کافور تھا۔ ہشاش بشاش مسکراتے ہوئے چہرے سے، دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنی والدہ کو پکار کر بولیں "باجی اب ہم بالکل اچھے ہیں"!

نوجوان قبول صورت لڑکی کی مسکراہٹ اور اس پُرمسرت آواز میں جادو کا اثر تھا! مریضہ کا چہرہ آناً فاناً معالج کی دل چسپی اور توجہ کا مرکز بن گیا! —— اب وہ میری مریضہ نہ تھی، اتنی ذرا سی دیر میں "کچھ اور" بن گئی تھی، اور معالج اب خشک معالج نہ رہا

خود علاج طلب مریض سا بن گیا!

شکار کرنے کو آئے شکار ہو کر چلے!

شاعری نہیں اب واقعہ تھا ــــــ کہاں تو آنے میں یہ پس و پیش، تکلف و حجاب تھا اور اب کہاں اٹھنے میں طرح طرح کی بہانہ بازیاں اور حیلہ سازیاں!

٭

خیال پہلی بار دل میں آیا کہ شادی یہیں ہو جائے، تو کیسا اچھا ہے، منہ مانگی مراد مل جائے، لیکن ہونے کیوں لگی؟ اونچا کھاتا پیتا گھر ہے بڑے لوگ ہیں، پیام اچھے اچھوں کے آئیں گے، ان کے سامنے مجھے پوچھے گا کون؟ میری آمدنی ہی کیا ہے؟ ابھی تو کماتا کچھ بھی نہیں ہوں، اور پھر پُرانی لگی ہوئی نسبت چھوڑنا آسان نہیں، برادری بھر نکو بنائے گی ــــــ دن پر دن اسی ادھیڑ بن میں گزرنے لگے، باتیں بس آپ ہی اپنے دل سے کر لیتا اور طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکا کر دل کو سمجھا لیا کرتا، کہتا بھی تو کس سے۔ آخر ڈرتے ڈرتے ایک آدھ بے تکلف عزیز کے سامنے زبان کھولی۔ جس نے یہ سنا واہ واہ کی، میرے انتخاب کی داد دی لیکن ساتھ ہی سب نے کہا کہ "تمہارا خیال ادھر گیا کیسے، تم ٹھہرے ایک خشک مزاج فلسفی، بیوی کا خیال اور وہ بھی اس زور کے ساتھ آخر پیدا کیسے ہوا؟ ــــــ دوسروں کی حیرت کیا دور کرتا، جب خود ہی نقش حیرت بنا ہوا تھا!

یہی زمانہ تھا کہ ایک صاحب جائداد بیوہ خالہ زاد بہن نے ایک بڑی وسیع حویلی احاطہ فقیر محمد خاں میں مرزا حیدر مرزا روڈ پر، قریب قبر ماموں بھانجے، ندوہ والوں سے خرید کر لی۔ پورا مدرسہ ندوہ مع کتب خانہ اور دار الاقامہ اسی عمارت میں سمایا

ہوا تھا، وسعت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے۔ یہ محترمہ لاولد بھی تھیں، بچاری نے اپنی تنہائی کے خیال سے چاہا کہ ہم لوگ بھی ان کے ہاں اُٹھ آئیں اور ان کے مکان کو آباد کر دیں۔ والدہ مرحومہ کو کیا عذر ہو سکتا تھا، لیکن میں اکل کھرے کی بنا پر اَڑ گیا اور حیلہ حوالہ کر کے ان بچاری کو مایوس کر دیا اتنے میں معلوم ہوا کہ "وہ لوگ" بھی تو اسی مکان کے ایک حصہ میں اُٹھ آنے والے ہیں، مارے خوشی کے دیوانہ سا ہو گیا، کتنا اچھا موقع بے شان وگمان "ان" کی یکجائی کا ہاتھ آ رہا تھا! اب نامنظوری کے بعد کھٹ سے منظوری دے دی، اور جب میں راضی ہو گیا، تو باقی گھر پھر تو پہلے ہی سے رضامندی پر تُلا ہوا تھا ــــــ یہ محترمہ مالک مکان، ایک طرف میری حقیقی خالہ زاد بہن اور رضاعی خالہ بھی تھیں۔ اور دوسری طرف شیخ یوسف الزماں صاحب کی حقیقی بھاوج یعنی میری محبوب لڑکی کی سگی چچی۔ گویا دونوں فریقوں کے حق میں سنگم!

ستمبر ۱۳ء تھا کہ ہم لوگ اس نئے مکان میں اُٹھ آئے، اور اس کا نام بھی خاتون منزل رکھ دیا۔ ہم لوگ سے مُراد میری والدہ، ہمشیرا ور بھاوج تھیں، بھائی صاحب اس وقت نائب تحصیل داری کی قائم مقامی کر رہے تھے، اکثر تو تعیناتی باہر ہی ہوتی، کبھی کبھی شہر لکھنؤ میں بھی ہو جاتی، میں یہیں سے ایم اے کی تعلیم حاصل کرنے دلّی گیا تھا۔ کالج زندگی کے آخری باب کو پڑھ کر حافظ تازہ کر لیجئے اور اسی مکان کے شوق و اشتیاق میں تعلیم نامکمل چھوڑ کر واپس آگیا تھا۔ ہم لوگوں کے آجانے کے چند ہی روز بعد "وہ لوگ" بھی یعنی شیخ یوسف الزماں کے اہل و عیال یہیں منتقل ہو آئے ــــــ کارساز مطلق کی کارسازی کے قربان جائیے، ہمسائگی کیسی، ہم خانگی کا سامان از خود ہو گیا! میں اپنے

دالے ہزار جتن کرتا، یہ کیسے ہو پاتا! مکان کے دونوں حصے الگ الگ سے تھے، اور سب سے بڑھ کر خود میرا طبعی شرمیلا پن راہ میں حائل، خلا ملا اور پینگ بڑھنے کی تو کوئی صورت ممکن ہی نہ تھی، تاہم جھجک اور جھیپ تو رفتہ رفتہ قدرتہً کم ہوتی ہی گئی، رات دن میں دو ایک بار آمنا سامنا ہو ہی جاتا، اور تنہائی تو خیر کبھی کیا حاصل ہوتی، دوسروں کے سامنے بھی براہ راست بات چیت کی ہمت شاذو نادر ہی کبھی ہو پاتی۔ یہ نعمت غیر مترقبہ اس وقت کیا تھوڑی تھی، کہ ایک دوسرے کی آواز اور بات چیت سُن لیتے اور ایک دوسرے کی جھلک سرسری سہی دیکھ لیتے۔ بعض دن دن میں کئی کئی بار! ـــــ یہ تھا اس وقت شریف گھرانوں میں شرم و حیا کا معیار! اور شرم و حیا بھی کسی لکیر کے فقیر کی نہیں، مجھ "روشن خیال" و "آزاد مشرب" کی! ـــــ ۶۷ء میں ۱۳ء کی یہ خود گزشت کتنوں کو مبالغہ آمیز معلوم ہو رہی ہو گی! کوئی چھ سات مہینے کے بعد فلک "تفرقہ انداز" آخر رنگ لایا اور وہ لوگ اس مکان سے ایک دوسرے محلہ دلاٹوش روڈ، گنیش گنج، منتقل ہو گئے، وہ یہاں سے کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ آمد و رفت اب ہر روز تو ممکن نہ تھی، البتہ دوسرے چوتھے، کوئی نہ کوئی بہانہ نکال، وہاں کا پھیرا کر ہی آتا تھا۔ اور ہفتہ میں دو ایک بار وہ لوگ بھی یہاں آتی جاتی تھیں ـــــ اب ۱۹۱۴ء تھا۔ اور میرا سن ۲۲ سال کا، میری کتاب فلسفہ جذبات (کہنا چاہیے کہ میری پہلی کتاب)، پریس سے باہر آ چکی تھی، اور دوسری کتاب فلسفۂ اجتماع زیر تحریر تھی، انگریزی کتاب سائیکالوجی آف لیڈرشپ کا مسودہ ٹائپ کرا کے لندن، پبلشرز (GFISHER UNWIN) کے پاس بھیج رہا تھا، اور مضمون اور مقالے، اردو اور انگریزی دونوں میں برابر نکل رہے تھے ـــــ ایک بڑا ٹیڑھا مسئلہ یہ درپیش تھا کہ بچپن کی

لگی لگائی نسبت کو چھڑایا کیسے جائے، مشرقی روایتوں میں ڈوبے ہوئے خاندانوں میں برابر رنجشیں، لڑائیاں، اسی بات پر اُٹھ کھڑی ہوا کرتی تھیں، میں نے ساری ذمہ داری، بدنامی اپنے ہی سر لے لینا چاہی، بڑوں نے ایک نہ چلنے دی، اپنے ہی سر اوڑھے رکھی، آخر میں ایک عزیز سید ممتاز احمد ہانسوی درمیان میں پڑے، طرفین میں یکساں مقبول و معتمد تھے، اور بچارے نے بڑی خوش اسلوبی سے یہ مرحلہ طے کرا دیا۔ میرے حقیقی بہنوئی ڈاکٹر محمد سلیم صاحب، جو اس لڑکی کے حقیقی ماموں تھے، انھوں نے بھی اس کارِ خیر میں نے حصہ لیا ——— بغیر اس کے نئی نسبت کے لئے خط ادھر سے جا ہی نہیں سکتا تھا۔

والدہ بچاری کو بڑی فکر بلکہ تشویش رہتی تھی، کہ خدا معلوم میں انتخاب کس کا کروں، اور پسند کر کے کس کو لاؤں، اب جب یہاں کا نام انھوں نے سنا تو جیسے ان کی جان میں جان آگئی، بڑی تسکین و تسلی انھیں ہوگئی، بلکہ دل سے خوش ہوئیں کہ یہ ہونے والی بہو ان کی حقیقی ہمشیر کی پوتی تھی، بعض اور عزیزوں کے بھی چہروں کی شکنیں دُور ہوئیں، اور ہونٹوں پر اطمینان کی مسکراہٹ آئی، میری حقیقی ہمشیر اور حقیقی بھاوج یہ دونوں پہلے ہی سے میری شریک راز بن چکی تھیں، اور یہ دونوں خاص طور پر خوش ہوئیں، میرے ہونے والے سالے، شیخ مسعود الزماں غالباً ستمبر سنہ ۱۴ء میں بیرسٹر ہو کر ولایت سے آچکے تھے، اور بات اب ان کی شادی کی بھی چل رہی تھی، نومبر سنہ ۱۴ء تھا کہ خدا خدا کر کے نسبت کا خط ہمارے ہاں سے روانہ ہوا، والد ماجد کے مرحوم ہو چکنے کے بعد قدرۃً خطاب والدہ ماجدہ کی طرف سے تھا، اور اب منظوری کے انتظار کا مرحلہ شروع ہوا، باقاعدہ پردہ اسی تاریخ سے ہو گیا۔

خود ابتدائے سے اب تک مدت ڈیڑھ سال کی گزر چکی تھی، اور اب کیا بیان ہو، کہ کس امید وبیم میں گزر رہی تھی، کبھی خوب امید پڑ جاتی، کبھی ایسی ہی مایوسی بھی چھا جاتی ، اضطراب واشتیاق، دونوں کیفیتیں ساتھ ساتھ چلتی رہتی تھیں، اب خواست گاری کا باضابطہ خط یا پیام جانے کے بعد انتظار کا دور دوبارہ شروع ہوا، منظوری اگر آتی بھی تو فوراً کیسے آجاتی۔ پیام قدرتاً لڑکی کے والد کے پاس باندے کے پتے پر گیا تھا ان کا سارے عزیزوں سے مشورہ کرنا ضروری تھا، اس میں وقت لگنا ہی تھا، چند ہفتوں کی مدت پہاڑ سی معلوم ہوئی، امید کے ساتھ ساتھ کھٹکا بھی اس لئے لگا ہوا تھا کہ اس درمیان میں دو ایک رقیب بھی ذرا زور دار، ذی اثر قسم کے پیدا ہو گئے تھے اور بعض دراندازوں نے اپنی والی رخنہ اندازی بھی شروع کر دی تھی، لیکن کامیابی بالآخر میری ہوئی۔ اور منظوری کا خط آگیا۔

شعر وشاعری کا چسکا کچھ نہ کچھ ہمیشہ ہی سے تھا۔ شبلی کے فیض صحبت نے اسے اور ہوا دی۔ غالب کے نام اور کلام پر شروع سے سر دھنتا رہا، لیکن اس زمانہ میں یعنی محبت کی ابتدا، سے اپنی کیفیات نفس کی ترجمانی سب سے زیادہ مومن اور حسرت موہانی کے کلام میں ملنے لگی اور پھر اس کے بعد عزیز لکھنوی اور مرزا ہادی رسوا کے کلام میں۔

باب (۲۰)

ازدواجی زندگی نمبر (۲)

نسبت کا خط ابھی جانے کہاں پایا تھا بلکہ ابھی اس کے مبادی ہی طے نہیں ہوئے تھے، یعنی سب سے پہلے میری والدہ وغیرہ کی منظوری، کہ ایک عجیب لطیفہ اس سلسلہ میں پیش آیا۔ فروری ۱۹۱۶ء کا ذکر ہے شیخ صاحب باندے سے آئے ہوئے تھے، اور اپنے اہل و عیال کے ہاں لاٹوش روڈ (گنیش گنج) میں مقیم تھے کہ میں شام کو قریب ان سے ملنے گیا، اور جب اُٹھ کر چلنے لگا تو انھوں نے ایک بند لفافہ انگریزی میں پتہ لکھا ہوا میرے ہاتھ میں دیا، کہ اسے گھر جا کر پڑھنا —— ایں! یہ کیا، کوئی ایسی ہی تو بات ہے کہ بجائے زبانی گفتگو کے اسے انھوں نے خط سے ظاہر کرنا چاہا، اور خط بھی انگریزی میں، اس کا مضمون ہو کیا سکتا ہے؟ کہیں میرے عشق کی بھنک تو ان کے کانوں تک نہیں پہنچ گئی، کچھ اسی کا ذکر تو اس میں نہیں! —— دل میں عجیب ایک تلاطم برپا، اضطراب کا تقاضا کہ اسی منٹ اسے کھول کر پڑھ لیا جائے، لیکن مصیبت یہ کہ روزمرہ کا معمول ہی جوان کے ساتھ اسی وقت ٹہلنے کا تھا —— واہ رے قلب انسانی کے تلوّنات و تقلبات! کہاں روز ان کی اس وقت کی رفاقت و معیت کا انتظار رہا کرتا تھا، اور کہاں آج یہی شے کھلنے لگی۔ خیر ۱۵، ۲۰ منٹ بعد ان سے پیچھا چھوٹا اور لاٹوش

روڈ سری رام روڈ کے چوراہہ پر وہ سیدھی سڑک اپنی راہ لگے، اور میں امین آباد سے اپنے مکان کی طرف مُڑا، تو اب اتنی تاب کہاں کہ انتظار گھر پہنچنے کا کیا جائے، جھٹ وہیں میونسپلٹی کے پہلے لیمپ کے سامنے خط کا لفافہ کھول اسے جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا۔ مضمون کچھ اس طرح کا نکلا "مجھے مسعود سلمہٗ کی شادی کی طرح تمہاری شادی کے مسئلہ سے بھی دل چسپی ہے، مسعود کا معاملہ تو بہر حال ولایت سے واپسی پر طے ہوگا۔ اپنے لئے اگر تم اپنے عندیہ سے مطلع کرسکو، تو شاید تمہارے کام کچھ آسکوں"۔

پڑھتے ہی یہ معلوم ہوا کہ جیسے کسی تیز نشہ سے مست ہوا جا رہا ہوں۔ شراب کبھی چکھی نہ تھی، لیکن دل نے گواہی دی کہ اس میں کچھ ایسا ہی جوش و سرور رہتا ہوگا! طبیعت فرط مسرت سے اُبلی پڑتی، اچھلی پڑتی، مچلی پڑتی تھی، کسی سے کہہ سن ڈالتا، تو شاید طبیعت ہلکی ہو جاتی، لیکن اس وقت رات میں رازدار کون ہاتھ آتا، عزیزوں، قریبوں میں اس وقت تک کسی سے ذکر آیا نہ تھا، ایک آدھ دوست البتہ خیال میں تھے، وہ بھی اس وقت کہاں ملتے، بے کلی میں نیند کیا خاک آتی، جاڑوں کی لمبی پہاڑ سی رات، صبح کسی طرح ہو تو، جب تو جواب لکھوں، لیکن نہیں، طبیعت نہ مانی، اُٹھ بیٹھا، اور رات ہی میں میز پر لیمپ کے سامنے جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ خط انگریزی میں تھا، جواب کا مسودہ بھی قدرۃً انگریزی ہی میں گھسیٹا۔ حاصل یہ تھا:-

"شفقت بزرگانہ کے لئے دل سے ممنون ہوا، مسعود میاں کا معاملہ بیشک اہم و مقدم، ان کی واپسی کے دن گن رہا ہوں، ان کے آتے ہی اپنے کو ان کے کام کے لئے وقف کردوں گا، رہا میں تو میں نے اپنے لئے ایک لڑکی کا انتخاب کرلیا ہے، وہی میری نظروں میں سمائی ہوئی ہے، لیکن

آپ کے سامنے تام عرض کرنے کی جرأت کہاں سے لاؤں، آخر مشرقی ہوں، آپ خود ہی اپنی فراست سے سمجھ جائیں تو اور بات ہے۔"

یہ لکھنے کو تو لکھ بھیجا، لیکن دل میں پھر اضطراب کا ہنگامہ، دیکھئے اس سے کیا اثر لیتے ہیں، کہیں اس سے بگڑ تو نہیں جاتے ہیں، کہیں اسے میری بے حیائی اور بدتہذیبی تو نہ سمجھ بیٹھیں گے کہ چھوٹا ہو کر اتنے بڑے اور باپ کے ہم سن بھائی کو یہ صاف اشارہ لکھ بھیجا۔ تو لیجئے، اور لینے کے دینے پڑ جائیں، اور بنا بنایا کھیل بگڑ کر رہے ـــــ ہر لمحہ اسی ادھیڑ بن، اسی الٹ پلٹ میں گزرتا رہا، تا آنکہ نامہ بر جواب لے کر واپس آگیا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے کھول کر پڑھا تو مضمون (خطاب کی بھی انگریزی ہی میں تھا) یہ نکلا:۔

"مجھے بالکل نہیں معلوم کہ تمہارا اشارہ اور خیال کس لڑکی کی جانب ہے، بہر حال اس لڑکی کی جانب تو ہے نہیں، جو میرے ذہن میں تھی، اور مجھے سروکار بس اسی سے تھا۔"

اور واقعی شیخ صاحب کے ذہن میں خاندان ہی کی ایک دوسری لڑکی تھی، رشتے میں ان کی قریبی سالی، خوب پڑھی لکھی، مگر صورت شکل میں واجبی ہی سی، تلاش اس کی نسبت کی بھی جاری تھی، اور اس کا سن بڑھتا ہی جا رہا تھا ـــــ ذہن سے اگر نکل گیا ہو تو ایک بار پھر یہ یاد تازہ کر لیجئے کہ سرگزشت کسی پیر فرتوت مولوی مولانا کی نہیں، بلکہ ۲۱ سال کی عمر کے ایک آزاد خیال "مسٹر" کی قلم بند ہو رہی ہے!

یہ تو ایک جملۂ معترضہ سا کئی مہینے قبل کا آگیا تھا، اخیر ۱۴ء میں جب باضابطہ خط خواستگاری کا والدہ ماجدہ کی طرف سے گیا، تو منظوری کی سفارش عزیزوں اور

قریبوں میں ایک ایک سے اٹھوائی، عقل کا کہنا تھا کہ منظوری ضرور ہی آئے گی، درمیانی عزیز قریب بھی سب یہی یقین دلا رہے تھے، لیکن دل کم بخت کس کے بس میں تھا، دھک دھک ہوتے جا رہا تھا، بار بار اس کا بھی تقاضا کہ فلاں سے کہلوائیے اور فلاں سے بھی، اور زور ہر طرف سے ڈلوائیے۔ ہفتوں کی مدت مہینوں برسوں کی نظر آئی ـــــ بہرحال منظوری خدا خدا کر کے آئی، اور اس دن کی مسرت کا پوچھنا ہی کیا! دل پہ قبول شخصے بلّیوں اچھل رہا تھا، اور محسوس یہ ہو رہا تھا کہ جیسے ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آگئی ہے!

بارے ہوئی قبول بڑی التجا کے بعد

حالی کا یہ مصرعہ وردِ زبان تھا۔

پردہ اسی وقت سے شروع ہو گیا، شریف گھرانوں میں دستور اس وقت تک یہی تھا کہ منگنی ہوتے ہی منگیتر سے پردہ ہو جاتا تھا، اور دستور کچھ ایسا بے جا اور بے تکا تھا بھی نہیں، سال چھ مہینہ کی علیحدگی و حجاب سے آتشِ شوق کچھ تیز تر ہی ہو جاتی ہے۔ یہ لطیفہ نہیں واقعہ بھی سُن رکھنے کا ہے، کہ لڑکی کو پہلی بار اس کا علم اس وقت ہوا کہ میں خواست گار اور دلدادہ ہوں جب نسبت والا باضابطہ خط اس کے والدین کے ہاتھ میں آیا۔

مسعود میاں، اکتوبر ۱۹۱۴ء میں بیرسٹری پاس کر کے لندن سے چلے اور لکھنؤ، محلہ گنیش گنج، لاٹوش روڈ پر آکر اترے، ماں بہن پہلے سے وہیں رہ رہی تھیں، اور دوسرے قریبی عزیزوں کے بھی مکان ملے جُلے پاس ہی پاس تھے، میری حاضری ان

کے ہاں پابندی سے ہونے لگی، دسمبر ۱۹۱۴ء میں یہ لوگ لکھنؤ سے باندے روانہ ہوئے، باندے میں ان لوگوں کا قیام تین چار مہینے رہا، لیکن اتنی طویل مدت میرے لئے کیسی صبر آزما نکلی! شاعروں نے ہجر و فراق کے جو مضمون باندھے ہیں، ان کی قدر اب جاکر ہوئی، اور شاعرانہ مبالغے عین حقیقت بن گئے! عزیزوں میں کسی کے پاس کبھی اتفاق سے کوئی خط میری منسوبہ کا آجاتا تو کس شوق اور چاؤ سے اسے حاصل کرتا، پڑھتا پڑھاتا، اور آنکھوں سے لگاتا!

شعر کے لئے طبیعت موزوں کچھ بچپن ہی سے تھی، لیکن غزل گوئی کیا، دو چار متفرق شعر کہہ لینے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا (تفریحی تک بندی کبھی کبھی کالج کے زمانے میں کرلی تھی، وہ ایک استثنار ہے) اب طبیعت لہرائی، اور پہلی بار غزل کا سودا سر میں سمایا۔ موج آئی تو دو ڈھائی سال کے عرصہ میں کوئی چودہ پندرہ غزلیں اُلٹی سیدھی تک دے تک کہہ ڈالیں۔ یوں محبوب و دل پسند شاعر ہمیشہ سے غالب رہے لیکن اس دَور میں زمین اکثر مومن و حسرت کی لیتا اور کبھی اکبر و عزیز لکھنوی کی۔

یہ مہمل کلام کچھ تو لکھنؤ کے ماہ نامہ الناظر میں نکلا اور کچھ مولانا سید سلیمان کی ہمت افزائی سے ان کے ماہ نامہ معارف میں جسارت کر کے حضرت اکبر کی خدمت میں اصلاح کے لئے بھیج دیا تھا۔ تخلص بھی ناظر رکھ لیا تھا۔ ایک ڈراما زود پشیماں کے نام سے بھی اُس دَور کی یادگار ہے بعض معاصر شاعروں میں حسرت موہانی اس وقت امام یا آئیڈیل بنے ہوئے تھے۔

گھر بھر میں خشک مشہور تھا، اور یہ شہرت کچھ بے جا نہ تھی۔ شناساؤں کے وسیع حلقہ میں بے تکلف بس دو ہی چار تھے، تفریحوں سے کوئی دل چسپی ہی نہ تھی، تفریحات

میں بہت ہی کم شریک ہوتا، خشکی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار دسمبر ۱۳ء میں آگرہ جانا ہوا (محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں) اور رہنا بھی کوئی چار دن ہوا، لیکن آگرہ جا کر بھی تاج محل کو نہ دیکھا۔ ہنسی دل لگی بھی بہت ہی کم کسی سے کرتا۔ یہ خشکی کچھ تو خلقی اور طبعی تھی۔ اور کچھ مِل کے سے خشک فلسفی کے چاٹ جانے سے اور بڑھ گئی تھی، بھابیوں، بھاوجوں کے مجمع میں ہوتا تو بجائے ان سے ہنسنے بولنے کے الٹا اور چپ ہو جاتا ——— عشق کی تازہ کرامت یہ دیکھنے میں آئی کہ یہ خشکی کافور ہو کر اب طبیعت روز بروز رنگینی کی طرف مائل ہونے لگی، فلاں ناول اور افسانے اور فلاں شاعر کے کلام میں اب خوب جی لگنے لگا۔

اپریل ۱۵ء شروع ہوا، اور کتنی آرزوؤں، تمناؤں کے بعد باندے سے قافلہ اب لکھنؤ واپس آگیا تھا۔ دل نے کہا کہ چلو، اب شادی کی تاریخ وارِیخ مقرر ہو جائیگی۔ عزیزوں نے بھی اطمینان دلایا۔ قدرت کا کھیل کون جان سکتا تھا، مئی کی شروع کی کوئی تاریخ تھی کہ مسعود میاں کا تار دفعتہً باندے سے آیا کہ والد ماجد آج صبح انتقال کر گئے؛ کچھ نہ پوچھئے کہ اپنے حق میں یہ خبر کیسی صاعقہ اثر نکلی۔ خیر وہ قافلہ تو روتا پیٹتا، پہلی ٹرین سے باندے روانہ ہوا ہی، اور اب کی میں بھی بہ رسم تعزیت بعض دوسرے عزیزوں کی طرح اسی ٹرین سے چلا۔ خود تو رونا کیا آتا، دل اس وقت پتھر کا تھا، ہاں ہمدردی ان سب لوگوں کو اس مصیبت میں دیکھ کر البتہ گہری پیدا ہو گئی تھی، اور اپنی محرومی کا خیال کر کے ہمدردی رنج وغم میں تبدیل ہو گئی تھی، خود غرضی کے معنی بھی یہی تھے، باندے کے سفر کا یہ پہلا اتفاق تھا، لکھنؤ سے گاڑی سہ پہر کو چلی، کان پور میں دیر تک ٹھہرنے کے بعد

دوسری گاڑی ملی، جو باندے ایک بجے رات کو پہنچاتی تھی، راستہ میں کسی کسی اسٹیشن پر اتر کران لوگوں کے ڈبے کے قریب جاتا، اور رونے پیٹنے کی دل خراش آوازیں سُن آتا، ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ تازہ بیوہ کو اپنی بیوگی کا علم اس وقت تک نہیں ہونے پایا تھا، شوہر کی وفات کے بجائے صرف ان کی شدید علالت کی خبر انھیں دی گئی تھی بیوگی کی اطلاع اگر انھیں لکھنؤ میں دے دی جاتی تو عدّت کے لئے یہیں قیام ان پر لازم آجاتا، کھُل کر نوحہ و ماتم صرف لڑکیاں ہی کر رہی تھیں ــــــ دہریت اور لامذہبی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے ؟ تعزیت و اظہار ہمدردی کے لئے بے تاب تو ہو رہا تھا لیکن اپنے عقیدۂ انکار آخرت کے ساتھ، اس کے لئے الفاظ آخر کہاں سے لاتا، غمزدوں کی تسلّی و اطمینان کے لئے آخر کون سا پیرایۂ بیان اختیار کرتا ؟

باندے قیام ایک ہفتہ رہا، اندر بھی آنا جانا ہوتا رہتا، پردہ ضابطہ سے تو پورا پورا تھا، لیکن چوری چھپے سامنا کبھی کبھی ہو ہی جاتا، اشتیاق اِدھر سے تو ظاہر ہی تھا، اجتناب اُدھر سے بھی کامل نہ تھا، ۱۵ء کا اخیر تھا کہ وہ لوگ پھر لکھنؤ آگئے، اور اب تاریخ عقد کی بات چیت شروع ہوئی۔ فروری یا مارچ ۱۶ء تھا کہ قریب کے دو عزیزوں کا تھوڑے ہی فصل سے انتقال ہوا اور اس نے تاریخ عقد میں ذرا اور کھنڈت ڈال دی۔ اپنا مستقل ذریعۂ معاش اس وقت کچھ بھی نہ تھا۔ ۱۵ء میں کئی جگہوں کے لئے ہاتھ پیر مارے، مہاراجہ محمود آباد وغیرہ کی اونچی اونچی سفارشیں بھی بہم پہنچ گئیں، نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ہاں تصنیف و تالیف و ترجمہ کا کام کچھ نہ کچھ چل نکلا تھا، اور تھوڑی بہت آمدنی اسی راستے سے ہونے لگی تھی، اللہ مغفرت کرے بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق کی، اس وقت انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری تھے، اور مستقر اورنگ آباد تھا

بچارے اجرت پر کام دیتے دلاتے رہتے، اور اس وقت اتنی آمدنی ایک بڑی نعمت تھی، گھر کا خرچ ہم تینوں بھائیوں کی مشترک آمدنی سے لشتم پشتم چلے جا رہا تھا، دو بھائی ہم تھے ہی، تیسرے چچازاد بھائی اور بہنوئی ڈاکٹر محمد سلیم بھی حقیقی بھائی ہی کے حکم میں داخل تھے۔

باب (۲۱)

ازدواجی زندگی نمبر (۳)

سنہ ۱۶ء کی بھی سہ ماہی ختم ہوئی، اور تاریخ عقد کی گفتگو چل رہی تھی، طرح طرح کے جھمیلے اور ایک کے بعد ایک مرحلہ پیش آرہا تھا۔ ان جزئیات سے آج کسی کو کیا دلچسپی، اس وقت وہی بڑے اہم تھے، مسعود میاں کا عقد میرے ساتھ ہی طے پا رہا تھا، اس لئے سُبیتا دوہرا دوہرا کرنا تھا۔

اس زمانہ میں خوب ٹھاٹھ سے رہنا سیکھ لیا تھا، شام کو اب جب ان کے ہاں جانا ہوتا، گھر سے بن ٹھن کر نکلتا، انگریزی سُوٹ کا معمول ہو گیا تھا، اور کبھی کبھی شام والی انگریزی ٹوپی (فیلٹ ہیٹ، سبز رنگ والی میں داس زمانہ میں وہی داخل فیشن تھی)۔۔۔۔۔ آج یہ باتیں جتنی بھی پھیکی نظر آئیں سنہ ۱۹۱۶ء میں یہ جرأت رندانہ کا نمونہ تھیں (شریف گھرانوں میں ان کا کر گزرنا ہر ایک کا کام نہ تھا، ایک نشہ کی سی کیفیت چوبیسوں گھنٹے سوار رہتی تھی۔ سنہ ۱۳ء میں آغاز محبت کے وقت عمر کا ۲۱ واں سال تھا اور اب شادی کے وقت ۲۴ واں سال۔

مارچ گزرا، اپریل ختم ہوا، اور اب وہ لوگ اسی تقریب کی غرض سے ایک

دوسرے مکان میں اٹھ آئے تھے، یہ کوٹھی ہیوٹ روڈ پر تھی، اور یوسف منزل کے نام سے موسوم تھی، شروع مئی میں کہیں جاکر تاریخ مقرر ہوئی۔ ۲ر جون، وقت شام تاریخ کا تعین ہونا تھا کہ دن گنے شروع ہو گئے، مجازاً اور استعارۃً نہیں، لفظاً و واقعۃً اُدھر صبح کو آنکھ کھلی کہ ادھر بجائے مسلمان کی طرح کلمہ پڑھنے کے زبان پر کس مسرت سے یہ فقرہ آجاتا کہ آج سے ایک دن اور کم رہ گیا! —— والدہ ماجدہ وغیرہ ڈھائی تین ہفتے قبل لکھنؤ سے دریاباد منتقل ہو آئیں کہ بارات یہیں سے سج سجا کر روانہ ہو، دو روز قبل میں بھی دریاباد آگیا، اور یکم جون کی شام کو ۱۰، ۱۲ بزرگوں، عزیزوں کی بارات ساتھ لئے لکھنؤ پہنچا، انتظامات سب بڑے بھائیوں کے ہاتھوں میں تھے، اور مصارف بھی تقریباً سارے انھیں نے اٹھا لئے، میرے پاس تھا ہی کیا، برائے نام کچھ تھوڑی بہت شرکت میں نے بھی کر لی۔ خیر بارات حسب توقع خوب دھوم دھام سے اتاری گئی۔ دوسرے روز جمعہ تھا، نو بجے صبح عقد مسعود میاں کا ہوا، ۹ بجے شب میں میرا، لکھنؤ کے بہت سے مہمان شریک ہوئے، راجہ صاحب محمود آباد، جسٹس کرامت حسین، آنریبل شیخ شاہد حسین قدوائی بیرسٹر، مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہم۔ تقریب عالی شان تو خیر کسی معنی میں نہ تھی، لیکن ایسی بھی نہ تھی کہ بالکل سادہ کہی جائے، کھانے کی دعوت، عقد سے قبل خاصی زور دار رہی، پلاؤ کی فرمائش ہر طرف سے ہو رہی تھی، نکاح فرنگی محل کے مولوی محمد اسلم صاحب نے پڑھایا، میری لامذہبی کے پیش نظر بعض عزیزوں نے چاہا کہ ایجاب و قبول سے پہلے مجھ سے کلمہ شہادت پڑھوا کر تجدید ایمان کرالی جائے، بڑی خیر گزری کہ نکاح خوان نے اس کی ضرورت نہ سمجھی، ان کا فرمانا تھا کہ جب کسی نے اپنا نکاح مسلمانوں کے طریق پر پڑھوانا

چاہا، تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اسلام کا قائل ہے، اب محواہ مخواہ بدگمانی کر کے اس کی چھان بین کیوں کرائی جائے۔ اس طرح یہ بات ٹل گئی اور میں ایک بڑی آزمائش سے بچ گیا ـــــــ مہر کی رقم اب کچھ نہ پوچھیے کہ کیا تھی، میرے لکھنے سے بھی شاید کسی کسی کو یقین نہ آئے، ہزاروں کی نہیں لاکھوں کی ٹھہری!! اور لاکھوں بھی چاندی کے روپے (زر سفید) نہیں سونے کی اشرفیاں (زر سُرخ) اس وقت خاندانی بڑائی ہم شریفوں میں یہی سمجھی جاتی تھی کہ رقم مہر کی تعداد بس ایک فرضی و افسانوی حیثیت رکھے، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو، جسٹس کرامت حسین مرحوم ایک ثقہ بزرگ میری مسند سے متصل بیٹھے تھے، وہ بچارے "ارے، ارے، یہ کیا غضب ہے" کہتے ہی رہ گئے، سب نے ان کی بات سُنی ان سُنی کر دی، اور میں نے دل ہی دل میں "نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز" پڑھتے ہوئے اسے کھٹ سے منظور کر لیا ـــــــ مہر کی شرعی اہمیت کسی درجہ میں بھی دل میں تھی ہی کب؟

جمعہ، ۲؍ جون ۱۹۱۶ء۔ آج سے بڑھ کر مسرت کا دن زندگی بھر میں یاد نہیں پڑتا، ایک نشہ سا سوار تھا، خوشی سے اُچھلا اُبلا پڑتا تھا، کوئی فاتح بڑے سے بڑا ملک بھی فتح کر کے اس سے زیادہ نازاں و مسرور کیا ہوگا، جتنا میں آج تھا! شہر کے مشہور شاعر مرزا محمد ہادی عزیزؔ نے سہرے کے طور پر ایک طویل نظم کہہ ڈالی، جو بعد کو ماہنامہ الناظر میں چھپی، ایک مصرعہ میں تلمیح میری کتاب فلسفہ جذبات کی جانب تھی ع

کردے حسن رخ سے زندہ فلسفہ جذبات کا

اور مقطع یہ تھا ـــ

گل فشانی کا عزیز اب دل میں کب تک ولولہ

لڑ نہ جائے اس کے سہرے سے سخن کا سلسلہ

حضرت سلیمان ندوی نے پہلے جب مجھے دیکھا کہ سر پر ریشمی زرق برق صافہ کے ساتھ فاتحانہ انداز میں محفل عقد کی طرف جا رہا ہوں تو کہا کہ "غازی محمود سومنات فتح کرنے چلا ہے"۔ اور پھر تین رباعیاں بھی ارشاد فرمائیں (اس وقت تک وہ کھل کر شاعری کے میدان میں نہیں آئے تھے) ان میں سے ایک یاد رہ گئی ؎

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد

نوشاہ بنے ہیں آج عبدالماجد

وہ روز سعید بھی خدا لائے جلد

بن جائیں وہ جب کسی کے والد ماجد

مہمانوں کے رخصت ہوتے ہوتے رات اچھی خاصی بیت چکی، جون کی رات ہوتی کتنی ہے، باراتیوں اور مہمانوں کے ساتھ میں بھی باہر ہی سویا۔

شہر کا ایک اونچا ہوٹل اس وقت رسول اینڈ ملٹری ہوٹل تھا مولانا ابوالکلام مظہر الحق بیرسٹر وغیرہ اس میں ٹھہرا کرتے، گری پڑی حالت میں برلنگٹن ہوٹل کے نام سے اب بھی زندہ ہے صبح بریک فاسٹ (ناشتہ) کی دعوت اس میں اپنے مخصوص علمی دوستوں اور بزرگوں کو اس میں میں نے اپنی طرف سے دی۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحلیم شرر، جسٹس سید کرامت حسین، سید سجاد حیدر "یلدرم"، مولوی ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر وغیرہ، تقریریں ہوئیں گروپ فوٹو لیا گیا بارات دریاباد واپس ہوئی، ۱۰ بجے کی ٹرین سے، ہم دولھا دلھن ۱۱ بجے موٹر سے چلے۔

موٹر ۱۶ء میں لکھنؤ میں ایک نئی سی چیز تھی۔ راجہ صاحب محمود آباد نے بہ کمال عنایت اپنے خاصہ کا موٹر عنایت کر دیا تھا۔ دلھن کی رخصتی کا منظر ہر جگہ موثر ہی ہوتا ہے یہاں بھی تھا، میں البتہ مسرت کے نشہ میں اس سے غیر متاثر رہا۔ پُرلطف ترین سفر کی داستان مُسرت بیان کرنے پر قلم قادر کہاں ہے! ـــــ جون چلچلاتی دوپہر، دو گھنٹہ کا سفر، بند موٹر میں سر سے پیر تک پسینہ میں شرابور، لُو کے تھپیڑے، ان حالات میں بھی تکلیف کا احساس ایک ذرا سا نہیں، جسم کا رویاں رویاں جوش مسرت سے مست!

سُسرال والوں کے بھرے مجمع میں میری اتنی مجال کہاں تھی کہ موٹر کے اندر دُلھن کے پہلو میں بیٹھ جاتا، باہر شوفر ہی کے پاس جگہ مل جانے کو غنیمت سمجھا، لذتوں، حلاوتوں، لطافتوں کی مصوری، قلم اگر آج کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا۔

موٹر کا انجن ٹھنڈا کرنے کو بارہ بنکی رکنا ناگزیر تھا، خیر دو گھنٹے کی مدت بات کہتے گزر گئی، اور کوئی ایک بجے دریاباد پہنچ گئے۔ کھانا وانا ہوا، جہیز کا سامان شام کی ریل سے آیا ڈھیروں اتنا کہ گھر والوں کیا معنی، بستی والوں کی بھی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں گھر کا وسیع صحن سامان سے اَٹ گیا۔ مہمانوں کا ہجوم اندر باہر ہر طرف تھا، مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ خصوصی احباب اسی شام کو ریل سے آئے، مہمانداری کا ہنگامہ رات گئے تک رہا ـــــ ریت رسمیں ہمارے ہاں زیادہ نہ تھیں، پھر بھی کچھ نہ کچھ تو بہرحال ہوئیں ایک ذرا انوکھی سی رسم، ہمارے مولوی خاندان میں اس وقت یہ تھی کہ خلوت سے قبل، دولھا سے دو رکعت نماز دُلھن کی پشواز پر پڑھوائی جاتی تھی (شاید اس سے مقصود دلھن کی پاک دامنی کی شہادت دینا ہو)، مجھ سے بھی یہ فرمایش ہوئی، اور

میں نے نماز کی نقل، بہنوں، بھاوجوں کے اس مجمع میں بے تکلف کرڈالی!۔۔۔۔
اس وقت عالم وہ طاری تھا کہ کوئی فرمایش اس سے بھی سخت تر کردی جاتی تو بے
چون وچرا اس کی تعمیل کرگزرتا!

باب (۲۲)

ازدواجی زندگی نمبر (۴)

جون کی رات ہوتی ہی کے گھنٹوں کی، پھر جب کہ آدھی کے قریب ریت رسموں ہی میں گزر چکی ہو۔

کٹی رات حرف وحکایات میں
سحر ہوگئی بات کی بات میں

صبح ہوتے آنکھ لگ گئی، پلک جھپک گئی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ جب دلھن کی پالکی اسٹیشن پہنچی تو جس گاڑی سے جانا طے ہوا تھا، وہ چھوٹ چکی تھی ـــــ احباب خصوصی سب صبح رخصت ہوگئے تھے، ایک مولوی عبدالباری ندوی (جو اب ماشاءاللہ مولانا شاہ عبدالباری مجاز حضرت تھانوی ہیں) رہے، اسٹیشن پر میرا حق رفاقت ادا کرتے رہے اور دوپہر کی گاڑی سے چلتے چلاتے ہم لوگ واپس پہونچے۔ اور یہ پہلی "چوتھی" تھی۔

جون کا سارا مہینہ ٹھیٹھ ہندوستانی قسم کے "ہنی مون" میں گزرا، چوتھی چالوں کا چکر چلتا رہا، قدم آج گھر میں ہے، تو کل سسرال میں۔ لیکن قیام زیادہ تر ہر حال میں لکھنؤ ہی میں رہا۔ البتہ بجائے اپنے مکان خاتون منزل کے، اپنی عارضی سسرال یوسف منزل ہیوٹ روڈ میں (اس کا ذکر ایک آدھ باب قبل آچکا ہے) نئے داماد کی خاطرداریوں

کا پوچھنا ہی کیا، اور پھر یہ سسرال تو خاصی خوش حال بھی تھی۔ ایک عامیانہ کہاوت میں دن عید، رات شب برات —— بے فکری پن اور غفلت کی نیند کی عمر ہی کتنی! بات کہتے پورا مہینہ گزر گیا۔

ادھر یہ ہوا کہ میری انگریزی کتاب سائیکالوجی آف لیڈرشپ لندن میں ایک مشہور پبلشر کے ہاں چھپ گئی تھی، اور اُسے دیکھ علی گڑھ کانفرنس کے کرتا دھرتا صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مجھ پر بڑے مہربان ہو گئے اور کانفرنس میں بہ طور لٹریری اسسٹنٹ کے مجھے لے لیا، طے یہ شروع مئی میں ہو گیا تھا، باقی اجازت میں نے جون بھر کی لے لی تھی، اور جب یکم جولائی کو علی گڑھ پہنچ جانا تھا پہنچا، اور چارج لے لیا، لیکن نئی اور پھر اس درجہ محبوب بیوی کو چھوڑ کر بھلا جانا کچھ آسان تھا؟ جی نہ لگنا تھا، نہ لگا۔ اور ایک ہفتہ کے اندر ہی لکھنؤ آنے کا چکر شروع ہو گیا، اور وہ بھی صاحبزادہ صاحب کی اجازت کے بغیر، محض اتوار کی تعطیل سے فائدہ اٹھا کر —— نوجوانی کا سن یوں ہی حماقت اور ناعاقبت اندیشی کا ہوتا ہے، اور پھر جب محبت کا جنون بھی شامل ہو جائے! صاحبزادہ صاحب نے جب اس فوری سفر کی خبر سُنی تو بڑا بلیغ فقرہ کہا کہ "بس یہ حضرت ملازمت کر چکے"! اور یہی ہوا، طبیعت علی گڑھ چھوڑ گھر آنے کے بہانے ڈھونڈھنے لگی۔ برسات کے موسم میں کچھ معمولی طور پر صحت خراب ہوئی اور یہ ایک بہانہ مفت کا ہاتھ آگیا۔ پورے دو مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ اس کو عذر بنا کر استعفار پیش کر دیا۔ صاحبزادہ صاحب خود اور دوسرے ساتھی سب مُنہ دیکھتے رہ گئے۔

فراق کی لذتیں بھی اس کی تلخیوں سے کچھ ایسی کم نہیں ہوتیں یہ راز ذاتی تجربہ سے علی گڑھ جا کر کُھلا، ڈاک کا کتنا انتظار ہر روز رہتا؟ کچھ لفافے نفیس و رنگین فینسی

قسم کے خرید کر دے آیا تھا، اور فرمائش کر آیا تھا کہ خط اگر ہر روز نہیں، تو ہر دوسرے دن ضرور لکھ کرو! ان "روزناموں" کے لئے مضمون ہر روز تازہ کہاں سے لایا جائے، اس سے کوئی بحث ہی نہ تھی، بحث بس اس سے تھی کہ خط ہر روز چلا آیا کرے، مدت فراق چند ہی روز رہی اور وہ کاٹے نہیں کٹتی تھی، ہر وقت وہی تخیل، وہی دھیان، وہی یاد ــــــ محبت ان تلخیوں، گرانیوں، رنجشوں میں بھی ایک لطف، ایک لذت، ایک چاؤ پیدا کر دیتی ہے۔ لکھنؤ میں ایک بزرگ و محترم دوست مرزا محمد ہادی مرزا ورسوا تھے، امراؤ جان آدا والے، پتے کی بات اپنی ایک غزل کے شعر میں کہہ گئے ہیں ؎

عشق میں حسرت دل کا تو نکلنا کیسا
دم نکلنے میں بھی کم بخت مزہ ہوتا ہے!

اخیر اگست تھا اور سسرال والے کئی ہفتے ہوئے لکھنؤ سے باندے منتقل ہو چکے تھے، علی گڑھ سے سیدھا لکھنؤ پہنچا اور دو ہی ایک روز بعد باندے۔ اب میں تھا اور وہی "ہنی مون والی رنگ رلیاں۔ سالی صاحبہ بھی یہاں ساتھ تھیں، اور ایک قریبی رشتے کی اور سالی بھی، اور مسعود میاں کی نئی دلھن بھی، کھانے پینے، سیر سپاٹے کے سلسلے رات دن۔ علمی اور کتابی ذوق گویا پیدائشی تھا، وہ فنا کیسے ہوتا، پھر بھی ایک حد تک اس فضا سے مغلوب تو ہو ہی گیا تھا۔

زندگی کے کسی دوسرے اُتار چڑھاؤ سے اس باب کو کوئی واسطہ نہیں، اس میں گفتگو صرف زوجیات ہی کے سلسلہ کی ہوگی ــــــ نئی بہو کی شرم و لحاظ، چاؤ چونچلے

چند روز خوب چلتے ہیں، لیکن کب تک؟ آخر ہر شے کی ایک عمر بھی ہوتی ہے ناز برداریوں کا زمانہ ختم ہوا، اور ان کی جگہ خانہ داری کی ذمہ داریاں سر پڑیں، اور بڑھیں بڑھتی گئیں اور سر پڑتی گئیں، اور ادھر اپنی بھی آنکھیں کھلتی گئیں اور اندازہ ہوتا گیا کہ بیوی گل اندام و پری وش سہی، ہمیشہ بزم عشرت کی تصویر اور بستر کی تفریح ہی بن کر نہیں رہ سکتی، اسے گھر کی منتظم اور بچوں کی ماں ہو کر بھی رہنا ہے، اور ان کے علاوہ بھی بہت کچھ، گوشت پوست رکھنے والی، خواہش و پسند رکھنے والی، مقصد و ارادہ رکھنے والی زندہ ہستی بہرحال ہوتی ہے، اور جوں جوں یہ حقیقت کھلتی گئی، ان ناول لکھنے والوں اور شاعری کرنے والوں کم بختوں پر غصہ بھی بڑھتا گیا جنھوں نے عورت کو محض ایک حسن و نزاکت کی گڑیا اور آلۂ عیش و لذت کی حیثیت سے پیش کیا اور کبھی یہ پہلو ان کے سامنے آنے ہی نہ دیا کہ عورت بھی مرد ہی کی طرح کتنی جسمانی معذوریوں اور بشری حاجت مندیوں کا مجموعہ ہوتی ہے، اور دل رکھتی ہے، دماغ رکھتی ہے، معدہ رکھتی ہے، بشری کمزوریوں سے محفوظ و مستثنیٰ کسی درجہ میں بھی نہیں، اور زندگی اگر ہے تو جوانی کے بعد پیری کی منزل اس کے لئے ناگزیر ہے۔

اولاد کا سلسلہ شادی ہی کے سال سے شروع ہو گیا اور کم و بیش، اسال جاری رہا۔ یعنی بیوی کی عمر کے کوئی ۳۸ ویں اور میری عمر کے کوئی ۴۲ ویں سال تک۔ کچھ اولادیں بچپن ہی میں رخصت ہو گئیں، دو ایک پیٹ بھی گرے، بالغ ہو کر چار جئیں، چاروں لڑکیاں، ماشاءاللہ اس وقت تک آنکھوں کی ٹھنڈک بنی ہوئی —— ظاہر ہے کہ سن کے ساتھ ساتھ نہ وہ رنگ و روغن قائم رہ سکتا تھا نہ وہ چہرہ کی آب تاب، نہ وہ قد و قامت کی رعنائیاں، نہ وہ زلف و کاکل کی سیاہیاں، نہ وہ شباب کی

رنگینیاں، لیکن یہ "ظاہر" اس وقت کہاں تھا؟ اتنی موٹی سی بھی حقیقت اس وقت روشن و عیاں کس پر تھی؟ "ظاہر ہے" کا لفظ تو قلم پر آج آرہا ہے، جب اس دور کو نصف صدی سے زائد گزر چکا، جب اپنا سن ۵، ویں سال کو پہنچ گیا، اور جب وہ ۱۶ء کی نئی نویلی ۱، ۷، ۲، کے پیٹے میں آچکی! ایسی بات کوئی اُس وقت زبان سے نکالتا تو اس بچارے کی شامت ہی آجاتی اور بس چلتا تو اس کی زبان گدّی سے کھینچ کر رکھ دی جاتی! ——— یہ اور بات ہے کہ اُڑے ہوتے رنگ روپ، جھرّیوں پڑے ہوتے چہرے، مرجھائے ہوتے رخساروں، دھنسی ہوئی آنکھوں، گرے ہوتے دانتوں، بھاری بلغمی جسم، نقرس زدہ ٹانگوں والی خاتون، آج بھی میری نظر میں محبوبہ ہی بنی ہوئی ہے!

۷۰، ۲، ۷ سال کی بوڑھی محبوبہ! آج کہاں ہے اس کی وہ خوبی و زیبائی، رعنائی و شادابی! لیکن نور عصمت سب سے بڑھ کر، سب پر مقدم، سب سے فائق!

اقبال حکمت و معرفت کی منزلوں سے پہلے عشق مجازی کے بھی رہ نورد رہ چکے تھے، عمر کی ایک منزل پر پہونچ کر یہ "ترجمان حقیقت" شعرا ہیں کی زبان سے ادا ہوسکا ہے

بیں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
بیں حکایت غم عاشقی، تو حدیثِ ماتم دلبری!

اور اکبر تو مجاز و حقیقت کے جامع، اور ایک ہی وقت میں عاشق، حکیم، عارف سب ہی کچھ تھے، کیسے اس حقیقت کا پتا نہ بتا جاتے ؎

حُسن ہے بے وفا بھی، فانی بھی
کاش سمجھے اسے جوانی بھی!

اور اس نامہ سیاہ کے ایک مخلص رقم لکھنوی مرحوم تھے وہ بھی کس مزے سے سُنا گئے ہیں ؎

ہے یہ حقیقت مجاز، اب یہ کھلا ہے جا کے راز
سب ہے فریب آب و گل، حسن و جمال کچھ نہیں

وقت کی رفتار روک دینا کس بندے کے بس کی بات ہے؟ سن و سال کے اثرات کو روک دینا کس کے اختیار میں ہے؟ کہنگی کا نقش کون دھو سکا ہے؟ جدت قدامت میں، جوانی پیرانہ سالی میں، قوت ضعف میں، ہر لحظہ و ہر آن کس قیامت خیزی سے، کس برق رفتاری سے تبدیل ہوتی رہتی ہے، اور انسان غریب کے بس میں بجز حسرت و تمنا کے اور کیا ہے؟ ـــــ دعائیں بارہا کی ہیں، کہ یہ رفیقۂ حیات اُس عالم میں حور بن کر ملے، ایسی دعائیں اور مُرادیں اہل جنت کو تو ضرور مل کر رہیں گی لھُم مایشاؤن فیہا ولدینا مزید کا وعدہ صراحت سے موجود ہے، ہاں اپنا نصیبہ مغفوریت کا ہونا چاہیئے۔

بات بہت دُور کھنچ گئی، بلکہ بظاہر بالکل اخیر تک پہنچ گئی، لیکن نہیں، ابھی اسی سلسلہ میں اور بھی سنتا سنانا ہے، نصف صدی سے اوپر کا ازدواجی تجربہ کچھ تھوڑا ہوا، ہزار سمیٹنا چاہے بہر حال کچھ نہ کچھ طوالت تو ناگزیر ہے۔

بی بی کی شکل و صورت کا سوال، شادی پر چند سال گزر جانے پر کچھ زیادہ اہم نہیں رہ جاتا، درجۂ ثانوی پر آجاتا ہے، ناک نقشہ ہر جوان عورت کا مرد کے جذبۂ شوق کو تسکین دینے کے لئے کم و بیش یکساں ہی ہوتا ہے۔ فطرت کہنا چاہیئے کہ ہر جوان عورت کے چہرے

پر مار الشباب کا غازہ مل کر اسے مرد کے لئے قبول صورت بنا ہی دیتی ہے، اور اکیلا چہرہ کیا معنی اس کی ساری ہی جسمانی ساخت کا تقریباً یہی حال ہے، سابقہ پڑنے پر خصوصاً ہمہ عمری اور ہر جہتی سابقہ پر صورت سے کہیں بڑھ کر سیرت کو اہمیت حاصل ہو جاتی ہے اور سیرت کا مفہوم بڑا وسیع ہے، رہنے سہنے کے سارے رنگ ڈھنگ اور حسن معاشرت کی ساری صورتیں اس کے اندر آگئیں، میاں بیوی کا سابقہ، دنیا کے سارے سابقوں سے نرالا ہے، باہمی الفت و محبت جتنی بھی ہو، یہ ناممکن ہے کہ روزانہ زندگی کے بے شمار جزئیات میں دونوں کے سوچنے کا ڈھنگ بالکل ایک سا ہو.

فہم اور اختلاف مذاق تو لازمۂ بشریت ہے، اور پھر سابقہ اکثر صورتوں میں بیوی کو تنہا میاں سے نباہنا نہیں ہوتا، بلکہ سارے سسرال والوں اور سسرال والیوں سے نباہنا ہوتا ہے، ان میں بڑے بھی ہوتے ہیں، اور چھوٹے بھی، عورتیں بھی، مرد بھی، خود اپنی اولاد بھی، اور خوش حال گھرانوں میں نوکر چاکر بھی، یہ امتحان دنیا کے سخت ترین امتحانوں میں سے ہے، اور بڑی ہی قابل داد اور قابل تہنیت ہیں وہ بیویاں جو اس مرحلہ کو کامیابی سے طے کر جائیں ——— اپنی قسمت پر رشک کرنے اور اپنے کو مبارک باد دینے کو جی چاہتا ہے کہ اپنی رفیقۂ حیات، بہ حیثیت مجموعی اسی قسم کی نکلیں، اونچے گھر کی تھیں، بڑی مغرور ہوتیں، بڑی مُسرف ہوتیں، بڑی تیز زبان ہوتیں، بڑی کاہل و آرام طلب ہوتیں، مال کی بڑی حریص ہوتیں تو میں کیا کر لیتا؟ ہر وقت کے جھگڑے قضیوں سے زندگی کیسی اجیرن ہو جاتی؟ علمی اور قلمی مشغلوں کے لئے وقت اور سکون خاطر کہاں سے لاتا؟ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے ان سارے خطروں سے بچا دیا، یہ نہیں کہتا کہ وہ فرشتہ خصلت ہیں، بے زبان ہیں، بے نفس ہیں، درویش صفت ہیں، کبھی

بھی مجھے یا میرے والوں کو ان سے اذیت نہیں پہنچی ایسے بے مزہ مبالغہ کے ڈانڈے جھوٹ سے مل جاتے ہیں، اور عملی دنیا میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں، نرم وگرم دنیا میں ساتھ چلتے ہیں، پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں، یہ اللہ کا احسان عظیم ہے کہ فی الجملہ ابتک جیسی گزری، قابل صد شکر اور بہتوں کے لئے باعث رشک ہے۔

والد مرحوم کی رحلت تو پہلے ہی ہو چکی تھی، باقی والدہ تھیں، بہن تھیں، بہنوئی تھے، بھائی تھے، بھاوج تھیں، بھتیجے تھے، بھتیجی تھی، رشتہ کے بڑے بہت سے تھے، چھوٹے بہت سے تھے، خادموں، خادماؤں کی ایک پوری پلٹن تھی ——— مسلمان گھرانے کی خاتون کو جنت جیت لینے کے لئے بہت زیادہ نفل نمازوں اور عبادتوں ریاضتوں کی ضرورت ہی نہیں، بس فرض عبادتوں کے بعد بچوں کو ٹھیک طرح پرورش دے دینا، اور اپنے سابقہ والوں کے حق ادا کر کے ان کو راضی رکھنا یہ خود کسی مجاہدے سے کم نہیں، چھپے ہوئے کاغذ پر یہ باتیں کچھ وعظ خشک سی معلوم ہو رہی ہوں لیکن جن کو تجربہ ہے اور وہ احساس صحیح بھی رکھتے ہیں کہ متاہل زندگی میں ہر دن ہی نہیں، ہر گھنٹہ، ہر منٹ کیسے کیسے امتحانوں سے گزرنا ہوتا ہے اور یہ محض فضل خداوندی ہی ہے جو قدم قدم پر دستگیری کرتے رہتا ہے۔

باب (۲۳)

ازدواجی زندگی نمبر (۵)

یہ غلط فہمی ہرگز نہ ہونے پائے کہ ۵۰،۱۵ سال کی ازدواجی زندگی بس ہنستے کھیلتے بغیر کسی بے لطفی وناگواری کے پیش آئے، گزر گئی۔ ایسا ہونا اس مدت کیلئے تو کیا، اس کے بیسویں حصے کے لئے بھی اس آب و گل کی دنیا میں ممکن نہیں، اس عالم عنصری میں تو قدم قدم پر تصادم و تزاحم رکھا ہوا ہے، نفس کا نفس سے، عقل کا عقل سے، ذوق کا ذوق سے، دُلھن جب بیاہ کر آتی ہے تو اپنے گھر اور اپنے ماحول کی پڑی ہوئی راسخ عادتیں ساتھ لے کر آتی ہے، ایک خاص مزاج، ایک خاص مذاق، ایک متعین شخصیت، کچھ موم کی تو ہوتی نہیں کہ اسے جس سانچے میں چاہئے ڈھال لیجئے، جس رُخ پر چاہئے موڑ دیجئے، عادتیں اور خصلتیں قائم ہو چکی ہوتی ہیں، پسند و ناپسند، ردّ و قبول کا ایک معیار بندھ چکا ہوتا ہے، پھر غلط فہمیاں اور مغالطے ایک ہی فریق کو نہیں، فریقین کے ایک دوسرے سے متعلق رہتے ہیں، جذبات شدید، نوجوانی اور جوانی کے سلامت رہیں، وہ موقع ہی غور و تامل، بلکہ صحیح اور پوری واقفیت کا کب دیتے ہیں، آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں، مگر ان سے کام ہی حقائق کے دیکھنے کا کون لیتا ہے۔ ہر ایک کی کمزوریاں اور مزاج کی ناہمواریاں، تو سابقے اور لمبے سابقے کے بعد ہی کھلتی ہیں، نہ کہ اس کے قبل۔

غصّہ ور، تند خو، میں شروع ہی سے تھا، غصّہ چہیتی بیوی پر بھی شروع کر دیا،
شادی کے دو ہی ایک مہینہ کے بعد، وہ بچاری حیران کہ میں تو انھیں اپنا پرستار
سمجھتی تھی یہ جلّاد کیسے نکلے، اپنا ہی نادری حکم چلانا چاہتے ہیں، دعویٰ عشق و فرمانبرداری
کا تھا، مگر اب تو یہ حاکم بن کر رہنا چاہ رہے ہیں! ـــــ غصّہ و طیش کے لئے ضرورت
کسی بڑے مُحرک اور قوی سبب کی نہ تھی، روزانہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعہ
اس کے لئے کافی تھے، وعدہ کر کے گئی تھیں کہ میکے ماں، بہن بھاوج سے مل ملا کر چند
گھنٹے میں لوٹ آؤں گی، اتنی دیر ہو گئی، اتنی رات آگئی، میکہ والوں کے اصرار سے یہ
رُک کیوں گئیں۔ بس یہ میرے غصہ و اشتعال کے لئے کافی تھا۔ یہ محض ایک مثال تھی۔
آئے دن کوئی نہ کوئی واقعہ ایسا پیش آتا ہی رہتا ـــــ انسان زبانی دعوے عشق و
محبت کے جو کچھ بھی کر ڈالے، حقیقت میں وہ سب سے بڑا عاشق خود اپنے نفس کا ہوتا
ہے، اپنی مرضی کو کسی کے تابع نہیں، سب پر بالا ہی رکھنا چاہتا ہے، جہاں کسی کی
طرف سے بھی مزاحمت اپنی خواہش نفس کی پیش آگئی، سارے دعوے عشق و محبت
کے دھرے ہی رہ جاتے ہیں، طوفان غیظ، ہیجان غضب سے مقابلہ کی قوت اگر کسی
چیز میں ہے تو صرف خوف خدا میں ہے اور اس وقت کا ملحد شوہر ظاہر ہے کہ اس
دولت سے یکسر تہی مایہ تھا۔ یہ بات سب کے کام کی اور بڑے تجربہ کی لکھ رہا ہوں،
اپنے اوپر خوب بیتی ہوئی، اور اسے خوب بھگتے ہوئے

من نہ کردم شما حذر بہ کنید

عفریتِ غضب کے ساتھ جو دوسرا بھوت، جوانی بھر سر پر سوار رہتا ہے وہ

جو لذت صرف کبھی کبھی حاصل کر لینے کی ہے نفس کو تقاضا یہ رہتا ہے کہ اسے دن رات حاصل کرتے رہئے، اور ساری طبّی ہدایتوں کو پامال کرتے، اور قوت کے ذخیرہ کو پوری بے دردی و اسراف کے ساتھ لٹاتے رہئے۔ بیوی کی عارضی جدائی بھی کھلنے لگی اور زچگی یا علالت کے سلسلے میں کئی کئی ہفتے کی علٰحدگی تو وبال جان بن گئی۔

واقعات و سوانح کی طرف قدم بڑھانے سے قبل ذرا اکبر الہ آبادی کے شعر سنانے کی اجازت دیجئے ؎

نیچر کو ہوئی خواہش زن کی اور نفس نے چاہا رشک پری
شیطان نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زانی ہی سہی
نیچر کی طلب بالکل ہے بجا اور نفس کی خواہش بھی ہے روا
شیطان کا ساتھ البتہ بُرا، اور خوف خُدا ہے اس کی دَوا

ذاتی تجربہ نے اکبر کے کلام ہدایت نظام کی توثیق سو فی صدی کر دی "نیچر کی طلب" جوں کی توں ہی اور نفس کی خواہش میں بھی زیادہ کمی نہیں ہونے پائی، لیکن حرام کا سوال اب خارج از بحث ہو گیا۔ مشورے اب جب بنے "باقاعدہ عقد نکاح کے اور اسکیم جو بھی پختہ ہوئی وہ عقد جواز شرعی کے اندر رہی رہی۔

مرد کے عقد ثانی کے لئے یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھ لیجئے کہ اُس کے لئے ہرگز ضروری نہیں کہ اس کی تہہ میں پہلی بیوی سے کسی ناخوشی یا بیزاری کا، بلکہ بے رغبتی و بے التفاتی ہی کا کوئی جذبہ شامل ہو، محبت اور دل لگاؤ اور چیز ہے، اور "نیچر کی طلب" یا طبعی ضرورت بالکل دوسری۔ غالب کا مقطع نری شاعری نہیں، ایک گہری نفسیاتی حقیقت کا ترجمان ہے ؎

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حُورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

فرماتے ہیں کہ راحت قلب جس شے کا نام ہے، وہ تو سوا تمہارے اور کسی سے ممکن ہی نہیں، البتہ جسمانی رغبت اگر حُورِ بہشت کی طرف ہو جائے تو یہی بہت ہے)
—— بیوی کے طویل زمانۂ حمل و مدت رضاعت کے باعث طبیعت ایک مدت سے ڈانواڈول رہا کرتی یہاں تک کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں جب اپنی عمر اڑتیسویں سال میں تھی، منتشر خیالات مرتکز ہو کر ایک مرحوم دوست کی بیوہ پر جم کر رہ گئے۔

ایک جوان مرگ صاحب علم و تقویٰ، ندوی مخلص کی بیوی شروع سنہ ۲۶ء میں بیوہ ہو گئیں اور مالی حیثیت سے گویا بالکل بے سہارا ہو گئیں، خود تھیں اور ایک ڈھائی تین سال کی بچی۔ ایک آدھ سال بعد بڑے بھائی نے مجھے خط پر خط لکھے کہ کہیں ان بچاری کا عقد کرا دیا جائے، میں نے بہت نظر دوڑائی اور ایک دو ایک عزیزوں کو خط بھی لکھے جہاں گنجائش نکلنا ممکن تھی، کسی نے ہامی نہ بھری، اور اسی میں دن گزرتے گئے یہاں تک کہ سنہ ۳۰ء آگیا اور دل میں یہ خیال آنے لگا کہ کہیں اور گنجائش نہیں نکل رہی ہے، تو میں خود ہی کیوں نہ عقد ثانی کر لوں، اور اس طرح ایک طرف ایک سنت مُردہ (تعدد ازدواج) کو زندہ کر دوں، اور ایک مخلص دوست کی بیوہ کی امداد کا ذریعہ بن جاؤں اور بیوی کو زمانۂ حمل بھر جو طبی مشورہ علٰحدگی اور پرہیز کا دیا گیا ہے چلو اس کی بھی تعمیل بہ آسانی ہو جائے گی۔ گویا عوام کی زبان میں ہم خرما و ہم ثواب۔ بیوی سے مشورہ کیا، انھوں نے جس طرح سُنا، اور جو جواب دیا، اس سے میں تو یہی سمجھا کہ وہ نیم رضامند

نہیں، بلکہ پوری طرح رضامند ہیں —— اب ان بیوہ کے بھائی کو خط لکھا کہ نادم ہوں کہ کوئی صورت خاطر خواہ اب تک نہ نکل سکی، اب ایک صورت یہ خیال میں آتی ہے کہ اگر کوئی بیوی والا بطور زوجہ ثانی کے اپنے عقد میں لانا چاہے، تو آپ لوگ اسے قبول کر لیں گے"؟ جب اس کا جواب منظوری میں آگیا، تو اپنا نام کھل کر لکھ دیا اور یہ بھی تصریح کر دی کہ پہلی سے کوئی شکایت و ناخوشی تو ہے نہیں، البتہ جہاں تک ضابطہ سے فریضہ عدل کا تعلق ہے، اس کی کوشش اپنی والی انشاءاللہ رہے گی۔ جب اس کا بھی جواب منظوری میں آگیا، تو پھر اپنی محبوب بیوی کو مطلع کر کے بلکہ ان کا عندیہ بھی لے کر، ان ہونے والے برادر نسبتی کو لکھ بھیجا کہ آپ وکیل بن کر فلاں تاریخ کو آجائیے اور دو گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول ہو جائے، وہ آئے اور میں اپنے انتہائی اخلاص و یگانگت کی بنا پر یہ مناسب سمجھا کہ اس مختصر ترین محفل عقد کا نظارہ بیوی صاحبہ بھی پس پردہ کر لیں نکاح ہو گیا —— اور جوں ہی محفل برخاست ہو گئی، مجھے علم ہوا کہ ارے! انھیں تو اچھا خاصہ رنج ہے، ان کے آنسو نکل رہے ہیں! مگر اب کیا کروں؟ تیر تو کمان سے نکل چکا تھا، اپنی والی ساری کوشش ان کی تسلی اور ڈھارس دلجوئی اور دل دہی کی کر ڈالی! —— فطرت بشری بھی کتنی پیچیدہ پُراسرار و غامض ہوتی ہے! جس کارروائی کو میں عین دلیل اخلاص ویگانگت کی سمجھا تھا، وہ میری عین نادانی وسفاہت ہی نکلی! —— اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان کے رنج و صدمہ کی پوری گہرائی کا اندازہ مجھے اب بھی نہ ہوا، اور میں سمجھا کیا کہ یہ کیفیت ہلکی، سطحی، عارضی ہے۔

چند روز بعد پھر ان نئی بیوی کا نہایت سادگی کے ساتھ گھر میں داخلہ ہوا، اور

میں نے پہلے ہی دن، تخلیہ سے قبل، اپنے ایک رشتہ کے بھائی اور ہمشیر و بھاوج کے ساتھ دونوں بیویوں کو بٹھا، ایک مختصر سی تقریر کردی، نئی سے مخاطب ہو کر کہا کہ" یہ پہلی بیوی محض بیوی ہی نہیں، بلکہ اور بھی بہت کچھ ہیں، محبوبہ ہیں، محسنہ ہیں (احسانات کی تفصیل بیان کی)، اس لئے جہاں تک محض بیوی کے حقوق زوجیت کا تعلق ہے، تم اور یہ انشاء اللہ یکساں رہیں گی۔ باقی اور چیزوں میں ان کا حق تم سے کہیں فائق رہے گا، اور یہ ہر طرح تمہاری سینیر رہیں گی۔ اسی طرح پہلی سے مخاطب ہو کر کہا کہ" اب تو یہ آچکیں، انھیں تو اپنی چھوٹی بہن سمجھ کر شفقت کا برتاؤ رکھو" ـــــــ لیکن اس قسم کی تدبیریں ذرا بھی کارگر نہ ہوئیں، پہلی کا پارہ جو تیز ہو چکا تھا، اور زیادہ ہی تیز ہوتا چلا گیا اور میں نے بھی تو اس درمیان میں دو ایک بار تیز اور نامناسب گفتگو کر ڈالی تھی۔ ان حماقتوں پر آج تک دل سے شرمندہ ہوں۔ بہر حال معاملہ بگڑتا ہی گیا۔ اور اب ان محبوب بیوی کو جنھیں اختلاج تو پہلے ہی سے تھا، باقاعدہ دَورے غشی اور تشنج کے ہسٹیریا کے سے پڑنے لگے! ہر وقت غصہ میں بھری رہتی تھیں، کھڑے سے گر پڑتی تھیں اور سخت سخت چوٹیں کھاتی تھیں۔ میرے ہاتھوں کے جیسے طوطے اُڑ گئے گویا ع

آسد اور لینے کے دینے پڑے!

خوش مزاجی اور زندہ دلی کافور ہو گئی، ہر وقت بدمزاجی سے بھری، اور غصہ کے بہانے ڈھونڈھنے لگیں، میں نے حکیم الامت حضرت تھانوی کی خدمت میں فریاد کی، جواب حسب معمول بڑا تشفی بخش آیا، کہ یہ ساری کیفیتیں کسی ضد یا مخالفت سے نہیں، بلکہ دفور محبت سے پیدا ہوئی ہیں، ان کو آپ کے ساتھ اس درجہ محبت ہے کہ وہ اس کا تصوّر ہی نہیں کر سکتی تھیں کہ آپ کسی اور کو محبت میں کسی

درجہ میں بھی شریک کرلیں گے"، ہفتہ دو ہفتے نہیں، مہینوں کے مہینے اس خانگی بے لطفی کے ہوگئے۔ والدہ ماجدہ، بھائی صاحب، ہمشیرہ وغیرہ کوئی بھی اس جدید رشتہ سے خوش نہ ہوا، اور پُرانی سسرال والے بعض اعزہ تو اس درجہ مستقل و برافروختہ ہوئے کہ حد بیان سے باہر! ساری برادری میں اس طرح کھلبلی مچ گئی، کہ میں نے جیسے کوئی جُرم عظیم کیا ہو، میں ایک ایک سے پوچھتا کہ پہلی بیوی پر میں نے آخر کیا ظلم کیا زیادتی کسی حد تک بھی کی ہے اسکا جواب کوئی بھی نہ دیتا، بس ایک "بہت بُرا کیا، بہت بُرا کیا" کی رٹ زبانوں پر مسلسل جاری تھی۔

خیر، یہ سب تو تھا ہی، ایک نئی اور تمامتر غیر متوقع صورت یہ رونما ہوئی کہ یہ جدید بیوی صاحبہ خود مجھی کو کسی اعتبار سے بھی پسند نہ آئیں، نہ صورۃً نہ سیرۃً، اور میرے اندازہ و معیار سے بالکل ہی مختلف نکلیں، اور یہ انقباض اول دن سے پیدا ہوگیا تھا، جب تک میں نے ان کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی، ان ناخوش گوار لیکن بڑے اہم جزئیات کی تفصیل امر لاحاصل اور علاوہ میرے قلم کے لئے باعث تکلیف ہونے کے، ان بچاری کے لئے بھی باعث رُسوائی، اس لئے یہ ساری تفصیلات بالکل القط! خلاصہ یہ کہ چند مہینہ کا نباہ تو خیر لشتم پشتم ہوگیا، اور وہ بھی جب کہ اس مدت کا بڑا حصہ ان کا اپنے میکہ ہی میں گزرا۔ اور اب کوئی صورت ہی ان کے ساتھ حسن معاشرت سے گزر کرنے کی نظر نہ آئی۔ مجبوراً آخری علاج سے، جس کا نام طلاق ہے، کام لینا پڑا۔ طلاق نامہ اپنے اس وقت کے معیار سے نرم سے نرم الفاظ میں لکھ کر بھیج دیا۔

عقد اکتوبر سنہ ۳۰ء میں ہوا تھا، طلاق کی نوبت غالباً سنہ ۳۱ء میں آگئی، طلاق نامہ

پاکران محترمہ پر جو اثر پڑا، بالکل ظاہر ہے، میرے پاس معذرت نامہ بڑے ملتجیانہ انداز میں لکھا میری ہمشیرہ سے بھی سفارش اٹھوائی، مجھے خود بچاری پر بڑا ترس آتا رہا، لیکن کرتا کیا، یہ رشتہ قائم رکھتا تو مجھے خود بھی تکلیف، انھیں بھی تکلیف، پہلی بیوی کو تکلیف، تینوں کو تکلیف کا سامنا کرنا تھا، اور علٰحدگی کی صورت میں صرف انھیں کو تکلیف تھی قدرۃً اہون البلیات کو اختیار کیا۔ مہر کی رقم ہی کیا تھی، فوراً ادا کر دی اور اس کے بعد بھی کچھ نہ کچھ ماہانہ خدمت کی توفیق عرصہ تک حاصل رہی، آخر میرے ایک مخلص و بزرگ دوست کی بیوہ بھی تو تھیں۔ بچاری نے زندگی ہی زیادہ نہ پائی، بچی تو طلاق کے کچھ ہی دن بعد راہی ملک بقا ہوئی، خود بھی دو چار سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکیں، دنیا سے سخت تنگ و ناشاد ہو کر اپنے مولا سے جا ملیں۔ رب اغفرلہا وارحمہا میں نے ان کے سارے قصوروں، کوتاہیوں کو معاف کیا، اور اسی معافی کی طمع اپنے قصوروں کے لئے ان سے بھی رکھتا ہوں، بچاری کیا کیا امیدیں لے کر میرے گھر آئی تھیں اور کیا کیا حسرتیں لئے ہوئے رخصت ہوئیں! ——— آہ، مشیت تکوینی و تقدیر کے سامنے انسان ضعیف البنیان کی بے بسی و بے چارگی!

طلاق کا دینا تھا کہ معلوم ہوا ملک بھر میں ایک زلزلہ سا آگیا! جن جن صاحبوں کو سچ (صدق کے نقش اول) سے کوئی بھی وجہ ملال تھی، ان کی بن آئی، سب نے خوب خوب قلم کی کار فرمائی دکھائی۔ ایک مستقل پمفلٹ "عبدالماجد دریابادی بے نقاب" کے عنوان سے بڑی تعداد میں چھپ کر خوب تقسیم ہوا، اور خدا جانے کتنے اخباروں رسالوں نے اسی کے سہارے تیغ قلم کے جوہر مہینوں تک دکھاتے! گویا میں کسی شخصی و ذاتی ہی نہیں، بلکہ کسی بڑے قومی جرم کا مرتکب ہوا تھا، ہر قسم کی پبلک تفضیح

و رسوائی کا سزاوار، اور ایک دہلوی کرم فرما تو یہ پوسٹر ملک بھر میں شائع کر کے رہے کہ میرے اوپر ہر جمعہ کے دن ہر مسجد کے منبر سے لعنت کی جائے! ــــــ طبعی کبیدگی مجھے کیوں نہ ہوتی، لیکن بحمد اللہ عقلاً خوش ہی ہوتا رہا۔ کہ ادائے حقوق میں کوتاہیاں خدا معلوم کتنی رہ گئی ہوں گی، اچھا ہوا کہ اس طوفان فضیحت سے کچھ تو کفارہ ان کا ہو جائے! ــــــ تجربہ عقد ثانی کا اچھا خاصہ تلخ و صبر آزما ہو کر رہا، ضمیر بالکل ہی مردہ ہو جائے اور پروا کسی درجہ میں بھی ادائے حقوق کی نہ رہ جائے، جب تو خیر، ورنہ یوں یہ عقد ثانی شوہر کے لئے کوئی دل لگی اور تفریح کی چیز نہیں۔

محبوب بیوی کی حالت اس زمانے میں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، ہر وقت گویا لڑائی پر تُلی ہوئی، اور لڑائی کا بہانہ ڈھونڈتی ہوئی، اور یہ ساری بدمزاجی صرف مجھ سے، اپنی سوکن سے نہیں، سیدھے مُنہ مجھ سے بات کرنا جیسے بھول ہی گئی تھیں، لیکن طرفہ تماشہ یہ کہ اُدھر انھیں کے عزیزوں میں سے کسی نے ان کی ہمدردی میں میرے اوپر نکتہ چینی کی کہ اِدھر یہ اُلٹ پڑیں اور لگیں میری طرف سے بحثنے اور میرا دفاع کرنے ــــ محبت کی نیرنگیاں کیا کسی دیوانگی سے کم ہوتی ہیں!

خو سمجھ میں نہیں آتی ترے دیوانوں کی

باب (۲۴)

ازدواجی زندگی نمبر (۶)

اپنی دل پسند بیوی مل جانا، دنیا کی بہت بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، جہاں جہاں میاں بیوی میں موافقت نہیں ہوتی، زندگی ایک مستقل کوفت ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ یوں کہیئے کہ ہر وقت کی کش مکش اور ہمہ وقتی جھک جھک زندگی کو نمونۂ جہنم بنا دیتی ہے، جہاں تک افتاد مزاج اور مذاق طبیعت کا تعلق ہے توافق ہم میاں بیوی میں بھی نہیں، تعلیم کا اختلاف، تربیت کا اختلاف، ابتدائی ماحول میں عظیم اختلاف، بہت سے اختلافوں نے مل ملا کر ہم دونوں کی سیرتوں میں فرق زمین و آسمان کا پیدا کر دیا ہے، پھر بھی کچھ چیزیں اللہ کے فضل سے ایسی جمع ہو گئیں جنھوں نے اس خلا کو یہی نہیں کہ پُر کر دیا ہے، بلکہ زندگی میں ایک بڑی دلکش ہمواری اور مثبت زیبائی پیدا کر دی ہے۔

(۱) پہلی چیز تو طبعی محبت ہے، شروع ہی سے جوان کی محبوبیت نظر میں سما گئی ور دل میں بیٹھ گئی، اس میں گو اُتار چڑھاؤ بھی بہت زمانے آئے، اور بار بار آئے پھر بھی اتنا سِن آ جانے پر، اور حالات کی بالکل کایا پلٹ ہو جانے پر بھی، محبوبیت کسی درجہ میں قائم ہی ہے۔

(۲) لیکن یہ سب سبب ضعیف ہے، اور اکیلا یہ سہارا کش مکش حیات کے مسلسل رگڑوں میں بس ایک بودا اور کمزور ہی سہارا ہے۔ اصلی اور قوی سبب، طبعی نہیں، عقلی ہے اور عقلی بھی کیوں کہیے، صاف کہیئے کہ دینی ہے۔ اور وہ ہے خوف خدا یا بیوی کے حقوق کا احساس ——— اور یہ نعمت دربار اشرفی ہی میں حاضری سے ملی، حضرت حکیم الامت کی خدمت میں اوّل بار حاضری کی سعادت جولائی ۱۹۲۳ء میں حاصل ہوئی اور اس کے بعد حضرت کی وفات جولائی ۱۹۴۳ء تک برابر وقتاً فوقتاً ہوتی ہی رہی۔ ۲۸ء میں شادی کو کُل ۱۲ ہی سال ہوئے لیکن اتنے ہی دنوں میں اور کل ۳۶ سال کے سن میں "عشق و محبت" کا نشہ بہت کچھ اُتر چکا تھا، بلکہ یہ ۱۲ سال تو بہت ہوئے، اس سے کہیں قبل ہی محبت کے درخت میں دیمک لگنا شروع ہو گئی تھی، اور رنجش و ملال کے لئے بے بات کی باتیں نکلنا شروع ہو گئی تھیں ——— کش مکش حیات نام ہی اسی تلوین تلوّن کا ہے، اور جنسی عشق و طبعی محبت کی کائنات ہی کُل اتنی ہے ؎

عشقہائے کز پئے رنگے بود   عشق نبود عاقبت ننگے بود

اچھے اور بعض نامور علماء و مشائخ کی صحبت پہلے ہی رہ چکی تھی، لیکن یہ زندہ احساس حضرت تھانوی ہی کے پاس بیٹھ بیٹھ کر ہوا کہ بیوی بھی اپنے مستقل حقوق رکھتی ہے، محض مطیع و محکوم بننے کے لئے نہیں آئی، کوئی محض خادمہ و کنیز کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ رفیق و شریک کا مرتبہ رکھتی ہے۔ فرائض خدمت اکیلے اسی کے ذمہ نہیں شوہر کے ذمہ بھی ہیں، اور مسلمان کو اگر اللہ کی رضا کی طلب اور اپنے حسن عاقبت کی فکر ہو، تو عمل کا ایک لازمی جز بیوی کے ساتھ حسن سلوک اور اس کے حقوق کی

اداتی ہی ہے، یہ تعلیم اگر جولائی ۲۸ء ہی سے جزوِ عقیدہ نہ بن گئی ہوتی، تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اختلافات بڑھتے ہوئے کہاں سے کہاں تک پہنچتے، اور نتیجے کن کن چیزوں کی شکل میں ظاہر ہو کر رہتے!

دین کی خدمت، بلکہ علم و ادب کی بھی، تھوڑی بہت جو کچھ بھی بن پڑی باہر والے اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ اس میں کتنا بڑا دخل اسی سکونِ قلب کا ہے، جو اپنی خانگی زندگی میں حاصل رہا، اور اس نعمتِ عظیم کے حاصل ہو جانے میں دوسرے عزیزوں قریبوں کے ساتھ کتنا بڑا حصہ بیوی کا ہوتا ہے! جمعیتِ خاطر اگر نصیب نہ ہو جاتی، تو خدا معلوم کتنا وقت بک بک جھک جھک ہی کی نذر ہو جاتا، اور لکھنے پڑھنے، فکر و مطالعہ کا شوق دھرے کا دھرا رہ جاتا! تو اب اگر اللہ نے محض اپنے فضل و کرم سے اس ناچیز کی دینی خدمات کو کسی درجہ میں بھی شرفِ قبول عطا فرمایا تو اس میں ذرا شک نہیں کہ جس طرح زندگی کی ہر منزل میں وہ رفیق و شریک رہیں اسی طرح اجر و صلہ میں بھی وہ برابر شریک رہیں گی! —— جب پہلی بار میرے ہاں آئیں تو میں تمام تر لامذہب تھا، اور یہ فی الجملہ مذہبی ہی تھیں، بچاری نے اپنی والی ساری کوشش میری زندگی کو بھی مذہبی بنا دینے کی کر ڈالی اور اسی دُھن میں لگی رہیں کہ کسی طرح بہلا پھسلا کر مجھ سے نماز بھی پڑھوا لیں کہ خاندان برادری میں کچھ تو بدنامی میری لامذہبی اور بے دینی کی ہلکی ہو جائے —— خیر، پھر برسوں کے بعد جب میں از سرِ نو اسلام سے مشرف ہوا، اور زندگی میں مذہبیت از سرِ نو داخل ہوئی تو یہ خوش بہت ہوئیں لیکن چند ہی روز بعد انھیں میری نااہلی اور خشک مذہبیت کھلنے بھی بہت لگی، صبح تڑکے

اُٹھو، نماز پانچوں وقت کی پابندی سے پڑھو، وضو عشا و فجر کے وقت سخت سردی میں بھی کرو، اس قسم کی ساری تاکیدیں ان پر شاق گزرتیں اور اس سے بھی بڑھ کر صبر آزما ان کے لئے میری روک ٹوک ان کی بدعتی رسموں پر ثابت ہوئی، ان بچاری کا نشو ونما تمامتر اسی ماحول میں ہوا تھا، جہاں مذہبیت کے معنی یہ تھے کہ آج فلاں نذر مانی ہے، اور کل فلاں مَنت اُتاری جاری ہے، فلاں بزرگ کی نیاز دلائی جارہی ہے، فلاں مزار پر چادر چڑھائی جارہی ہے! —— شاباش ہے اس نیک دل خاتون کو، کہ رفتہ رفتہ ساری ہی عادتیں بدل ڈالیں، اور میرے گھر کے نئے ماحول میں پوری طرح کھپ گئیں۔ اور یہ بیان تو صرف دینی پہلو کا ہوا، باقی مالی، معاشی، مجلسی، تقریبًا ہر ہی حیثیت سے انھیں ایک نیا سابقہ پڑا، اور عمومًا امارت سے غربت کی طرف، اور خوش حالی سے تنگ حالی کی طرف (خصوصًا شروع کے چند سال تک) آنا پڑا، اور آفریں ہے کہ ہر سابقہ کو بغیر کسی بڑی اور سخت کش مکش کے نباہ لے گئیں، میری والدہ ماجدہ اور ہمشیر معظمہ دونوں نماز کی بڑی سخت پابند تھیں، تہجد، اشراق، چاشت تک ناغہ نہ ہونے پاتیں۔ یہ بھی ہمارے ہاں آکر فرائض پنج گانہ کی تو خیر پابند ہو ہی گئیں اور کبھی کبھی جب دعا کے لئے مضطرب ہوتیں تو تہجد بھی پڑھنے لگتیں۔

ان کی اطاعت کیشی رفاقت وہمدمی کی پوری داستان لکھنے پر آتے تو ایک مستقل رسالہ ہی تیار ہو جاتے۔ صرف دو ایک واقعے بہ طور مثال و نمونہ درج کر دیتے کافی ہوں گے۔

(۱) ۱۹۱۶ء میں جب ان کے ساتھ عقد ہوا، تو مجھ پر دَورِ جاہلیت پوری طرح

طاری تھا۔ مہر کی شرعی اہمیت دُور دُور بھی دماغ میں نہ تھی، ایک فرضی اور تمامتر افسانوی رقم، روپیوں کی بھی نہیں، سونے کی اشرفیوں کی، مہر میں قبول کر لی۔ ادائی کا امکان اس رقم کا تو کیا، اس کے ہزارویں، بلکہ دس ہزارویں حصّہ کا بھی نہ تھا، برسوں گزر گئے، یہاں تک کہ ۳۰ء آگیا، اور اب حضرت تھانوی کے فیضِ صحبت سے یہ پہلی بار سمجھ میں آیا کہ دَینِ مہر بھی ہر دوسرے قرضہ کی طرح ایک قرضِ واجب الادا ہے۔ اب گھبرا کے ایک دن تنہائی میں بیوی سے کہا کہ "دیکھو یہ تو بڑی ہی بُری بات ہوئی کہ اس بے اندازہ رقم کا اقرار بے سمجھے بوجھے کر لیا، خیر وہ تو جو ہونا تھا ہو چکا، اب علاج صرف یہ ہے کہ جتنی بھی رقم میری حیثیت کے لحاظ سے، تم میرے لئے ادا کرنا آسان سمجھو بے تکلف مجھ سے کہہ دو میں کھٹ سے رقم ادا کر دوں گا، لیکن ہاں یہ بھی سمجھ لو کہ اگر میرے جبر یا دباؤ سے تم نے کوئی رقم چھوڑ دی، پھر معافی کیا ہوئی، جو کچھ رقم رکھو محض اپنی خوشی و مرضی سے رکھو اور جواب ابھی نہیں دو چار دن میں سوچ سمجھ کر دو"——
اس نیک بخت نے جواب میں جو رقم بتائی، اور کون یقین کرے گا کہ لاکھوں سے گھٹ کر ہزاروں پر نہیں، سیکڑوں پر بھی نہیں، دہائیوں پر آگئیں، اور وہ بغیر کوئی تکلیف محسوس کئے الحمد للہ اسی وقت ادا کر دی گئی۔ سوچئے یہ احسان و ایثار کوئی معمولی ایثار رہا؟ اگر وہ ہزاروں پر اڑ جاتیں تو میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

(۲) ۲۹ء تھا، جب میں نے قصدِ حج بیت اللہ کا کیا، رقم اس وقت کی آمدنی کے لحاظ سے جو بڑی کتر بیونت کر کے میں نے جمع کی تھی، بس اتنی ہی تھی کہ بس میرے اکیلے دم کے لئے کافی تھی، ان سے ذکر آیا، تو فرطِ شوق سے خود بھی چلنے پر آمادہ ہو گئیں، سوال اسی پیسہ کا تھا، میرے کئے کوئی انتظام ان کے لئے نہ ہو پایا، خود ہی اپنے شوق کا، اور

اپنے ماں باپ کے ہاں سے لایا ہوا زیور، اپنی خوش حال بہن کے پاس امانت رکھا ان سے روپیہ قرض لیا اور اس سے اپنی آرزوئے حج پوری کی ——— زیور کی علٰحدگی کسی ہندوستانی مشرقی عورت کے لئے کوئی معمولی بات ہے؟

(۳) زیور کا شوق کس ہندوستانی عورت کو نہیں ہوتا؟ ان کو بھی معمول سے کم نہیں، شاید کچھ زیادہ ہی تھا، میری جو مالی حالت، شادی کے ۲۰، ۲۲ سال تک رہی اس کے لحاظ سے کوئی نیا زیور تو کیا بنوا دیتا، جو ان کے پاس میکے سے لایا ہوا تھا، اسی کے سلامت رہنے کے لالے پڑ گئے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوتی جا رہی ہیں اور کسی کے زیور بننے بنانے کا کوئی ڈول پڑتا دکھائی نہیں دیتا، تو اپنا زیور خود ہی اُتار ڈالا، اور سینت کر رکھ دیا، ناک، کان، گلا، بازو، پیر سب ننگے بوچے رہنے لگے، اور ہاتھ کی چوڑیاں، چھلّے، انگوٹھیاں بھی برائے نام رہ گئیں، زیور والیوں سے میل جول، انھیں کے ساتھ رہنا سہنا، خود اپنی بہن و بھاوج سب گہنے پاتے سے لدی ہوئی، اس حال میں اپنے کو اس زیب و زینت سے محروم کر دینا کوئی آسان مجاہدہ تھا ——— لڑکیاں جب بڑی ہو کر شادی کے قابل ہوئیں تو ان ہی کی عاقبت اندیشی کام آئی، اور اپنے ہی زیور سے انھوں نے چاروں کا کام چلایا۔

(۴) میں غصہ ور پیدائشی تھا، اور اب تو مرشد تھانوی رحمہ کے طفیل میں غصہ پھر بہت کم ہو گیا ہے، جوانی بھر نشہ خوب تیز رہا، لامذہبی کے نشے نے اسے اور دو آتشہ کر رکھا تھا، خدمتی لڑکا کوئی نہ کوئی ہمیشہ میرے پاس رہا اور اس بدمزاجی کا شکار قدرۃً سب سے زیادہ وہی تنہا رہا۔ ڈانٹ، مار کھاتا تھا، اور اتنی مجال کس میں تھی جو مجھے اس حال میں کچھ روک سکتا! ——— یہ جب سے بیاہ کر آئیں تو بس جب سے اتنی ہمت

انھیں نے شروع کی کہ ان مظلوموں کی طرف سے سینہ سپر ہونے لگیں، اور زبان سے تو خیر روکتیں ہی، بارہا ایسا ہوا کہ میرا ہاتھ پکڑ پکڑ لیا، اور ایک سے زائد بار ایسا بھی ہوا کہ اس کش مکش میں حائل ہو کر خود چوٹ چپیٹ کھا گئی ہیں ــــــ اس ظرف کی مثال ملنا بھی آسان نہیں۔

(۵) اور ایسا تو بارہا ہوا کہ اپنی سسرال کی بگڑی ہوئی بات جا کر انھوں نے اپنے میکہ والوں تک بنائی۔ ورنہ عام طور سے تو یہی ہوتا ہے کہ عورتیں اپنے میکہ جا کر اپنے شوہر کے غصہ گرمی یا تنگ دستی کا رونا جا کر روتی ہیں، یا ساس نندوں کے شکوے کرتی ہیں، ان کی روش اس کے برعکس رہی۔ شروع میں کئی سال تک تنگ دستی میرے ہاں اچھی خاصی رہی، انھوں نے اپنے والوں میں رپورٹ اس کے برعکس پہنچائی اسی طرح میرے غصہ، بدمزاجی کو زیادہ سے زیادہ ہلکا ہی کر کے اپنے والوں تک پہنچایا ــــــ یہ نہ کرتیں، تو دونوں سمدھیانوں میں بے لطفی و رنجش رکھی ہوئی تھی۔

یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کے ہاں سے بُلاوے کا پروانہ ہم دونوں میں سے پہلے کس کو اور کب ملتا ہے، اور دونوں میں سے آگے پیچھے کون جاتا ہے اگر کہیں ان کا بُلاوا پہلے آگیا[1] تو زندگی بھر ان کی یاد تڑپاتی رہے گی اور اگر کہیں یہ پیچھے رہ گئیں، تو عمر روتے ہی گزار دیں گی۔ شدید اختلاج قلب، عصبی کمزوری، دوسرے متعدد امراض کے

---

[1] ایسا ہی ہو کر رہا ۱۹۶۹ء میں یکایک انھوں نے قلب کے حملہ میں بانٹے میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئیں۔
(عبدالقوی)

باعث اب ان کا مزاج ان کے قابو میں بالکل نہیں رہا، بات بات پر بے حد غصہ، اور خود امراض کی پوٹ معذوریوں کا مجموعہ، زینہ پر چڑھنے کا تو سوال ہی نہیں، معمولی ہموار زمین پر بھی چند قدم سے زیادہ چلنے کے قابل نہیں، بھائی اور بہنوئی اور والدہ تینوں ان کے ناز بردار ادھر چند سال کے اندر اٹھ چکے ہیں، جب سے یہ اور اپنے کو تنہا اور بے سہارا محسوس کرنے لگی ہیں، میرے بعد گھر بھر میں ان سے کسی سے بنے گی کیونکر ـــــ اللہ اپنی رحمت کاملہ سے ان کی مدد ان کے حالات میں فرمائے۔

عقلی و دینی حیثیت سے سوچئے، تو موت ہر مومن و مومنہ کے حق میں نعمت و رحمت ہی ہے، لیکن کمزور اعصاب، کمزور دل، کمزور دماغ والا انسان، جذبات کا پتلا، عارضی مفارقت کی بھی تاب کہاں لا سکتا ہے ـــــ اس عالم میں پہنچ کر، دینوی نعمتوں میں مجھے تو سب سے زیادہ انھیں کی یاد ستائے گی۔ اور والدہ ماجدہ اور ہمشیر کا ذکر قصداً نہیں کرتا، کہ دونوں انشاء اللہ اپنے حق و استحقاق سے وہاں موجود ہی ملیں گی۔

باب (۲۵)

مضمون نگاری و صحافت نمبر (۱)

بیسویں صدی عیسوی کا آغاز تھا کہ بڑا زور آریہ سماجی پروپیگنڈے کا بندھا، خصوصاً پنجاب اور ہمارے صوبہ میں۔ اور اب کیا بندھا، یہ کہیے کہ ۲۰، ۲۵ سال قبل کا بندھتا چلا آرہا تھا۔ مسلمان اس سے اور قبل مقابلہ و مناظرہ مسیحی پادریوں کا کامیابی کے ساتھ کرچکے تھے، لیکن بدزبانی و دلآزاری اور بازاریت میں نمبر آریہ مناظرین کا پادریوں سے بھی بڑھا ہوا تھا، منہ میں جو کچھ بھی آتا، بس بے دھڑک یہ بک اٹھتے، غالباً ۱۹۰۲ء تھا کہ آریہ سماجیوں نے لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کے کسی سادہ مزاج مسلمان گریجویٹ کو پھانس کر آریہ بنا لیا تھا، خود اس سے اس کے وجوہ ارتداد پر ایک بڑی بدلگام کتاب ترک اسلام لکھا ڈالی[1]۔ ملک بھر کی فضا میں جیسے سنسنی پھیل گئی۔ اور جس مسلمان نے جہاں سنا، بس سناٹے میں آگیا۔ سال کی دوسری ششماہی تھی، اور میں سیتاپور ہائی اسکول کے چھٹے درجہ کا طالب علم تھا کہ کتاب ایک آریہ لڑکے کے پاس نظر آگئی۔ اور میں نے ایک سرسری نظر وہیں بیٹھے بیٹھے کر ڈالی (ہر کتاب پڑھ ڈالنے کا مرض تو

---

[1] یہ صاحب بعد کو بحمد اللہ از سر نو مسلمان ہو گئے۔

تھا ہی) پڑھتے ہی جیسے بخار چڑھ آیا۔ دس سال کا سن تھا، اس وقت یہ خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی شخص قرآن اور رسولؐ سے اس درجہ بدتمیزی اور دریدہ دہنی کر سکتا ہے۔ اسکول سے آیا تو خون کھول رہا تھا۔ اور بجائے اس کے کہ اندر جاکر حسب معمول ناشتہ کروں، سیدھا اپنے چچازاد بھائی (ان عبدالحلیم مرحوم کا ذکر اعزہ[1] کے سلسلہ میں شروع میں آچکا ہے) اور بڑے تاؤ کے ساتھ انھیں یہ سنایا، ان بچارہ نے بڑی تسلی دی اور بولے کہ "ذرا صبر و انتظار کرو، ہمارے علماء کیا بھلا چھوڑیں گے پنجاب ہی سے اسکے جواب انشاء اللہ ضرور نکلیں گے"۔ بات سچ نکلی، جواب ایک نہیں، کئی ایک، خوب خوب نکلے، ان میں سب سے زیادہ شہرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ترک اسلام کو حاصل ہوئی۔ اپنی خودگزشت کے سلسلے میں بات کہنے کی یہ ہے کہ جواب لکھنے کی تحریک خود اپنے دل میں بھی پیدا ہوئی، اور حسرت کے ساتھ سوچنے لگا کہ وہ کون دن ہوگا جب میں خود جواب لکھنے کے قابل ہوں گا۔

اخباروں، رسالوں کے نام سے اس سن میں بھی ناآشنا نہ تھا، پیسہ اخبار (ہفتہ وار) اودھ اخبار (روزنامہ) ریاض الاخبار (سہ روزہ) اودھ پنچ (لکھنؤ) ماہنامہ معارف (علی گڑھ) ماہنامہ دلگداز (لکھنؤ) علی گڑھ میگزین اور انگریزی کے ایڈوکیٹ (لکھنؤ) پنجاب آبزرور (لاہور) اور پانیر (الہ آباد) میں سے بعض تو گھر ہی میں آتے تھے، اور بعض کی شکلیں دیکھ چکا تھا سنہ ۱۹۰۳ء کا اخیر اور سنہ ۱۹۰۴ء کا شروع تھا کہ اردو اخباروں میں مضمون علی گڑھ کے "روشن خیالوں" کی طرف سے مسائل اسلام کی ترمیم و تصحیف میں چھپنے شروع ہو گئے، کسی نے کہا کہ عورتوں کو بھی پورے حق مرد کے برابر

ملنے چاہیئے کسی نے کہا کہ قانون وراثت قابل ترمیم ہے، ساری جائداد اولاد اکبر کو ملنا چاہیئے۔ کسی نے کہا قرآن کے احکام معاملات کو حصۂ عقائد سے بالکل الگ کر دیا جائے، اس وقت تجدد کی یہ پیش قدمی بڑی ہی "سنسنی خیز" اور صبر آزما تھیں، مذہبی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی، لیکن جواب لکھنے کی ہمت کم تر ہی کسی کو ہوئی۔ میں ساتویں کا طالب علم تھا، اور عمر کے گیارہویں بارہویں سال میں، جوں توں کر کے خود ہی جواب لکھا اور کسی فرضی نام سے، اودھ اخبار میں (کہ وہی اس وقت صوبہ کا سب سے نامور اُردو روزنامہ تھا) چھپنے کو بھیج دیا۔ اور اب کیا بیان ہو کہ کتنی خوشی اس وقت (۱۹۰۴ء میں) اپنا پہلا مضمون چھپا ہوا دیکھ کر ہوئی۔

اپنے نام سے نہ سہی، کسی فرضی نام سے سہی! ـــــ یہ مضمون لیا کہاں سے تھا؟ اسے بھی معاشن لیجئے، کچھ اپنے دماغ کی اپج تھوڑے ہی تھی، وقت کے اہل قلم میں سے ایک صاحب گورکھپور کے بڑے وکیل مولوی احسان اللہ عباسی چریا کوٹی تھے ان کی کتاب الاسلام مدافعت وانتصار اسلام میں نئی نئی نکلی تھی، اور خاصی مقبول و معروف تھی، بس اسی میں سے کہیں سے کچھ لیا، اور کہیں سے کچھ، اور کاٹ چھانٹ کر ایک مضمون تیار کر ڈالا! ـــــ اور چھپے ہوئے مضمون کی داد جب دوسروں کی زبان سے سنی، تو رگوں میں جیسے بلّیوں خون بڑھنے لگا، اور خوشی کی کوئی حد ہی نہ رہی

مضمون نام سے کیوں نہ لکھا، ایک تو فطری شرمیلا پن، دوسرے والد ماجد کا ڈر، کہ کہیں ڈانٹ پھٹکار نہ پڑ جائے کہ اپنا اسکولی کورس چھوڑ چھاڑ یہ مضمون نگاری کہاں سے شروع کر دی۔ راز کے واقف صرف وہی بھائی صاحب تھے جو پڑھائی میں کوئی تین سال آگے تھے۔

پہلے مضمون کا نکلنا تھا کہ جھجک مٹ گئی اور ہیاؤ کھل گیا، سال چھ مہینہ کے اندر اندر دوسرا نکلا، اور پھر تیسرا، سلسلہ قائم ہو گیا۔ زیادہ تر اسی اودھ اخبار میں، مضمون بالعموم "نیچریوں" کے رد میں ہوتے، والد صاحب مرحوم انجمن اسلامیہ سیتاپور کے صدر بھی تھے، ایک بار کسی نے ان پر اعتراض جڑ دیا میں نے اس کا بھی جواب ترڑ سے دیا اور جواب الجواب کا لمڈورا فریقین کی طرف سے ہفتوں مہینوں بڑھتا رہا۔ مضمون بدستور گمنام ہی رہتے اور لوگوں کو حیرت رہتی کہ لکھنے والا ہے کون؟ عجب تماشہ ہوتا کہ ادھر والد صاحب اور ان کے ہم نشین گمنام مضمون نگار کی داد دے رہے ہیں، اور ادھر میں کواڑ کی آڑ سے کان لگائے سن رہا ہوں، اور اندر ہی اندر نہال ہوا جا رہا ہوں! ـــــ ہائے، وہ کم سنی کی معصومانہ خوشیاں! آج کیا صورت اس کا کوئی شائبہ بھی لوٹا لانے کی ہے!

رفتہ رفتہ اپنے قلم کی قلمرو میں اودھ اخبار کے ساتھ ریاض الاخبار کو بھی شامل کر لیا۔ یہ سہ روزہ وقت کے مشہور شاعر ریاض خیرآبادی کا تھا، اور ایک محدود لیکن پڑھے لکھے اور ادبی حلقہ میں خوب مقبول تھا۔ اب اس میں بھی کبھی کبھی لکھنے لگا لیکن وہی گمنام۔ علی گڑھ میگزین کا نام اب علی گڑھ منتھلی ہو گیا تھا، بڑی شان سے نکل رہا تھا، اور مستقل طور پر میرے زیر مطالعہ تھا، اس کا کوئی مضمون اگر اپنے کو زیادہ پسند آ گیا، تو چٹ اسے اپنا کر کسی اخبار میں پیش کر دیا ـــــ یہ چوری نہ سہی، رہزنی نہ سہی، لیکن بہرحال قلمی چابک دستی اور صنعت گری بھی تو ایک فن ہے، اور اس فن کے سبق میں نے اسی سن میں پڑھ لئے تھے۔

اب ۵؁ء، ۶؁ء آگیا اور اب میں طالب علم اسی سیتاپور ہائی اسکول میں آٹھویں اور نویں درجہ کا تھا۔ اور بالکل بچکانی مضمون نویسی کی منزل سے نکل آیا تھا۔ مطالعہ بھی اب کچھ نہ کچھ وسیع ہی ہو چلا تھا۔ اور چچازاد بھائی عبدالحلیم مرحوم تو ۳؁ء کے اخیر میں ۲۹ سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور میں ان کے فیض تعلیم و تربیت سے محروم ہو چکا تھا، البتہ اب اسکول میں عربی کے استاد مولوی محمد عظمت اللہ فرنگی محلی (شارح نفحۃ الیمن) خوب مل گئے تھے، برتاؤ بالکل عزیزوں کا سا، انھوں نے مذہبی مضمون نگاری کی خوب چاٹ دلائی، خصوصاً آریوں کے مقابلہ میں (خود بھی شاید دوسروں کو مضمون لکھ کر دے دیتے تھے) اور مناظرانہ لٹریچر کا مطالعہ بھی اب خاصہ رہنے لگا تھا۔ ردِّ آریہ میں سب سے پیش پیش اس وقت مولانا ثناء اللہ امرت سری تھے، ترکِ اسلام اور حق پرکاش والے۔ ان سے اُتر کر پھر مرزا غلام احمد قادیانی (قبل دعوائے نبوت والے) اور ان کے رفیق خصوصی حکیم نورالدین تھے۔ سرمہ چشم آریہ اور نورالدین دو کتابوں کے نام اب تک یاد ہیں۔ امرت سر سے ایک پندرہ روزہ ضیا الاسلام نکلتا تھا، کئی مضمون اس کے لئے لکھے، منقولی مضامین کے لئے عین اسی زمانہ میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی کی جامع کتاب الحقوق والفرائض خوب ہاتھ آگئی تھی، آیتیں اور حدیثیں سب اسی میں مل جاتی تھیں۔

مضمون نگاری اب بھی فرضی ہی ناموں سے تھی۔ البتہ رازداری میں اب دو عزیز اور شریک ہو گئے تھے۔ ایک خالہ زاد بھائی حکیم صاحب، دوسرے چچازاد بھائی ڈاکٹر صاحب، دونوں کا ذکر عزیزوں کے ذیل میں آچکا ہے۔ مالی مدد بھی ان ہی دونوں سے حاصل کرتا، کبھی کوئی کتاب منگا لیتا، کبھی کوئی رسالہ اپنے نام جاری کرا لیتا، مذہبی

مطالعہ کے ساتھ اب ادبی مطالعہ بھی چل نکلا تھا۔ شروع شروع میں تو محمد حسین آزاد، نذیر احمد، سجاد حسین (اودھ پنچ) ساتھ ساتھ چل رہے تھے، شاعروں میں بے سمجھے بوجھے عقیدت اس وقت غالب اور حالی سے تھی۔ اخباری مطالعہ اب لکھنؤ کے انگریزی روزنامہ انڈین ڈیلی ٹیلی گراف کا بھی داخل معمول ہو گیا تھا۔ اور کئی اردو رسالے اردوئے معلّیٰ (حسرت موہانی) اور عصر جدید (خواجہ غلام الثقلین) وغیرہ ـــــ اخبار بینی کے شوق کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اسکول سے چھٹی پا کر جب سہ پہر کو آتا تو ناشتہ کے ساتھ ہی ساتھ آئی، ڈی، ٹی[۱] پر بھی گرتا۔ دوپہر کی ڈاک سے آیا ہوا ہوتا، رطب ویابس کی کیا تمیز تھی، بس جو بھی سامنے آگیا، پڑھ ڈالنا فرض ہو گیا، بہ قول شخصے

سجدہ سے ہمیں مطلب کعبہ ہو کہ بت خانہ

آہ بچپن کی نادانیاں، بے خبریاں، بدشعوریاں!

---

[۱] اخبار انڈین ڈیلی ٹیلی گراف کا مخفف جو اصل نام سے زیادہ مشہور تھا۔ (عبدالقوی)

باب (۲۶)

مضمون نگاری و صحافت نمبر (۲)

سنہ ۱۹۰۶ء میں خواجہ غلام الثقلین کا اثر غالب رہا، باوجود شیعہ و سُنّی کے ایک مشترک خاندان میں ہونے، اور خود شیعہ ہونے کے، ان کا نقطہ نظر شیعی نہ تھا، اسلامی تھا، علی گڑھ کے ایک بہترین گریجویٹ، اچھے بولنے والے، اچھے لکھنے والے، قوم و ملت کے ہر اصلاحی کام میں پیش پیش تھے، اور اب لکھنؤ میں وکالت کے ساتھ ساتھ ایک ماہ نامہ عصر جدید نکالتے تھے، موضوع، اصلاح معاشرت و تمدن۔ لکھنؤ میں اس وقت شیعہ سُنی مناظرہ و مناقشہ زوروں پر تھا۔ میں نے سنہ ۷ء میں ایک لمبا چوڑا مضمون، علی گڑھ کے ہفتہ وار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھا، حسب معمول کسی فرضی نام سے، اس کا چرچا خوب ہوا، اور عصر جدید نے اس کی داد دی، اس سے دل نے خوشی بلکہ فخر محسوس کیا، وقت کا ایک معروف و مقبول ہفتہ وار البشیر (اٹاوہ) تھا اس میں بھی کبھی کبھار لکھا ——— سنہ ۶ء تھا یا سنہ ۷ء کہ زیارت پہلے ماہ نامہ الندوہ کی ہوئی اور پھر اس کے بعد ہی صاحب الندوہ، مولانا شبلی کی۔ اور الندوہ نے دل و دماغ کو اتنا متاثر کیا کہ اور سارے رسالے جریدے نظر سے گر گئے، اور دل و جان سے شبلی کا کلمہ پڑھنے لگا، مولانا شبلی کا علم و فضل اسلوب زبان و طرز بیان سب دماغ پر چھا گئے۔ اور کہنا چاہیئے کہ علمی و قلمی زندگی کا

ایک نیا دَور اسی وقت شروع ہوگیا ـــــــ عملاً اب بھی میدان وہی اودھ اخبار وغیرہ کا قائم رہا، لیکن نظر کا معیار اب اس سے کہیں بلند ہوگیا تھا۔ انگریزی مضمون نگاری بھی کچھ اسی زمانہ سے شروع کردی تھی۔

میٹریکولیشن ۸ء میں پاس کرکے جولائی ۸ء سے لکھنؤ آگیا اور کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھنے لگا۔ انٹرمیڈیٹ کی پڑھائی دو سال کی تھی، لکھنؤ کی لائبریریوں سے فائدہ اٹھانے کا اب پورا موقع ملا۔ وکیل (امرت سر) اس وقت مسلمانوں کا ایک معزز و باوقار پرچہ تھا، دو لمبے مضمون اس کے لئے لکھے، اس میں وہ قسط وار چھپے، ایک تمامتر تاریخی تھا، مولانا شبلی کے رنگ اور ان ہی کے تتبع میں، محمود غزنوی کی حمایت و تبرّی میں، دوسرے کا موضوع طبی تھا، عنوان غذائے انسانی، دکھایا یہ تھا کہ مستند ڈاکٹروں کے اقوال سے استناد کرکے کہ انسان کی غذا محض سبزی و نباتات نہیں، بلکہ گوشت بھی ہے، جیسا کہ انسان کی آنتوں کی ساخت سے ظاہر ہو رہا ہے۔ دونوں مضمونوں کی دھوم مچ گئی، اچھے اچھوں نے داد دی اور مالک وکیل نے جو بڑے علم دوست تھے، ان سے متاثر ہوکر مجھ سے مراسلت شروع کردی، بعد کو یہ مقالے وکیل بک ایجنسی نے مستقل رسالے بنا کر چھاپ ڈالے۔ اور اب وہ رسالے کیا معنی، خود اسی بک ایجنسی ہی کو مرحوم ہوئے مدت دراز ہوچکی ہے، رہے نام اللہ کا ـــــــ زندگی میں شاید یہ پہلے مضمون تھے جو میں نے نام سے لکھے۔ نام چھپانے کی تہہ میں تو بڑا ڈر والد ماجد ہی کا تھا۔ وکیل ان کی نظر سے گزرتا نہ تھا، اس لئے اب یہ ڈر جاتا رہا تھا۔

اب ۰۹ء و ۱۰ء سمجھئے، کالج میں آنے کے چند ہی روز بعد عقائد و خیالات میں

تبدیلی شروع ہوئی اور ایمان و اسلام کی جگہ اب تشکیک و ارتیاب و ارتداد لینے لگا۔ اودھ اخبار میں مضمون نگاری اب بھی جاری رہی، لیکن بجائے مسلمانوں کے جذبات ملّی کی حمایت و ترجمانی کے "نیشنلسٹ" کانگریسی خیالات کی تائید میں۔ گمنامی اب پھر شروع ہوگئی۔ اور اب رازداری بھائی صاحب سے بھی ہونے لگی۔ لکھنؤ کے ایک نامی کانگریسی لیڈر بابو گنگا پرشاد ورما تھے، ان کے ہاتھ میں دو سہ روزہ اخبار تھے، انگریزی کا ایڈوکیٹ، اور اُردو کا ہندوستانی۔ ان کے ہاں جرمنی کے ڈاکٹر لوئی کوہینی کی ضخیم کتاب علاج بالماء اُردو میں علم شفا بخشی کے نام سے آئی، اور ایک دوست کے واسطے سے میرے پاس ریویو کے لئے پہونچی۔ اتنی بڑی کتاب رائے زنی کے لئے پہلی بار آئی، تبصرہ تفصیل سے کیا، اور خوب داد پائی۔

ذکر سنہ ۰۹ء و سنہ ۱۰ء کا چل رہا ہے نہ! مولانا شبلی کی علمیت و قابلیت کا سکّہ سنہ ۰۶ء و سنہ ۰۷ء میں دل پر بہت گہرا بیٹھا تھا، لیکن کالج میں آکر لا ادریت، تشکیک و لادینی کے سیلاب میں وہ زیادہ نہ ٹِک سکا۔ اُلٹی خود انھیں پر تنقید شروع کر دی سنہ ۱۰ء کا زمانہ تھا کہ ان کی کتاب الکلام پر ایک زبردست تنقید سوا سو صفحہ کی ضخامت کی ماہ نامہ الناظر کے لئے "ایک طالب علم" کے نام سے لکھی اور اس میں ۶، ۷ قسطوں میں نکلی، تنقید دراصل اسلامی بنیادی عقائد وجود باری، رسالت، وغیرہ پر تھی، صرف آڑ مولانا کے نام کی تھی، انداز چوں کہ شبلی ہی کا تھا یعنی بجائے مناظرانہ و مجادلانہ کے علمی و ادبی اس لیے شہرت بھی بہت ہوئی، اور نفس خوب موٹا ہوا۔ الناظر کے ایڈیٹر صاحب خود بڑے دین دار و عبادت گزار تھے، لیکن مولانا شبلی سے سخت ناخوش رہتے، اس لئے ایسے ملحدانہ مضمون کو بھی خوشی خوشی چھاپ دیا، رازداری اس مضمون کے لئے

خاص طور پر رہی، اور لوگ برابر اسی کھوج میں لگے رہے کہ لکھنے والا ہے کون!

۱۰ء و ۱۱ء میں توجہ اخباروں سے زیادہ کتابوں پر رہی، اور کئی سال تک رہی مضمون اور کتابوں پر تبصرے سب سے زیادہ الناظر کے لئے لکھے، اور پھر الہ آباد کے نئے شاندار و مصوّر رسالہ ادیب کے لئے لکھے، پھر نمبر العصر لکھنؤ کا بھی رہا۔ الناظر و ادیب نے کبھی کبھی نقد معاوضہ بھی پیش کیا ایک روپیہ فی صفحہ کے حساب سے، اس وقت کے معیار سے یہ خاصی اونچی شرح تھی، الندوہ وقت کا ممتاز ترین پرچہ تھا۔ دو سال قبل یہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی اس میں بھی کچھ لکھوں گا، لیکن ۱۱ء میں جب پرچہ مولانا سید سلیمان ندوی کے ہاتھ میں تھا تو انگریزی سے ایک آدھ مضمون کا ترجمہ کر کے اس میں دیا۔ الندوہ کے ذکر نے الہلال (کلکتہ) کو یاد دلا دیا ایک آدھ ترجمہ کسی ادبی رسالہ سے الندوہ کے لئے بھیجا تھا، اور وہاں سے الہلال میں پہنچ گیا۔ اور میری مرضی کے خلاف اس میں چھپ بھی گیا ـــــ اور اب آج کوئی یقین کرے یا نہ کرے ۱۱ء ۱۲ء میں الندوہ میں اپنا مضمون چھپ جانا باعث فخر سمجھتا تھا اور الہلال میں اس کے برعکس۔ مولانا ابوالکلام سے ذاتی تعلقات اس وقت بھی خاصے تھے، لیکن ان کے پرچہ الہلال کی علمی حیثیت کی کوئی وقعت دل میں نہ تھی۔ ایک ہی آدھ سال بعد خود صاحب الہلال سے الہلال میں نوک جھونک نفسیات کی ایک علمی اصطلاح سے متعلق شروع ہو گئی، اور افسوسناک بے لطفی پر ختم ہوئی۔

۱۲ء میں مولانا محمد علی جوہر کا اردو روزنامہ ہمدرد دہلی سے بڑی آب و تاب سے نکلا، شروع ۱۳ء تھا کہ میں نے "مل" کی "لبرٹی" کا ترجمہ کر کے ہمدرد کے لئے روانہ

کیا، ترجمے مولانا کو زیادہ پسند نہ تھے، کہتے تھے انگریزی ماخذوں کو سامنے رکھ کر بطور خود اردو میں لکھو ـــــ یکم اکتوبر ۱۶ء کو لکھنؤ بلکہ سارے یو، پی سے پہلا مسلم روزنامہ ہمدم کے نام سے سید جالب دہلوی کی ایڈیٹری میں نکلا۔ پہلے ہی نمبر میں میرا ایک لمبا مضمون نکلا، اور اس کے شروع میں ایک لمبا مقالۂ افتتاحیہ۔ جالب صاحب سے میرے مخلصانہ تعلقات بہت جلد قائم ہو گئے، اور سالہا سال یعنی ان مرحوم کی زندگی بھر قائم رہے ـــــ اور میرے مضمون چھوٹے بڑے کثرت سے اسی ہمدم میں نکلتے رہے، کبھی نام سے اور کبھی گمنام۔ ہمدم گویا میرا ہی پرچہ برسوں تک رہا۔

۱۸ء تھا کہ لکھنؤ سے وہاں کے مشہور شاعر برج نراتن چکبست نے ماہنامہ صبح امید نکالا، لیکن اس کے اصل کرتا دھرتا پنڈت کشن پرشاد کول تھے، ان کی دوستی میں مجھے بھی اس میں لکھنا پڑا ایک مضمون ہندو مصنفین اُردو خوب مقبول ہوا ـــــ ہاں ایک ذکر تو رہ ہی گیا، دو تین سال قبل غالباً ۱۵ء میں اطبار جھنوائی ٹولہ کے خاندان کے، ایک علیگ عبدالوالی بی، اے نے ایک رسالہ معلومات کے نام سے لکھنؤ سے نکالا، اور اس میں بھی میری چیزیں شائع ہوتی رہیں ـــــ اور خدا معلوم چھوٹے بڑے کتنے اور پرچوں میں بھی لکھا۔ اب سب کی تفصیل نہ یاد، نہ اب کسی کو اس سے دلچسپی۔

۱۶ء کا وسط تھا کہ مولانا شبلی کے قائم کئے ہوئے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے ماہنامہ معارف نکلا۔ علمی حیثیت سے اپنے سارے معاصرین سے ممتاز، آخر مولانا سید سلیمان ندوی ہی کی ادارت تھی۔ اس سے تعلق شروع ہی سے قائم ہو گیا۔ اور خدا معلوم کتنے نوٹ، کتنے تبصرے، اس کے لئے لکھے، کتنے ترجمے اس میں شائع کرائے

سنہ ۱۹ء سے اس تعلق نے ایک ضابطہ کی شکل اختیار کرلی، اور کچھ صفحے میرے لئے مخصوص ہو گئے، کچھ نقد معاوضہ بھی مقرر ہو گیا، اور یہ تعلق دو ڈھائی سال تک برقرار رہا، پھر جب سنہ ۲۰ء میں سید صاحب وفد خلافت میں یورپ تشریف لے گئے تو کئی مہینے تک رسالہ میرے ہی ہاتھ میں رہا۔ یہاں تک کہ سنہ ۵۰ء میں جب سید صاحب پاکستان ہجرت کر گئے تو پرچہ کی بزم ارادت کی صدارت بھی اس احقر کے حصہ میں آگئی، گو عملاً مختار کُل مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی ہی ہیں، ان کے کسی انتظام میں مداخلت کی ہمت کبھی نہ ہوئی۔

معارف ہی کے ذکر و ذیل میں یاد دو مرحوم پرچوں کی آجاتی ہے۔

(۱) ایک الاصلاح، جو مولوی مطلوب الرحمٰن ندوی نگرامی کی ادارت اور میری اور سید صاحب کی مشترک سرپرستی میں لکھنؤ سے نکلا تھا اور غالباً سنہ ۳۲ء میں چند نمبر نکل کر بند ہو گیا، دو ایک مقالے اس کے لئے لکھے۔

(۲) دوسرا الندوہ جو تیسری بار مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تحریک پر جاری ہوا اور چند ماہ زندہ رہا۔ اس میں بھی دو ایک مضمونوں کی نوبت آئی۔

جو ذاتی اور گہرا تعلق سید صاحب سے تھا، قریب قریب ایسا ہی بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے بھی تھا۔ سنہ ۲۱ء و سنہ ۲۲ء میں کلام اکبر الہ آبادی پر لمبا مقالہ ان کے رسالہ اُردو (اورنگ آباد) کے لئے لکھا اور بھی کچھ چیزیں اس میں نکلیں —— سنہ ۲۳ء میں صاحب الناظر مولوی ظفر الملک علوی حج کو گئے اور کئی مہینے تک کے لئے پرچہ میرے ہی ہاتھ میں چھوڑ گئے۔

اگست ۱۹ء میں انھوں نے میری نگرانی میں ایک اور ہفتہ وار لکھنؤ سے نکالا نام میری ہی تجویز پر حقیقت رکھا، اور باضابطہ ارادت کے لئے اپنے ایک عزیز، اور میرے عزیز شاگرد و جلیس انیس احمد عباسی کاکوروی، تازہ گریجویٹ کو رکھا۔ مدتوں اس کی ادارت کا بڑا حصہ، پس پردہ میں ہی انجام دیتا رہا، اور مولانا ابوالکلام وغیرہ پرچہ کی تحسین و حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ میری مداخلت ایڈیٹر صاحب کو گراں گزر رہی ہے تو ۲۰ء میں خود ہی خوش اسلوبی سے کنارہ کش ہوگیا ــــــ یہ کئی برس کا زمانہ ایسا گزرا کہ میں مصنف سے بڑھ کر مضمون نگار و صحافی تھا، خدا معلوم کتنے پرچوں کو پس پردہ میں ہی چلاتا رہا۔ علی گڑھ سے کانفرنس گزٹ (ماہانہ) نکلا۔ میرا مضمون اس میں، کیمبرج سے اُردو ماہانہ نوائے کیمبرج نکلا، میرا مضمون اس میں، زمانہ کان پور سے نکل رہا تھا، میرا مضمون اس میں۔ اور خدا معلوم کس کس میں!

اکتوبر ۲۴ء تھا کہ مولانا محمد علی نے کامریڈ اور ہمدرد کو دوبارہ دہلی سے نکالا، اور ہمدرد کی حد تک ہر صلاح و مشورے کے لئے مجھے طلب فرمایا گیا، اور چند روز ٹھہر کر واپس آگیا۔ پھر دریاباد سے اس کے لئے لکھ لکھ کر بھیجتا رہا، اور خدا معلوم کتنا اس کے لئے لکھ ڈالا، شذرے بھی، تبصرے بھی، مقالے بھی، مراسلے بھی، کتنے نام سے، اور کتنے گمنام۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے دہلی کا سفر لازم سا ہوگیا، کئی کئی دن ٹھہرتا، اور سب ایڈیٹروں سے گھل مل کر بہت کچھ سیکھ آتا، اور تھوڑا بہت سکھا بھی آتا۔ مئی ۲۸ء میں جب مولانا ذیابیطس کے علاج کے لئے ایک قدر شناس رئیس کے روپیہ سے یورپ جانے لگے، تو (کامریڈ تو ۲۶ء میں ہی بند ہوچکا تھا) طے کر چکے تھے کہ ہمدرد بھی بند کرکے جائیں گے،

آخر بڑے کہنے سُننے سے اس پر آمادہ ہو گئے کہ منیجری ایک اور صاحب کے سپرد، اور ایڈیٹوریل کی نگرانی میرے سپرد کر کے تشریف لے جائیں گے اور اب پرچہ گویا بالکل میرے ہاتھ میں تھا، دہلی جانا اب جلد جلد ہونے لگا، ایک مرتبہ خود ایکٹنگ ایڈیٹر کو دریاباد آنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ مولانا یورپ سے واپس آ گئے، جب بھی میرا نام پرچہ کی پیشانی پر بہ طور نگراں برابر نکلتا رہا۔ یہاں تک کہ اپریل ۲۹ء میں جب میں حج کو گیا ہوا تھا مولانا نے تنگ آ کر پرچہ ہی بند کر دیا۔ میری نگرانی کامیاب رہی یا ناکام، یہ ایک الگ سوال ہے بہر حال ایک روزنامہ سے متعلق عملی تجربے اچھے خاصے حاصل ہو گئے۔

باب (۲۷)

مضمون نگاری و صحافت نمبر (۳)

اخیر ۱۹۲۴ء تھا کہ دفتر الناظر میں ہم چار آدمی ایک ساتھ بیٹھے ہوتے ایک میں، دوسرے ظفر الملک علوی، تیسرے مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی، اور چوتھے مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی۔ چاروں میں اس وقت تک رشتۂ اخلاص و یگانگت قائم تھا، اور سیاسی اور دینی ہم خیالی بھی بڑی حد تک تھی، اور رائے یہ قرار پائی کہ اپنے خصوصی دینی، اصلاحی، اور اجتماعی (اور کسی حد تک سیاسی بھی) خیالات کے نشر و اشاعت کے لئے ایک مستقل ہفتہ وار سچ کے نام سے نکالا جائے۔ منیجر ظفر الملک صاحب علوی ہوں اور ایڈیٹری میں بھی پرچہ پر نام انھیں کا رہے، لیکن عملاً ادارت نگرامی اور دریابادی کے ہاتھ میں رہے (نگرامی سن میں مجھ سے چھوٹے، اخلاص و ایثار کے پتلے، اور میرے خصوصی مخلص تھے)، اور ملیح آبادی تو اب کلکتہ کے ہو چکے ہیں، وہ وہیں سے کچھ لکھ کر بھیجتے رہیں گے۔ دینی حیثیت سے ہم تینوں ندوی المسلک تھے (بعد کو کھلا کہ ملیح آبادی صاحب کا مسلک یہ نہ تھا) اور سیاسی حیثیت سے ہم تینوں خلافتی اور اس لئے کانگریسی تھے کہ (ملیح آبادی صاحب کا سیاسی مسلک بعد کو اس سے جداگانہ ثابت ہوا) زبان یہ طے پایا کہ حتی الامکان بالکل عام فہم و آسان رکھی جائے، عالمانہ یا علمی و ادبی طرز کی نہ ہو——

۱۹۲۵ء آیا تو پرچہ کا پہلا نمبر تیار تھا، اور یہ پہلی بار ہوا کہ میرا نام بہ حیثیت شریک ادارت پرچہ کی پیشانی پر آیا، ورنہ یوں پس پردہ ایڈیٹر تو کئی کئی پرچوں کا اب تک رہ چکا تھا۔

پرچہ نکلتے ہی خواص کی نظر میں معزز و مقبول ہو گیا، روزنامہ ہمدرد نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اس کی چیزیں نقل کر کر کے اُسے خوب اچھالا، دوسرے معاصرین نے بھی خوب نوازا، لیکن خریداری کچھ زیادہ نہ ہوئی۔ ظفر الملک صاحب کے ماہنامہ الناظر کا بھی یہی حال تھا اور چند ہی مہینے گزرے تھے کہ منیجر صاحب کی مالی ہمت جواب دے گئی، مجھے لکھا میں ان کی فریاد پر لکھنؤ آیا۔ اور دو تین صاحب سے مل ملا کر ڈھائی تین سو کی رقم وصول کر کے لایا، مگر جنھوں نے رقم عنایت کی انھیں بھی ظفر الملک صاحب کی خشکی و خشونت سے نالاں پایا۔ انھوں نے یہ رقم دی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ "یہ ہم آپ کو دیتے ہیں، ظفر الملک صاحب کو نہیں"۔ خیر میں نے رقم لا کر تو ظفر الملک صاحب کے ہاتھ میں دے دی، لیکن وہ ایڈیٹری سے بھی الگ ہو گئے۔ اور پرچہ پر ذمہ دار ایڈیٹر کی حیثیت سے میرا نام آ گیا۔ اس طرح زندگی میں پہلی بار اگست ۱۹۲۵ء میں ایڈیٹر بن گیا۔

چارج ہاتھ میں لیتے ہی میں نے ولایت کے دو تین اونچے پرچوں کو آرڈر بھیج دیا مانچسٹر گارجین، ویسٹ منسٹر گزٹ وغیرہ۔ اور کچھ نہ کچھ ان سے کام بھی لینا شروع کر دیا۔ اُردو پرچہ کے لئے یہ ایک نئی چیز تھی، مولانا نگرامی ایک فرشتہ صفت انسان تھے، ایسے متواضع، بے ریا، غم خور، صابر و شاکر انسان دیکھنے ہی میں کم آتے ہیں، اب تجربے سے ثابت ہوا کہ بہ حیثیت رفیق کار بھی بہترین تھے، لیکن اب ملت کی اس بے نصیبی کو کیا کہیئے کہ عمر ہی کچھ زیادہ نہیں لائے تھے ۱۹۲۶ء کی ابھی پہلی سہ ماہی چل رہی تھی کہ لکھنؤ

اور نگرام دونوں سے بہت دُور، شہر بہرائچ میں ایک روز مختصر سی علالت کے بعد نماز فجر سے سلام پھیرتے ہوئے اپنے مالک و مولا سے جا ملے۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ، اور اب سچ کی قلمی ادارتی ذمہ داری تمامتر میرے ہی اوپر آپڑی۔ ملیح آبادی کے کلکتہ چلے جانے کے باعث یوں بھی کچھ ہمارے کام کے زیادہ نہیں رہے تھے، اور پھر اپنے بعض اعتقادی و دینی خیالات، نیز تیز و تند عامیانہ زبان کے باعث میرا ساتھ بالکل ہی نہ دے سکے۔

سچ کو اپنی زندگی میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ آج اس سے جنگ ہے تو کل اُس سے۔ شروع شروع توجہ اصلاح رسوم و ردّ بدعات پر زیادہ تھی۔ اس لئے قدرۃً اہل بدعات بھی زیادہ ناخوش رہے، پھر بعض اور طبقوں کی بھی دشمنی مول لینا پڑی۔ پھر ستمبر ۲۵ء میں شریفی سعودی آویزش سرزمین حجاز میں شروع ہوئی سچ نے سعودیوں کی پہلے تو حمایت کی، اور کئی مہینہ بعد ان پر نکتہ چینی شروع کی، پہلے وہ وہابیوں کا ترجمان سمجھا گیا، بعد کو "بدعیتوں" کا پشت پناہ۔ ایک مدت تک شیعہ حضرات اسے اپنا حریف و معاند سمجھتے رہے، تجدد، "ترقی پسندی" کا مقابلہ وہ ہر محاذ پر کرتا رہا، اور جمود کا بھی حامی وہ کبھی نہ رہا، فتنۂ انکار حدیث کا مقابلہ اس نے مدتوں کیا اور ۳۱ء و ۳۲ء میں تو اس نے نیاز فتح پوری کے الحاد اور فتنۂ نگار کے مقابلہ کے لئے مہینوں اپنے کو وقف رکھا۔ نظریات خلافت کی بھی تبلیغ وہ مدت دراز تک کرتا رہا، حالاں کہ خود تحریک خلافت ۲۵ء ہی میں بالکل مردہ و بے جان ہو چکی تھی ــــــــ زبان شروع شروع میں "عوامیت" کی سطح پر قصداً لے آئی گئی تھی، یہاں تک کہ اس کی اردو پر لوگوں

نے پھبتی "کانگریسی اُردو" کی کس ڈالی، بعد کی زبان شستہ و نستعلیق اختیار کرلی گئی ۔

جولائی ۳۰ء میں صوبہ سرکار نے سچ سے ضمانت طلب کی اور پرچہ کو مجبوراً کئی مہینوں کے لئے بند رکھنا پڑا۔ نومبر سے پرچہ از سرنو جاری ہوا، اور جنوری ۳۱ء سے مدتوں سردار ملت، مولانا محمد علیؒ کا ماتم ہوتا رہا۔

۳۲ء تھا کہ میں نے بڑے حیص بیص تامل و تذبذب کے بعد قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ و تفسیر کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور چند مہینوں کے تجربہ کے بعد نظر آنے لگا کہ اللہ کا کلام کسی اور کام کی شرکت کا روادار نہیں، خدمت ایسی ہے کہ وقت پورے کا پورا چاہتی ہے چنانچہ اخیر ۳۲ء میں پرچہ کے التوا کا اعلان مجبوراً کرنا پڑا ـــــ ایڈیٹری کا کام تمامتر "اعزازی" تھا۔ مالی نفع مجھے ایک پیسہ کا بھی نہ تھا۔ آمدنی ساری کی ساری ظفر الملک صاحب کے پاس جاتی تھی اور آمدنی دوران التوا میں رُکی نہیں۔ اسی طرح برابر جاری رہی، لیکن سال بھر بعد جب ۳۳ء میں میں پرچہ دوبارہ نکالنے پر آمادہ ہوا، تو اب دفعتہً یہ معلوم ہوا کہ ظفر الملک صاحب اس پر آمادہ نہیں، یہ انکار، ہر امید و توقع کے خلاف میرے لئے ایک حادثہ سے کم نہ تھا، دنگ رہ گیا، مگر اب کرتا تو کیا کرتا۔ پہلے تو خود انھیں کو خط پر خط لکھے، پھر چُن چُن کر انھیں کے عزیزوں، دوستوں کو درمیان میں ڈال کر حکم بنانا چاہا، ساری کوششیں ناکام رہیں۔ بالآخر مولانا عنایت اللہ مرحوم فرنگی محلی (صدر المدرسین مدرسہ نظامیہ) حکم بننے پر آمادہ ہوگئے، تو ان کے مواجہ میں ظفر الملک صاحب کی زبان سے پہلی بار اس کا علم ہوا کہ پرچہ کی ملکیت اور اختیار میں شرکت الگ رہی پرچہ کا نام تک وہ اپنی مِلک سمجھ رہے ہیں، اور مجھے اس نام کی بھی اجازت دینے کو تیار نہیں حکم نے فیصلہ یہ سنایا کہ میں سچ کے نام کا بھی خیال چھوڑ کر اب بالکل دوسرا پرچہ نئے

نام سے نکالوں اور یہ نام بھی انھیں مرحوم و مغفور نے صدق تجویز کر دیا۔

مجھ میں پرچہ چلانے کی کوئی انتظامی صلاحیت بھلا کہاں تھی، اور ظفر الملک صاحب میری اس کمزوری سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ بہرحال اب نئے مینجر اور پبلشر کی تلاش شروع ہوئی، اور اتفاق سے جلد ہی ایک دوسرے کاکوروی صاحب خوش خوش اس کام کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اپنی برادری کے ہوتے تھے، اور کاکوری کے عباسی خاندان کے تھے، بہ حیثیت ایک جونیر یا خُرد کے سالہا سال سے مجھ سے مل رہے تھے۔ خود بھی اپنا ایک اخبار حق کے نام سے نکال رہے تھے، ایک بڑے پریس کے مالک تھے، اور بڑی بات یہ کہ میرے لکھنوی مکان خاتون منزل سے بالکل متصل مرشد آباد ہاؤس میں اپنا کاروبار رکھتے تھے، انھوں نے خود ہی مجھے نفع میں دس فی صدی کا شریک کیا، اور پہلا پرچہ مئی ۱۹۳۵ء میں نکل آیا۔

پہلا پرچہ نہایت ہی بدنما، اور تکلیف دہ حد تک بدزیب نکلا، ظاہری زیب و زینت کے معاملہ میں تو میں خود بے حس واقع ہوا ہوں، لیکن یہ نمبر اس حد تک سے بھی گیا گزرا ہوا تھا، کٹ کر رہ گیا۔ اب جہاں تک یاد پڑتا ہے، پرانے خریداروں کا رجسٹر بھی ظفر الملک صاحب کے یہاں سے نہیں ملا تھا۔ خیر پرچہ محض اندازے سے روانہ کیا گیا، پرچہ کی ظاہری صورت تو رفتہ رفتہ ٹھیک ہو گئی، البتہ معاملاتی تعلق کی تفصیل اب کیا بیان کی جائے اور بلا ضرورت پڑھنے والوں کا وقت کیوں ضائع کیا جائے۔ بارہا غیرت و خودداری کا خون کر کر کے مجھے اپیل خریداروں کے نام شائع کرنا پڑی، خیر ۱۴ سال کی مدت لشتم پشتم کسی طرح کٹ گئی اور ستمبر ۱۹۵۰ء میں یہ حد سے زیادہ تنی ہوئی کمان آخر

ٹوٹ کر رہی ۔۔۔۔۔۔ میں اب پرچہ کی طرف سے مایوس اور ہمت شکستہ ہو چکا تھا، لیکن گھر کے رہے ہوئے میاں درگاہی عرف محمد معین نے (جن کی تعلیم اردو کی معمولی نوشت و خواند تک محدود ہے) نے کمال اخلاص مندی کے ساتھ ہمت دلائی کہ جہاں تک پرچہ کی چھپائی، کٹائی، روانگی وغیرہ دفتری خانہ کے انتظامات کا تعلق ہے اس کی پوری ذمہ داری میں خود لیتا ہوں۔ مزید تائید علی احمد سندیلوی کی طرف سے ہوئی اور حساب کتاب رکھنے کی ذمّہ داری کے لئے انھوں نے اپنے کو پیش کیا، یہ عزیز نہیں لیکن مخلصانہ تعلقات اور اپنی نیاز مندی میں کسی عزیز سے کم بھی نہیں ہیں، اور فہم سلیم کے ایک پیکر مجسم ہیں، خاتون منزل ہی میں رہتے ہیں، اور محکمۂ صحت کے ایک دفتر میں ملازم ہیں، ان دونوں کی مستعدی اور ہمت آموزی نے مجھ میں بھی از سر نو جان ڈال دی آخر اپنے بڑے بھتیجے اور داماد حکیم حافظ عبدالقوی بی، اے کو منیجر اور اسسٹنٹ ایڈیٹر دونوں بنا کر پرچہ از سر نو نکالنا طے کر لیا۔ یہ روزنامہ تنویر (لکھنؤ) میں کام کر کے اخباری تجربہ بھی رکھتے تھے، اور اس وقت بے روزگار بھی تھے، ہاشم سلمہ نے بھی سفارش کی کہ منیجری کا کام یہ چلا لیں گے۔

نئے پرچہ کے نام کا سوال قانونی حیثیت سے پھر پیدا ہوا، اور اب مہتمم صاحب صدق مرحوم نے بھی صدق کے نام کو اپنی ملکیت بتایا، مجبوراً ضابطہ کا نام صدق "جدید" رکھنا پڑا، اور پہلا پرچہ چند ہی ہفتہ کے اندر شروع دسمبر ۵۰ء میں نکل گیا۔ دفتر سابق سے کاغذ وغیرہ کسی قسم کی کوئی چیز نہ ملی۔

برگردن او بماند و بر ما بہ گزشت!

پڑھنے والے اگر یہ بدگمانی کریں تو کیا بیجا ہے کہ یہ دریابادی نام کے مولانا تو بڑے

چندہ خور واقع ہوئے ہیں، اخبار خواہ مخواہ بند کر دیتے ہیں اور پرانے خریداروں کا چندہ ہضم کر جاتے ہیں! ـــــــ اصل حقیقت روزِ حشر کھلے گی، جب یہ دونوں مینجر صاحبان مجرم کی حیثیت سے میرے سامنے آئیں گے، ان شاء اللہ اس وقت انھیں معاف کر دوں گا اس طمع سے کہ جن بندوں کا میں خطاوار ہوں، وہ مجھے معاف کر دیں۔

ان سطور کی تحریر کے وقت جون ۱۹۶۷ء ہے، پرچہ بحمداللہ برابر کامیابی سے نکل رہا ہے، اور اس میں دخل اللہ کی کارسازی کے بعد حکیم عبدالقوی، اور علی احمد اور درگاہی محمد معین کی مستعدی و حسن نیت کا ہے۔ کچھ اہل خیر ایسے بھی ہیں جو ۲۰۰ کی رقم یک مشت دے کر دوامی خریدار ہو گئے ہیں، ایسوں کی تعداد آٹھ، دس ہو گی باقی عام خریداروں میں ایک تہائی خریدار پاکستان کے ہیں، اور وہاں سے قیمت کی تقریباً عدم وصولی کے باوجود، پرچہ بہرحال ماشاء اللہ یہی نہیں کہ اپنا خرچ پورا نکال لیتا ہے بلکہ کچھ نہ کچھ بچت بھی سالانہ ہوتی رہتی ہے، ۱۵ سو کی تعداد میں چھپتا ہے، پاکستان کے علاوہ پرچہ کی کچھ کاپیاں دوسرے مشرقی ملکوں (عراق، حجاز، مصر، لیبیا، کویت، سیلون، برما، افریقہ وغیرہ) میں جاتی ہیں، بلکہ بعض برطانیہ، فرانس، کناڈا، اور امریکا بھی، پرچہ سے اپنے ظرف و بساط کے مطابق آمدنی بھی اچھی خاصی ہو جاتی ہے، اور اس کی تحریریں نقل اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ بس اللہ کے فضل خصوصی کا قائل ہو جانا پڑتا ہے۔

پرچہ کی خدمات پر اپنے قلم سے تبصرہ کر ہی کیا سکتا ہوں، دین، اور پھر ضمناً علم، ادب، صحافت کی خدمت بُری بھلی جو کچھ بھی اس ۴۰، ۴۲ سال میں بن پڑی، اس کا فیصلہ خود ناظرین پرچہ کے سو پچاس نمبر پڑھنے کے بعد کر سکتے ہیں۔ البتہ اپنی طرف سے

ٹوٹ کر رہی ــــ میں اب پرچہ کی طرف سے مایوس اور ہمت شکستہ ہو چکا تھا، لیکن گھر کے رہے ہوئے میاں درگاہی عرف محمد معین نے (جن کی تعلیم اردو کی معمولی نوشت و خواند تک محدود ہے) نے کمال اخلاص مندی کے ساتھ ہمت دلائی کہ جہاں تک پرچہ کی چھپائی، کتائی، روانگی وغیرہ دفتری خانہ کے انتظامات کا تعلق ہے اس کی پوری ذمہ داری میں خود لیتا ہوں۔ مزید تائید علی احمد سندیلوی کی طرف سے ہوئی اور حساب کتاب رکھنے کی ذمّہ داری کے لئے انھوں نے اپنے کو پیش کیا، یہ عزیز نہیں لیکن مخلصانہ تعلقات اور اپنی نیاز مندی میں کسی عزیز سے کم بھی نہیں ہیں، اور فہم سلیم کے ایک پیکر مجسم ہیں، خاتون منزل ہی میں رہتے ہیں، اور محکمۂ صحت کے ایک دفتر میں ملازم ہیں، ان دونوں کی مستعدی اور ہمت آموزی نے مجھ میں بھی از سر نو جان ڈال دی آخر اپنے بڑے بھتیجے اور داماد حکیم حافظ عبدالقوی بی، اے کو منیجر اور اسسٹنٹ ایڈیٹر دونوں بنا کر پرچہ از سر نو نکالنا طے کر لیا۔ یہ روزنامہ تنویر (لکھنؤ) میں کام کر کے اخباری تجربہ بھی رکھتے تھے، اور اس وقت بے روزگار تھے بھی، ہاشم سلمہٗ نے بھی سفارش کی کہ منیجری کا کام یہ چلا لیں گے۔

نئے پرچہ کے نام کا سوال قانونی حیثیت سے پھر پیدا ہوا، اور اب مہتمم صاحب صدق مرحوم نے بھی صدق کے نام کو اپنی ملکیت بتایا، مجبوراً ضابطہ کا نام صدق "جدید" رکھنا پڑا، اور پہلا پرچہ چند ہی ہفتہ کے اندر شروع دسمبر ۵۰ء میں نکل گیا۔ دفتر سابق سے کاغذ وغیرہ کسی قسم کی کوئی چیز نہ ملی۔

برگردن او بماند و برما یہ گزشت!

پڑھنے والے اگر یہ بدگمانی کریں تو کیا بیجا ہے کہ یہ دریابادی نام کے مولانا تو بڑے

چندہ خور واقع ہوئے ہیں، اخبار خواہ مخواہ بند کر دیتے ہیں اور پرانے خریداروں کا چندہ ہضم کر جاتے ہیں! —— اصل حقیقت روز حشر کھلے گی، جب یہ دونوں مینجر صاحبان مجرم کی حیثیت سے میرے سامنے آئیں گے، ان شاء اللہ اس وقت انھیں معاف کر دوں گا اس طمع سے کہ جن بندوں کا میں خطاوار ہوں، وہ مجھے معاف کر دیں۔

ان سطور کی تحریر کے وقت جون ۱۹۶۷ء ہے، پرچہ بحمد اللہ برابر کامیابی سے نکل رہا ہے، اور اس میں دخل اللہ کی کارسازی کے بعد حکیم عبدالقوی، اور علی احمد اور درگاہی محمد معین کی مستعدی و حسن نیت کا ہے۔ کچھ اہل خیر ایسے بھی ہیں جو ۲۰۰ کی رقم یک مشت دے کر دوامی خریدار ہو گئے ہیں، ایسوں کی تعداد آٹھ، دس ہو گی باقی عام خریداروں میں ایک تہائی خریدار پاکستان کے ہیں، اور وہاں سے قیمت کی تقریباً عدم وصولی کے باوجود، پرچہ بہر حال ماشاء اللہ یہی نہیں کہ اپنا خرچ پورا نکال لیتا ہے بلکہ کچھ نہ کچھ بچت بھی سالانہ ہوتی رہتی ہے، ۱۵ سو کی تعداد میں چھپتا ہے، پاکستان کے علاوہ پرچہ کی کچھ کاپیاں دوسرے مشرقی ملکوں (عراق، حجاز، مصر، لیبیا، کویت، سیلون، برما، افریقہ وغیرہ) میں جاتی ہیں، بلکہ بعض برطانیہ، فرانس، کناڈا، اور امریکا بھی، پرچہ سے اپنے ظرف و بساط کے مطابق آمدنی بھی اچھی خاصی ہو جاتی ہے، اور اس کی تحریریں نقل اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ بس اللہ کے فضل خصوصی کا قائل ہو جانا پڑتا ہے۔

پرچہ کی خدمات پر اپنے قلم سے تبصرہ کر ہی کیا سکتا ہوں، دین، اور پھر ضمناً علم، ادب، صحافت کی خدمت بُری بھلی جو کچھ بھی اس ۴۰، ۴۲ سال میں بن پڑی، اس کا فیصلہ خود ناظرین پرچہ کے سو پچاس نمبر پڑھنے کے بعد کر سکتے ہیں۔ البتہ اپنی طرف سے

یہاں صرف اتنی گزارش کی اجازت چاہتا ہوں کہ

(۱) واقعات حاضرہ پر اس طرزِ خاص سے تبصرہ کرنا، کہ پہلے نفس خبر، بجنسہ نقل کر دی اور پھر اس پر مختصر، جنچے تُلے لفظوں میں کچھ لکھ لکھا دیا۔ صدق و سچ سے پہلے شاید اُردو کی دُنیائے صحافت کے لئے نامعلوم تھا۔

(۲) صدق نے طنز و تعریض کا استعمال بے شک کثرت سے کیا ہے، لیکن اپنی والی کوشش ہمیشہ ذاتیات کا پہلو بچا کر، اور صرف پبلک زندگی کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر۔

(۳) مُروت اور شخصی تعلقات سے یہ تو نہیں کہ سرے سے اثر قبول ہی نہیں کیا گیا، البتہ اس تاثر کو ہمیشہ حدود کے اندر رکھا گیا ہے اور اسے پبلک فریضۂ احتساب پر غالب نہیں آنے دیا گیا۔

(۴) ہر حق کو حق اور ہر باطل کو باطل بلا کسی پارٹی کے خیال اور بغیر کسی تعصب و تحزب کے پیش کیا اور جہاں کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ ہوئی تو اس سے سکوت ہی اختیار کر لیا گیا۔

(۵) اظہار رائے اور جنبش قلم میں، یہ کس منہ سے کہوں کہ کبھی بھی ذاتی جذبات سے متاثر نہیں ہوا ہوں، جہاں کہیں بھی اس قسم کی لغزشیں ہوں، اللہ سے دعا ہے کہ اسے معاف فرمائے، اور ناظرین سے عرض ہے کہ وہ اس پر آمین کہیں۔

پرچہ سرکاری حلقوں میں قدرۃً غیر مقبول بلکہ نیم مردود رہا ہے جیسا کہ انگریزوں کے زمانے میں بھی رہ چکا ہے۔ تنبیہ اتنے لمبے عرصے میں دو تین بار مل چکی ہے، پھر بھی حکام اس کی سنجیدگی کے قائل ہیں۔

خریداروں کی بہت بڑی اکثریت ظاہر ہے کہ مسلمان ہی ہے، پھر بھی کچھ نہ کچھ

ہندو بھی اس کے خریدار ہیں، اور مسلمانوں میں بھی خریداری اہل سنت تک محدود نہیں، دوسرے فرقوں میں بھی اس کی کسی قدر رسائی ہے۔

ملک اور بیرون ملک کے رسالوں اور اخباروں کی طرف سے فرمائش مضمون کی یا کم سے کم پیام کی اس کثرت سے آتی رہتی ہیں کہ اگر سب کی تعمیل کرنا چاہوں تو اپنے کام کی طرف سے پھر ہاتھ بھی دھو بیٹھوں، ۴۰، ۴۲ سال کی زندگی میں پرچہ کی سیاسی پالیسی میں تبدیلی ناگزیر تھی ۲۸ء کے ختم تک تو وہ کانگریسی رہا، جب سے مولانا محمد علی رح کانگریس سے بیزار ہوکر الگ ہوئے، سچ نے بھی اس سے کنارہ کشی شروع کی، یہاں تک کہ چند سال میں صدق اس سے بالکل الگ ہوگیا اور پاکستان کا منصوبہ جب بروئے کار آیا تو اس حد تک مسلم لیگ کا بھی ہمنوا رہا کہ مسلمانوں کو بھی اپنے وطن بنانے کا حق خود اختیاری حاصل رہے ـــــ سیاسی جماعتوں میں صرف خلافت کمیٹی کا ہم نوا و ہم خیال پوری حد تک رہا تھا۔

پرچہ کی ارادی، شعوری، دانستہ کوشش ہر دَور میں دین کو بلند کرنے کی رہی، اور اس کی دعوت ہمیشہ خیر ہی کی رہی، لیکن خدا معلوم کتنی بار اس کا نکالنے والا اور چلانے والا غصہ وطمع یا کسی اور شہوت نفس کا شکار ہوکر خود ہی پستیوں میں چلا گیا! اور خیر کی دعوت میں شر کی آمیزش ہوتی گئی۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیأت اعمالنا۔

باب (۲۸)

انگریزی مضمون نگاری

پوری طرح تو یاد نہیں کہ انگریزی مراسلہ نگاری کی ابتدا رکس سنہ اور کس سن میں ہوئی۔ اغلب یہ ہے کہ عمر کے ۱۴ ویں ۱۵ ویں سال یعنی ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء سے شروع ہوئی ہو، جب نویں درجہ کا طالب علم تھا۔ پہلا مراسلہ یقیناً کسی جلسہ کی کارروائی سے متعلق لکھا ہوگا، لکھنؤ کے آئی، ڈی، ٹی (انڈین ڈیلی ٹیلی گراف) کو جلسہ کی کارروائیاں بڑے بھائی صاحب نے ہی بھیجنا شروع کی تھیں۔ آئی، ڈی، ٹی کو۔ وہ انٹرمیڈیٹ میں تھے، لکھنؤ سے سیتاپور اکثر آتے رہتے تھے، انھیں کو دیکھ کر اپنے کو بھی شوق پیدا ہوا۔ انگریزی اخبار کچھ نہ کچھ پڑھنے تو غالباً چھٹے ساتویں سے شروع کر دیئے تھے، اور نویں درجہ تک پہنچتے پہنچتے تو آئی، ڈی، ٹی کا مستقل پڑھنے والا ہو گیا تھا۔ دسویں میں پہنچ کر ہیڈ ماسٹر کو ایک لمبی درخواست انگریزی میں بہ شکل میموریل لکھ کر دی تھی، کہ مسلمان لڑکے جو جمعہ کی نماز کے لئے جاتے ہیں، دوسری میٹنگ میں غیر حاضر نہ لکھے جائیں۔

کالج میں آکر پہلا مراسلہ ریلوے کی شکایت میں لکھا، اپنے ایک ہندو ساتھی کے فرضی نام سے۔ اور بعد کو اپنی اس جعل سازی پر مدتوں نادم و پشیماں رہا۔ اس وقت کے پانیر (الہ آباد) کے معیار کا کیا کہنا، اس کے کسی کالم میں گنجائش کہاں نکل سکتی ہم ایسوں

کی رسائی تو بس آئی، ڈی، ٹی ہی تک تھی، اس وقت وہ بھی انگریزی ایڈیٹر کے ہاتھ میں تھا۔ سنہ ۱۹۱۱ء تھا اور میں بی اے کے پہلے سال کا طالب علم کہ آل انڈیا طبی اینڈ ویدک کانفرنس (دہلی) کا اجلاس لکھنؤ میں ہونے والا تھا، اور پیشہ ورانہ چشمکوں کی بنا پر بڑے معرکہ کے ساتھ، شہر گویا دو فریقوں میں بٹ گیا۔ میں فریقِ موافق کے ساتھ تھا، اسکے لیڈر حکیم عبدالولی صاحب تھے، اور شررؔ صاحب بھی اسی پارٹی کے ساتھ تھے، میں نے طبِّ یونانی کی اہمیت اور کانفرنس کی تائید میں ایک خاصا لمبا مضمون انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا وغیرہ کی مدد سے تیار کیا۔ (اور شاید دوسرا بھی لکھا) خوب واہ واہ ہوئی۔ اب مضمون نگاری اپنے نام سے کرنے لگا تھا، چھوٹے بڑے اور بھی کچھ مراسلے اور مضمون لکھے تفصیل نہ اب یاد، نہ کسی کو اب اس سے دلچسپی ـــــــ کالج میں مضمون نویسی ESSAY WRITING تھوڑا بہت نام پاتے ہوئے تھے۔ جنرل انگلش کے پرچہ میں اُستاد انگریزی پروفیسر ایم بی کیمرن نے ایک بار ۸۲ فی صدی نمبر دیئے۔

ابھی انٹرمیڈیٹ میں تھا اور سنہ ۱۹۱۰ء تھا کہ اس وقت کے نامور برطانوی ہفتہ وار سٹرڈے ریویو میں نباتات خوری VEGITERINISM پر بحث چھڑی، ہمت کر کے دو ایک مراسلے میں نے بھی لکھ بھیجے اور وہ چھپ گئے، اب میرے فخر و پندار کا کیا کہنا تھا، اس وقت کسی ولایتی پرچہ میں دو سطریں بھی چھپ جانا ایک غیر معمولی امتیاز تھا، پرچہ کالج میں آتا تھا، اور ریڈنگ روم کی میز پر رکھا تھا، جی بے اختیار یہ چاہتا کہ جو بھی آئے اس کی نظر مضمون پر پڑے! ـــــــ دو سال بعد جب بی اے کر چکا یا کرنے کو تھا لندن کے ایک نامور علمی و سائنسی ہفتہ وار کو ایک مراسلہ نفسیات کے کسی موضوع پر لکھ کر بھیجا، اور وہ بھی چھپ گیا اور پروفیسر میک ڈوگل نے اس پر دوسرے نمبر میں

نوازش کی. اب میرے فخر و افتخار کا کیا پوچھنا تھا، دِل میں اِتراتا کہ کسی طالب علم کا ذکر نہیں! کوئی پروفیسر صاحب تو اپنا مضمون اس پرچہ میں چھپوا کر دیکھیں! ــــ آہ، وُہ کم سنی کی تعلّیاں، خود پسندیاں خود پرستیاں!

جون ۱۹۱۲ء میں بی اے کیا، اور بمبئی کے معیاری ماہ نامہ ایسٹ اینڈ ویسٹ (EAST AND WEST) کے اکتوبر نمبر میں ایک مضمون گوشت خوری کی سائنسی حمایت میں A PSYCHO-ETHICAL ASPECT OF FLESH EATING کے عنوان سے لکھا، مدتیں اسی تمنا میں بسر کی تھیں کہ کبھی اپنا نام بھی اس کے صفحات پر آسکے، جب وہ دن آیا، تو فخر و مسرت کی کتنی دولت بے پایاں اپنے ساتھ لایا! ــــ اب ہیاؤ کھُل گیا تھا، اور برابر کئی سال تک انگریزی مضمون نگاری کرتا رہا، مختلف اخباروں، رسالوں میں، مثلاً سہ روزہ ایڈوکیٹ (لکھنؤ) اور مسلم ہیرلڈ (الہ آباد) روزنامہ لیڈر (الہ آباد) بمبئی کرانیکل (بمبئی) اور ماہ نامہ ویدک میگزین (دہرہ دون) انڈین ریویو (مدراس)، تھیا سوفسٹ (مدراس) اور ہفتہ وار کامن ویل (مدراس) میں۔

عنوان بھی فلسفہ و نفسیات سے لے کر سیاسیات اور ڈرامے تک ہوا کرتے مثلاً:

(1) THE GERMAN CONCEPTION OF THE ABSOLUTE

(2) MILL VS SPENCER: TEST OF TRUTH

(3) PSYCHOLOGICAL SUICIDE OF THE KAISER

(4) PROF MCDAVGALL ON PLEASURE AND PAIN

(5) EXAMINATIAN SYSTEM EXAMINED

(6) FOUNDATIONS OF PEACE

یہ سلسلہ کوئی ۱۹۱۹ء تک قائم رہا، اسی درمیان ۱۸ء سے کلکتہ کے معروف و بلند پایہ ماڈرن ریویو کے لئے مستقل لکھنا شروع کر دیا۔ عموماً کتابوں پر تبصرہ نگاری کی صورت میں .A.M کے دستخط کے ساتھ، تبصرے بیسیوں لکھ ڈالے، کبھی کبھی کوئی مضمون و مقالہ بھی، مثلاً:

(1) THE PLACE OF URDU IN INDIAN VERNACULAR

(2) INDIAN EDUCATIONAL RECONSTRUCTION

(3) SATYAGRAH AND ISLAM

اس آخری مضمون میں گاندھی جی کے فلسفۂ ستیا گرہ کا ماخذ قرآن مجید کو دکھلایا تھا۔ اس کے سالہا سال بعد ۱۹۵۳ء میں اس مقالہ کا حوالہ فرانس کے مستشرق پروفیسر میسینو MESSIGNOU نے اپنے خطبہ میں دیا، ملاحظہ ہو۔

GANDHI- OUTLOOK AND HIS TEACHINGS

شائع کردہ وزارت تعلیم سرکار ہند ــــــــ اور پہلا مضمون کلکتہ یونیورسٹی کے ایک مجموعۂ مقالات کے لئے لکھا تھا، جو اس کے ایک سابق وائس چانسلر سر آسوتوش مکرجی کی یادگار میں شائع ہوا تھا۔ اُردو لکھنے لکھانے کا کام رفتہ رفتہ اتنا بڑھ گیا کہ انگریزی کے لئے وقت نکلنا عنقا رہ گیا۔ اور پھر ۲۱ء و ۲۲ء میں تحریک خلافت و ترک موالات کی جو طوفانی آندھی چلی، وہ بیزاری کی لپیٹ میں انگریزی زبان کو بھی لے آئی، اور جی انگریزی لکھنے سے ہٹ گیا اور رفتہ رفتہ مشق بھی انگریزی لکھنے کی چھوٹ

گئی، اس کا افسوس و قلق آج تک ہے، پھر بھی ایک لمبے عرصہ تک، کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا مراسلہ پانیر، لیڈر اور اسٹیٹمین میں نکلتا ہی رہا۔ مثلاً ان عنوانات پر

(1) WINE WOMAN AND WAR

(2) CRIME AND CORRUPTION IN ENGLAND

یا نیشنل ہیرلڈ میں ایک مضمون اُردو کی حمایت میں۔

دو ایک مضمون رسالوں میں بھی نکلے، مثلاً مسلم ریویو (لکھنؤ) اور اسلامک ریویو (دوکنگ) اور وائس آف اسلام (کراچی) میں ایسے عنوانات پر:۔

(1) POLYGAMY _ A VINDICATION

(2) THE CULT OF FEMINNISM

(3) IN DEFENCE OF EARLY MARRIAGES

مشق چھوٹ جانے کا افسوس ناک نتیجہ یہ ہے کہ اب اگر انگریزی میں کچھ لکھنا چاہوں بھی تو، جتنا وقت ایک مضمون کے اُردو لکھنے میں لگتا ہے، اس کا چوگنا پچ گنا وقت اسی مضمون کے لئے انگریزی میں درکار ہوگا، اور پھر بھی ویسا نہ بن پڑے گا!

باب (۲۹)

آغازِ الحاد

پیدائش مذہبی گھرانے میں، اور تربیت دینی ماحول میں ہوئی، ماں اور بڑی بہن کو تہجد گزار پایا، اور والد ماجد کو بھی پابند صوم وصلوٰۃ اور اچھا خاصہ دین دار، بڑے بھائی بھی تارک نماز یا لامذہب نہ تھے، دین داری کے ساتھ علم دین کا بھی چرچا گھر میں تھا، دادا صاحب مفتی اور فقیہ صاحبِ فتاویٰ، اور نانا صاحب کے بھی علمی اور دینی کارناموں کے شہرے شروع ہی سے کان میں پڑتے رہے، چچا صاحب نے وضع قطع بالکل بچپن ہی میں مولویانہ کرادی تھی، جسم پر چھوٹی سی عبا، ہاتھ میں بڑے دانوں کی خوش رنگ تسبیح، سر پر صندلی عمامہ، مطالعہ میں کتابیں بھی زیادہ تر مذہبی ہی قسم کی، گھر پر اتالیق ایک مولوی صاحب، اسکول میں عربی کے استاد ایک حاجی صاحب، دونوں کی صحبتیں سونے پر سہاگا کا کام دیتی رہیں، ساتویں آٹھویں درجہ میں جب پہنچا، ۱۲، ۱۳ سال کی عمر میں تو گویا پورا مُلّا تھا، بلکہ کتابیں پڑھ پڑھ کر اور ان کے مضمون چُرا چُرا کر، خود بھی اچھے خاصے مضمون، آریوں، مسیحیوں، اور نیچریوں کے جواب میں لکھنے لگا تھا۔ یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ اس سن میں مُلک کا سب سے بڑا فاضل بلکہ مجدّد، مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی کو سمجھتا تھا، ان کے انتقال کو ۲۵، ۲۶ سال کی مدت گزر چکی تھی، لیکن ان کی عظمت کا سکّہ دل پر جما ہوا

تھا ـــــــ مولانا محمد علی رحمانی مونگیری کے اثر سے ردِّ نصاریٰ اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے اثر سے ردِّ آریہ پر طبیعت خوب متوجہ رہی، نویں درجہ میں آیا، اور بھی مناظرہ کا رنگ خوب گہرا رہا، اتنے میں مولانا شبلی کی الکلام، رسایل وغیرہ کا تعارف ہوا، اب چسکا فلسفہ وعلم کلام کا پڑا، اور توجہ بجائے آریہ و مسیحی کے اب ملحدوں اور مادہ پرستوں کے رد کی طرف ہوگئی، نماز با جماعت، روزہ وغیرہ کا اب تک پورا پابند تھا۔

دینی جوش کا یہی عالم تھا، اور اب سن کے سولھویں سال میں تھا کہ سیتاپور ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرکے لکھنؤ آگیا۔ اور جولائی ۱۹۰۸ء میں کیننگ کالج میں داخل ہوگیا، لکھنؤ آنا کچھ اور پہلے ہوگیا تھا اور یہاں ایک عزیز کے پاس ایک انگریزی کتاب محض اتفاق سے دیکھنے میں آگئی، اچھی خاصی ضخیم، ہر چیز کے پڑھنے اور پڑھ ڈالنے کا مرض تو شروع ہی سے تھا، کتاب کا کیڑا بنا ہوا تھا، بے تکان اس کتاب کو بھی پڑھنا شروع کر دیا لیکن اب کیا بتایا جائے، جوں جوں آگے بڑھتا گیا، گویا ایک نیا عالم عقلیات کا کھلتا گیا! اور عقائد و اخلاق کی پوری پرانی دنیا جیسے زیر و زبر ہوتی چلی گئی! ـــــــ کتاب مذہب پر نہ تھی، نہ بظاہر اس کا کوئی تعلق ابطال اسلام یا ابطال مذاہب سے تھا۔ اصول معاشرت و آداب معاشرت پر تھی، نام تھا ELEMENTS OF SOCIAL SCIENCE اور مصنف کا نام اس ایڈیشن میں غائب تھا، بجائے نام صرف اس کی طبی ڈگری ام، ڈی درج تھی، بعد کے ایڈیشنوں پر نام ڈاکٹر ڈریسڈیل DYRESDALE نکلا اور بعد کو یہ بھی کھلا کہ وہ اپنے وقت کا ایک کٹر ملحد تھا، کتاب کیا تھی، ایک بارود بچھی ہوئی سرنگ تھی۔ حملہ کا اصل ہدف وہ اخلاقی بندشیں تھیں، جنھیں مذہب کی دنیا اب تک

بہ طور علوم متعارفہ کے پکڑے ہوئے ہے اور ان پر اپنے احکام کی بنیاد رکھے ہوئے ہے مثلاً عفت و عصمت، کتاب کا اصل حملہ انھیں بنیادی، اخلاقی قدروں پر تھا، اس کا کہنا تھا کہ یہ جنسی خواہش تو جسم کا ایک طبعی مطالبہ ہے، اسے مٹاتے رہنا، اور اس کے لئے باضابطہ عقد کا منتظر رہنا، نہ صرف ایک فعل عبث ہے، بلکہ صحت کے لئے اور جنسی قوتوں کی قدرتی بالیدگی کے لئے سخت مُضر ہے، اس لئے ایسی قیدوں پابندیوں کو توڑ ڈالو، اور مذہب واخلاق کے گڑھے ہوئے ضابطۂ زندگی کو اپنے پیروں سے روند ڈالو، ——— صرف یہ ایک مضمون بیان ہوا، اسی طرح کتاب کی زد اگر ہر ایسی قدر پر پڑتی تھی جو مذہب اور اخلاق کو ہمیشہ عزیز رہے ہیں۔ مالتھس کا مسئلہ ضبط تولید و منعِ حمل سب سے پہلے اسی کتاب میں پڑھنے میں آیا، انداز بیان بلا کا زوردار اور خطیبانہ تھا سولھویں سال کا ایک طفل ناداں اس سیلاب عظیم میں اپنے ایمان و اخلاق کی ننھی منی سی کشتی کو کیسے صحیح وسالم رکھ پاتا! خصوصاً جب کہ کتاب کی دعوت ودعایت عین نفس کے مطابق ہو۔

مذہب کی حمایت و نُصرت میں اب تک جو قوت جمع کی تھی، وہ اتنی شدید بیماری کی تاب نہ لاسکی، اور شک و بدگمانی کی تخم ریزی مذہب و اخلاقیات کے خلاف خاصی ہوگئی ——— لاحول ولاقوۃ، اب تک کس دھوکے میں پڑے رہے، تقلیداً ابتک جن چیزوں کو جزو ایمان بنائے ہوئے تھے، وہ عقل و تنقید کی روشنی میں کیسی بودی، کمزور اور بے حقیقت نکلیں، یہ تھا وہ ردّ عمل جو کتاب کے ختم ہونے پر دل و دماغ میں پیدا ہوا ——— پروپیگنڈے کا کمال بھی یہی ہے کہ حملہ براہ راست نہ ہو، بلکہ اطراف و جوانب سے گولہ باری کر کے قلعہ کی حالت کو اتنا مخدوش بنا دیا جائے کہ خود

دفاع کرنے والوں میں تزلزل وتذبذب پیدا ہو جائے، اور قدم از خود اُکھڑ جانے پر آمادہ ہو جائیں۔

شک وارتیاب کی یہ تخم ریزی ہو ہی چکی تھی، کہ عین اسی زمانہ میں لکھنؤ کی لائبریری میں ایک ضخیم کتاب کئی جلدوں میں INTERNATIONAL LIBRARY OF FAMOUS LITERATURE کے نام سے دکھائی دی، یہ کتاب بھی مذہبیات کی نہیں ادب ومحاضرہ کی ہے، ساری دنیا کے ادبیات کے بہترین انتخابات کو اس میں جمع کر دیا گیا ہے، اس کی ایک جلد میں ذکر قرآن اور اسلام کا ہے، ذکر خیر نہ سہی لیکن بہر حال کوئی ہجو ومنقصت خصوصی بھی نہیں، لیکن اسی جلد میں ایک پورے صفحہ کا فوٹو بھی "بانی اسلام" کا درج، قد آدم، اور نیچے مستند حوالہ درج کہ فلاں قلمی تصویر کا یہ عکس ہے گویا ہر طرح صحیح ومعتبر، اور ظالم نے شبیہ مبارک ایک عرب کے جسم پر عبا، سر پر عمامہ، اور چہرہ مہرہ پر بجائے کسی قسم کی نرمی کے، تیوروں پر خشونت کے بل پڑے ہوئے ہاتھ میں کمان، شانہ پر ترکش، کمر میں تلوار، نعوذ باللہ گویا تمام تر ایک ہیبت ناک وجلاّد قسم کے بدوی سردار قبیلہ کی! —— اب آج اگر خدا نخواستہ پھر اسی طرح کا کوئی نقش نظر پڑے، تو طبیعت خود ہی بے ساختہ کہہ اٹھے، استغفر اللہ، اصلیت سے اس پیکر خیالی کو تو کوئی دُور کا بھی واسطہ نہیں، حدیث میں تو چہرہ بشرہ، وضع لباس کا ایک ایک جزئیہ دیا ہے، اس سے اس ہیولے کو کوئی مناسبت ہی نہیں، یہ قطعی کسی شیطان کا گڑھا ہوا ہے، اس وقت اتنے ہوش کہاں تھے، چوٹ اور بڑی سخت چوٹ یک بیک دل ودماغ دونوں پر پڑی، اور اندر سے آواز آئی تو یہ، کہ لیجئے کیا دھوکا ہوا ہے، شفقت ولینت، کرم ورحمت کے سارے قصے بے اصل نکلے، حقیقت تو اب جا کر

کھلی! ـــــ فرنگیت سے مرعوب ذہنیت اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ خود اس فوٹو میں کوئی جعلسازی ہو سکتی ہے، اور صاحب کی بات بھی کوئی غلط ہو سکتی ہے تحقیق تو ہو نہ ہو وہی ہے جو اس فوٹو سے عیاں ہے!

لیجئے، برسوں کی محنت اور تیاری کا قلعہ بات کی بات میں ڈھ گیا، اور بغیر کسی آریہ سماجی، مسیحی یا کسی اور دشمن اسلام سے بحث و مناظرہ میں مغلوب ہوتے، ذات رسالتؐ سے اعتقاد، بہ حیثیت رسول کیا معنی، بہ حیثیت ایک بزرگ یا اعلیٰ انسان کے بھی، دیکھتے دیکھتے دل سے مٹ گیا! اسلام و ایمان کی دولت عظیم بات کہتے، ارتداد کے خس و خاشاک میں تبدیل ہو گئی ـــــ ہر مسلمان کے لئے کتاب کا یہ حصہ بڑے غور و فکر، عبرت و بصیرت سے پڑھنے کے قابل ہے، دین کے آغوش میں پلا ہوا، بڑھا ہوا، لڑکا بلکہ نوجوان شیطان کے پہلے ہی دوسرے حملے میں یوں چت ہو گیا۔ گمرہی کے کتنے دروازے ہیں، اور شیطان کی آمد کے لئے کتنے راستے کھلے ہوئے ہیں! ـــــ نماز اب بھلا کہاں باقی رہ سکتی تھی، پہلے وقت سے بے وقت ہوئی، پابندی گئی، ناغے اور کئی کئی ناغے ہونے لگے، یہاں تک کہ بالکل ہی غائب ہو گئی، وضو، تلاوت، روزہ وغیرہ سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا، شروع شروع میں کچھ خوف اور لحاظ والد ماجد کا رہا، لیکن یہ کب تک کام دیتا، لکھنؤ سے سیتاپور جب ان کے پاس جاتا، تو نماز کے وقت ان کے پاس سے ٹل جاتا، اِدھر اُدھر ہو جاتا، اور کبھی کبھی سوتا بن جاتا، سب سے نازک معاملہ نماز جمعہ کا آ پڑا، پہلے مرحوم نے بڑی کوشش کی کہ مجھے سوتے سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جائیں، جب دیکھا کہ میں کم بخت اٹھتا ہی نہیں ہوں، اور وقت نکلا جا رہا ہے، تو مجھے میرے حال پر چھوڑ کر خود روانہ ہو گئے، کس دل

سے؟ اب یہ کون بتائے؟

اور آج جب سوچتا ہوں کہ اس وقت اس اللہ کے بندے پر مجھ ناہنجار کی طرف سے کیا گزری ہوگی تو اپنی شامت و بدبختی پر گویا زمین میں گڑ گڑ جاتا ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ اس وقت جب میں اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت پر آمادہ تھا، تو باپ بچارے کو کیا خاطر میں لاتا!

مذہبی مطالعہ اُس وقت بھی کچھ ایسا کم نہ تھا، لیکن فرنگی الحاد کے جس سیلاب عظیم سے ٹکراؤ تھا اس سے مقابلہ کے لئے وہ مطالعہ ہرگز کافی نہ تھا۔ کائنات عنصری کی ایک عظیم الشان و عظیم القدر کارگاہ میں خالق کائنات نے اپنے قانون میں مُروت و رعایت کسی کی بھی نہیں رکھی ہے، اپنے بھیجے اور اُتارے ہوئے دین تک کی نہیں! اپنی مسجد و، اپنے قرآن، اپنے کعبہ، اپنے رسول تک کسی کی بھی نہیں، تلوار میں جو کاٹ رکھ دی ہے وہ اپنا جوہر سب ہی کو دکھائے گی، چاہے اس کے سامنے مصحف اقدس کے اوراق آجائیں، چاہے مسجد کے محراب و منبر، چاہے کعبہ کے دیوار و در، اور چاہے کسی ولی و صدیق کا جسد اور چاہے کسی نبی مکرم کا جسم اطہر!

پیش ایں فولاد بے اسپر میا
کز بریدن تیغ را نبود حیا!

باب (۳۰)

اِلحاد و اِرتداد

کالج میں اگر منطق، اور پھر فلسفہ پر خوب توجہ کی، منطق اب تو خیر کورس میں داخل تھی، جب نہیں بھی تھی، یعنی اسکول ہی کے زمانے سے، اسے چپکے چپکے پڑھنا شروع کردیا میں سیتاپور ہائی اسکول کے نویں درجہ میں تھا، اور بھائی صاحب لکھنؤ میں ایف اے کے طالب علم، بڑی تعطیلات میں جب سیتاپور آتے تو ان کے کورس کی کتاب STOCK'S LOGIC اٹھا کر پڑھنا شروع کردیتا تھا، اور الٹا سیدھا آخر کچھ سمجھ بھی لیتا، اس کے ابتدائی رسائل منطق صغریٰ و کبریٰ بھی مطالعہ کر ڈالے۔ کالج آ کر یہ ہوس پوری طرح بجھانے کا موقع ملا۔ کورس کی کتاب کے علاوہ اور بھی کتابیں منطق کی، لائبریری سے لے کر پڑھنا شروع کردیں۔ یہاں تک کہ مل کی ضخیم اور دقیق سسٹم آف لاجک بھی کسی طرح چاٹ گیا، حالاں کہ یہ منطق سے زیادہ فلسفہ کی کتاب ہے، اور براہ راست فلسفہ کا بھی مطالعہ جاری ہوگیا۔ خصوصاً اس کی شاخ نفسیات (سائیکالوجی) کا۔ اب کسی کو کیوں یقین آنے لگا، لیکن اس وقت تک ساری یونیورسٹیوں میں سائیکالوجی، شاخ کسی سائنس کی نہیں، فلسفہ ہی کی تھی اور خود اس کے کئی کئی شعبے تھے۔ علاوہ انفرادی و شخصی سائیکالوجی کے، نفسیات اجتماعی، نفسیات مرضی وغیرہا ـــــــ ملحد و نیم ملحد فلسفیوں کی

انگریزی میں کمی نہیں، ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر، اور چھانٹ چھانٹ کر ان لوگوں کو خوب پڑھا مِل کا تو نمبر اول تھا، اور دل و دماغ اس وقت تشکیکی اور ارتیابی نظریات سے متاثر بھی بہت ہی تھا۔ ہیوم اور اسپنسر کو بھی چاٹ ڈالا، کچھ ایسے بھی تھے جو اصلاً تو سائنسٹ تھے، مگر شمار ملحد فلسفیوں کے باہر کٹھے ملحدوں کو بھی خوب نوازا۔ مثلاً برطانیہ کا چارلس بریڈلا جرمن کا بوشنر، امریکہ کا انگرسول۔ ظاہر ہے کہ ان سب کے مطالعہ سے اپنی تشکیک کو خوب غذا پہنچتی رہی، اور الحاد کو خوب تقویت پہنچتی رہی، لیکن اسلام اور ایمان سے برگشتہ کرنے اور صاف و صریح ارتداد کی طرف لانے میں ملحدوں اور نیم ملحدوں کی تحریریں ہرگز اس درجہ موثر نہیں ہوئیں، جتنی وہ "فنی" کتابیں ثابت ہوئیں جو نفسیات کے موضوع پر اہل فن کے قلم سے نکلی ہوئی تھیں بظاہر مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتی تھیں، نہ نفیاً نہ اثباتاً اصلی زہر انھیں بہ ظاہر بے ضرر کتابوں کے اندر گھلا ہوا ملا۔ مثلاً ایک شخص گزرا ہے ڈاکٹر ماڈسلی (MAUDESLEY) اس کی دو موٹی موٹی کتابیں اس زمانہ میں خوب شہرت پائے ہوئے تھیں۔

ایک MENTAL PHYSIOLOGY (عضویات دماغی)۔

دوسری MENTAL PATHALOGY (مرضیات دماغی)

اس دوسری کتاب میں اختلال دماغی اور امراض نفسیاتی کو بیان کرتے کرتے یک بیک وہ بدبخت مثال میں وحی محمدی کو لے آیا، اور اسم مبارک کی صراحت کے ساتھ ظالم لکھ گیا کہ مصروع شخص کے لئے یہ بالکل ممکن ہے کہ وہ اپنا کوئی بڑا کارنامہ دنیا کے لئے چھوڑ جائے! ــــــ ایمان کی بنیادیں کھوکھلی تو پہلے ہی ہو چکی تھیں اب ان کم بخت "ماہرین فن" کی زبان سے اس قسم کی تحقیقات عالیہ سُن کر رہا سہا ایمان بھی رخصت ہو گیا، اور

الحاد وارتداد کی منزل تکمیل کو پہنچ گئی! ـــــــ ایمان کو عزیز رکھنے والے خدا کے لئے ان تصریحات کو غور سے پڑھیں، اور کچھ لمحے سوچیں کہ جس تعلیم کے آتش کدے میں وہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو بے تحاشہ جھونک رہے ہیں، وہ انھیں کدھر لے جانے والی ہے!

انٹرمیڈیٹ میں تھا اور بے دینی کی لے بڑھ رہی تھی کہ کسی کے پاس لندن کی ریشنلسٹ پریس ایسوسی ایشن (RPA) کی ارزاں قیمت مطبوعات کی فہرست دیکھی، گویا منہ مانگی مراد مل گئی۔ مسلک عقلیت (ریشنلزم) کے پرچار کے نام سے یہ سب کتابیں ردّ مذہب و تبلیغ الحاد کے لئے تھیں، اور گو ان کی زد براہ راست تو مسیحیت ہی پر آکر پڑتی تھی، لیکن کوئی بھی مذہب ان کی زد سے باہر اور محفوظ و مستثنیٰ نہ تھا۔ ہر کتاب چھ چھ آنے میں آجاتی تھی، ارزانی کے اس دَور میں بھی اس درجہ ارزانی حیرت انگیز تھی، پہلے تو یہ کتابیں مانگ مانگ کر پڑھیں، پھر جب لت پڑ گئی اور نشہ اور تیز ہو گیا تو فیس ادا کر کے، انجمن کا ممبر باضابطہ بن گیا، اور بہت سی کتابیں اکٹھا کر لیں فخر سے اپنے کو ریشنلسٹ کہتا، اور اس پر فخر کرتا اور اپنے اس ننھے مُنّے کتب خانہ کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا۔ ہندوستان میں اس کی کوئی شاخ نہ تھی، لندن اس کے پندرہ روزہ نقیب "ریشنلسٹ ریویو" یا "ولٹریری گائڈ" کو قیمت بھیج، اس کا خریدار بن گیا۔ اور رفتہ رفتہ اب اسلام کے نام سے بھی شرم آنے لگی۔ اور انٹرمیڈیٹ کے سالانہ امتحان کا جب وقت آیا تو امتحانی فارم کے خانے مذہب میں بجائے مسلم کے درج صرف "ریشنلسٹ" کیا۔

ذہنی، فکری، عقلی اعتبار سے اب تمامتر ایک فرنگی یا صاحب بہادر تھا، مسلمانوں سے میل جول اب قدرۃً کم ہونے لگا۔ اسلامی تقریبات میں جانا تو قطعاً نہ رہا۔ بڑی خیر

یہ ہوئی کہ مجلسی، خانگی تعلقات اپنے عزیزوں اور خاندان والوں سے بدستور باقی رہے۔ اپنے ایک ساتھی کو اسی زمانہ میں دیکھا کہ اپنوں سے کٹ کر مکمل غیروں میں شامل ہو گئے تھے، اور رہن سہن تک بالکل ہندوانہ کر لیا تھا، میں اپنے کھانے پینے، وضع ولباس اور عام معاشرت میں، بلکہ کہنا چاہیئے کہ ایک حد تک جذباتی حیثیت سے بھی مسلمان ہی رہا، البتہ ایک روشن خیال مسلمان۔ اور روشن خیال مسلمان اس وقت نوجوانوں میں کون نہ تھا؟ اور مسلم قوم سے میری یگانگت کی جڑیں بحمداللہ کٹنے نہ پائیں —— مسلم قومیت کی نعمت بھی، دین اسلام کے بعد، ایک بڑی نعمت ہے، اور کوئی صاحب اسے بے وقعت و بے قیمت نہ سمجھیں۔ مجھے آگے چل کر اس بچی کھچی نعمت کی بھی بڑی قدر معلوم ہوئی۔ سوٹ وغیرہ جس حد تک میں نے پہنا، اس میں کوئی ندرت نہ تھی، اتنا سب ہی پہنتے تھے، تھیٹر وغیرہ میں جس حد تک گیا، سب ہی جاتے تھے، البتہ شراب کبھی نہیں پی، گو اس کا تجربہ کرنے کا ارادہ بار بار کیا، لیکن اگر پی بھی لیتا جب بھی کوئی ایسی عجیب بات نہ ہوتی، غرض ایسی بات نہ ہونے پائی، جس سے بالکل برادری سے باہر ہو جاتا۔ اور مسلمانوں کا کوئی طبقہ میرے بائیکاٹ پر آمادہ ہو جاتا۔ بڑی بات یہ ہوئی کہ کوئی بات ایسی کبھی نہ کہی جس سے مسلمانوں کے جذبات بھڑکیں، جو بھی گفتگو کی، علمی دائرہ کے اندر، اور نفس مسائل پر کی، تنقید جب بھی کی، عقائد و مسائل پر نہ کہ شخصیات پر۔

جذباتی حیثیت سے ایک حد تک مسلمان باقی رہ جانے کے سلسلے میں یہ لطیفہ سننے کے قابل ہے کہ کوئی غیر مسلم جب کبھی اسلام پر معترض ہوا، تو اپنا دل اس کی تائید و ہم زبانی کو نہ اٹھا بلکہ ارتداد کامل کے باوجود جی اس کے جواب دینے ہی پر آمادہ کرتا، اکتوبر

سنہ ۱۹۱۱ء کا ذکر ہے، ایک بڑی مسیحی کانفرنس میں شرکت کے لئے مشہور معاند اسلام پادری زویمر (ZUEMER) بھی بحرین سے آئے، ان کی شہرت عداوت اسلام کی، ان سے قبل یہاں پہنچ چکی تھی۔ میں بی اے کا طالب علم تھا، اور عقیدۃً تمام تر منکر اسلام۔ اپنے ایک دوست مولوی عبدالباری ندوی کو ساتھ لے، جھٹ ان سے ملنے پہنچا۔ پادری صاحب یوں اخلاق سے پیش آئے لیکن حسب عادت چوٹیں اسلام پر کرنا شروع کر دیں۔ اب یقین کیجیے، کہ جوابات جس طرح ندوی صاحب نے عربی میں دینا شروع کر دیئے، اسی طرح میں نے بھی انگریزی میں۔ اور پادری صاحب پر یہ کسی طرح کھلنے نہ پایا کہ میں تو خود ہی اسلام سے برگشتہ و مرتد ہوں۔ کسی پادری یا آریہ سماجی یا کسی اور کھلے ہوئے دشمن اسلام کا اثر مطلق مجھ پر نہ تھا، متاثر جو کچھ بھی میں ہوا تھا، وہ تمام تر اسلام کے مخفی دشمنوں سے، انھیں کے علم و فضل سے، انھیں کی تحقیقات عالیہ سے، جو زبان پر دعویٰ کمال بے تعصبی کا رکھتے ہیں، لیکن دانستہ یا نادانستہ بہرحال اندر ہی اندر زہر کے انجکشن دیتے چلے جاتے ہیں۔ اور بھولا بھالا بے خبر پڑھنے والا، بغیر اپنی قوت مدافعت کو خود بھی بیدار رکھے ہوئے ان کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔ دماغ تو پوری طرح "دانایان فرنگ" و حکمائے مغرب کی عظمت و علمی عقیدت سے معمور تھا اور ان کا ہر قول و ارشاد ہر بدگمانی سے بالاتر تھا، اور ہر بے اعتباری سے پرے۔

صحافت کے ذیل میں ذکر آچکا ہے کہ مارچ سنہ ۱۹۱۰ء سے آخر سال تک النّاظر میں تنقید مولانا شبلی کی الکلام پر ہوتی رہی، مولانا کی کتاب تو محض آڑ تھی، ورنہ تنقید در حقیقت تمام بنیادی عقائد پر تھی، وجود باری، رسالت، آخرت وغیرہ پر۔ اور اس نے میری "دہریت" پر تو نہیں، البتہ میری لاادریت، اور تشکیک پر مُہر استناد

لگا دی۔

والد مرحوم کی وفات نومبر ۱۹۱۲ء میں مکہ معظمہ میں دوران حج میں ہوئی، انھیں میری بے دینی سے قدرتاً سخت آزردگی اور اذیت قلب تھی، بچارے کا جہاں تک ذہن پہنچتا ہر مذہبی شخصیت سے مجھے ملا ملا کر میری اصلاح چاہتے۔ جو عزیز سفر حج میں ان کے ہمراہ تھے، ان سے بعد کو معلوم ہوا کہ مرحوم نے غلاف کعبہ کو تھام کر اپنے لخت جگر کی ہدایت و بازیابی کی دُعا قلب کی گہرائیوں سے کی تھی ـــــ مردِ مومن و مضطر کا تیر، نشانہ پر، دیر سویر آخر کب تک نہ پڑتا؟ جس قادر مطلق نے پیمبر برحق یعقوبؑ کو خوب رُلا رُلا کر ان کی دُعا آخر ان کے فرزند کی بازیابی کے حق میں قبول کی تھی، وہ اُمت محمدؐ کے ایک فرد اور آلِ یعقوب کے ایک فرد عبدالقادر کو، کیا سدا محروم ہی رکھتا!

باب (۳۱)

مد کے بعد جزر

الحاد وارتداد کا یہ دور کہنا چاہیئے کہ دس سال تک رہا ۔ ۹ء میں یا اس سے کچھ قبل ہی شروع ہوا تھا، اور ۱۸ء کی آخری سہ ماہی تک قائم رہا۔ دس سال کی مُدت اب اس دور کے ختم ہو جانے اور پھر اس پر بھی اتنے دن گزر جانے کے بعد کچھ بڑی معلوم نہیں ہوتی، لیکن ذرا تصور کے سامنے دوران الحاد والے زمانے کو لے آیئے، جب مدت "ماضی" نہیں تھی "حال" تھی، چل رہی تھی۔ اور قوت و شدت کے ساتھ چل رہی تھی، معاذاللہ! کتنی لمبی معلوم ہو رہی تھی، معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ زندگی بھر کبھی ختم بھی ہو گی اپنے کو بھی یہی محسوس ہو رہا تھا اور دیکھنے والوں کو بھی یہی، دوست و دشمن، مخالف و موافق، سب ہی کو (بجز گنتی کے دو چار اہل نظر کے، جنھوں نے اس کا عارضی ہونا اسی وقت بھانپ لیا تھا) ـــــ اگست ۱۸ء تھا کہ میں حیدرآباد سے لکھنؤ واپس آگیا۔ اور اب اپنے اسی شوق و تفحص کے طفیل مطالعہ مذہبی یا نیم مذہبی قسم کے فلسفیوں کا شروع گیا۔ یورپ کے شوپنہایر وغیرہ سے جلدی جلدی گزرتا ہوا، پہلا نمبر چین کے حکیم کنفوشس (CONFUCIOUS) کا آیا، اس حکیم کی تعلیم اور جیسی بھی ہو، شوپنہاتیر ہی کی طرح بہرحال خالص مادہ پرستانہ نہ تھی۔ اخلاقی عنصر اس حد تک غالب تھا، اس کے ڈانڈے

رُوحانیت سے جا ملے تھے۔ اور عالم غیب سے کچھ نہ کچھ لگاؤ اسے حاصل تھا۔ کہنا چاہیے کہ یہ پہلا مطالعہ تھا جو خالص مادّی و عنصری نقطہ نظر سے ہٹ کر کسی حکیم و فلسفی کا کیا ——— ذوقِ تجسس نے قدم اور آگے بڑھایا۔ اور اس منزل میں بڑی مدد ایک پُرانے کالج ساتھی ڈاکٹر محمد حفیظ سیدؔ سے ملی۔ اور بدھ مت اور جین مذہب اور تھیاسوفی کی طرف رہ نمائی ہوتی چلی گئی۔ حکیم مطلق کی طرف سے ہدایت و تربیت کے مناسب حال سامان، ہر منزل بلکہ ہر قدم پر ہوتے رہتے ہیں!

پہلے ایک اہم اور گہری کتاب بودھ مت پر پڑھی، اور اس سے تاثر یہ پیدا ہوا کہ بدھ مت نرے مجموعۂ اوہام کا نام نہیں، بلکہ اس کے اندر نفس بشری اور رُوح سے متعلق کچھ گہری حقیقتیں اور بصیرتیں بھی ہیں۔ پھر تھیاسوفی کی سیر شروع کی (اور ظاہر ہے کہ یہ سارے مطالعے انگریزی ہی کتابوں کی مدد سے رہے) تھیاسوفی کو ہندو تصوف یا ہندو فلسفۂ تصوف سمجھئے، سارا زور روح اور اس کے تقلبات پر۔ رنگ کچھ حاضرات وعملیات سے ملتا ہوا۔ مسز اینی بسنٹ (جو مسیحی سے ہندو ہو گئی تھیں) اس کی روحِ رواں تھیں اور خصوصی مبلغ و مناد۔ اور بنارس کے فلسفی و درویش ڈاکٹر بھگوان داس (جن کا انتقال ابھی چند سال ہوئے ۹۰ سال سے اوپر کی عمر میں ہوا ہے) ہندو تصوّف اور ہندو فلسفہ کے بہترین شارح و ترجمان ہوئے ہیں، ان دونوں کی تحریروں کو بہت کچھ پڑھا اور بہت کچھ ان سے سیکھا۔ اور مہاراشٹر کے تلک اور بنگال و جنوبی ہند کے آربندو گھوش کی بھی تحریریں پڑھ ڈالنے کی کوشش اپنی والی جاری رکھی، اور اسی دَور میں کرشن جی کی بھگوت گیتا کے بھی جتنے نسخے انگریزی میں مل سکے، پڑھ ڈالے

اس کتاب نے جیسے آنکھیں کھول دیں اور ایک بالکل ہی نیا عالم روحانیات یا ماورار مادیات کا نظر آنے لگا۔ گاندھی جی کی بھی تحریریں اسی زمانے میں کثرت سے نظر سے گزریں چھوٹے بڑے ہر مادّی واقعہ کائنات کی کوئی نہ کوئی روحانی توجیہ و تعبیر ان کے قلم سے برابر دیکھنے میں آتی رہی، اور دل و دماغ کو متاثر کرتی رہی ——— ڈیڑھ دو سال (۱۹ء سے ۲۰ء) کے اس مسلسل مطالعہ کا حاصل یہ نکلا کہ فرنگی اور مادّی فلسفہ کا جو بُت دل میں بیٹھا ہوا تھا، وہ شکست ہو گیا، اور ذہن کو یہ صاف نظر آنے لگا کہ اسرار کائنات سے متعلق آخری توجیہ اور قطعی تعبیر ان فرنگی مادیئن کی نہیں بلکہ دنیا میں ایک سے ایک اعلیٰ و دل نشین توجیہیں اور تعبیریں اور بھی موجود ہیں۔ اور رُوحانیات کی دنیا سر تا سر وہم و جہل اور قابل مضحکہ و تحقیر نہیں، بلکہ حقیقی اور ٹھوس دُنیا ہے، عزت و توقیر کی مستحق عُمق اور تحقیق و تدقیق کے اعتبار سے گوتم بدھ اور سری کرشن کی تعلیمات ہرگز کسی مِل، کسی اسپنسر سے کم نہیں، بلکہ کہیں بڑھی ہوئی ہیں۔ اور حکمائے فرنگ ان کے مقابلہ میں بہت پست و سطحی نظر آنے لگے۔ اسلام سے ان تعلیمات کو بھی خاصہ بُعد تھا، لیکن بہر حال اب مسائل حیات، اسرار کائنات سے متعلق نظر کے سامنے ایک بالکل نیا رُخ آ گیا اور مادیت، لا ادریت و تشکیک کی جو سر بفلک عمارت برسوں میں تعمیر ہوئی تھی، وہ دھڑام سے زمین پر آ رہی۔ دل اب اس عقیدہ پر آ گیا کہ مادیت کے علاوہ، اور اس سے کہیں ماورا و مافوق ایک دوسرا عالم روحانیت کا بھی ہے۔ جو اس مادّی محسوسات، مرئیات و مشہودات ہی سب کچھ نہیں، ان کی تہہ میں اور ان سے بالاتر "غیب" اور مغیبات کا بھی ایک مستقل عالم اپنا وجود رکھتا ہے ——— قرآن مجید نے بالکل شروع میں جو ایمان کا وصف ایمان بالغیب بتا دیا ہے۔ وہ بہت ہی پُر حکمت و معنی خیز ہے، پہلے نفس "غیب" پر تو ایمان ہو۔

پھر اس کے جزئیات و تفصیلات بھی معلوم ہوتے رہیں گے، ہمارے مولوی صاحبان کو اس منزل و مقام کی کوئی قدر نہ ہو، لیکن درحقیقت یہ روحانیت کا اعتقاد، ایمان کی پہلی اور بڑی فتح مبین مادیت، الحاد و تشکیک کے لشکر پر تھی۔

اسی دور کی ابھی ابتدا ہی تھی کہ مولانا شبلی کی سیرۃ النبی کی جلد اول پریس سے باہر آگئی، کتاب شبلی کے قلم سے تھی۔ موضوع کچھ بھی سہی، کیسے نہ اس کو شوق کے ہاتھوں سے کھولتا اور اشتیاق کی آنکھوں سے پڑھتا، کھولی اور جب تک اول سے آخر تک پڑھ نہ لی دم نہ لیا، دل کا اصلی چور تو یہیں تھا۔ اور نفس شوم کو سب سے بڑی ٹھوکر جو لگی تھی وہ اسی سیرۃ اقدس ہی کے متعلق تو تھی۔ مستشرقین و محققین فرنگ کے حملوں کا اصل ہدف تو ذات رسالت ہی تھی، خصوصاً بہ سلسلۂ غزوات و محاربات، ظالموں نے بھی تو طرح طرح سے دل میں بٹھا دیا تھا کہ ذات مبارک نعوذ باللہ بالکل ایک ظالم فاتح کی تھی، شبلی نے (اللہ ان کی تربت ٹھنڈی رکھے) اصل دوا اسی درد کی کی، مرہم اسی زخم پر رکھا۔ اور کتاب جب بند کی تو چشم تصور کے سامنے رسول عربیؐ کی تصویر ایک بڑے مصلح ملک و قوم اور ایک رحم دل و فیاض حاکم کی تھی، جس کو اگر جدال و قتال سے کام لینا پڑا تھا تو پھر بالکل آخر درجہ میں، ہر طرح پر مجبور ہو کر، یہ مرتبہ یقیناً آج ہر مسلمان کو رسول و نبی کے درجہ سے کہیں فروتر نظر آئے گا اور شبلی کی کوئی قدر و قیمت نظر میں نہ آئے گی، لیکن اس کا حال ذرا اس کے دل سے پوچھئے جس کے دل میں نعوذ باللہ پورا بُغض و عناد اس ذات اقدس کی طرف سے جما ہوا تھا۔ شبلی کی کتاب کا یہ احسان میں کبھی بھولنے والا نہیں

ابو طالب ہاشمی کا مرتبہ اہل ایمان میں جو کچھ اور جیسا بھی ہو، بہر حال ابو لہب و

ابوجہل کے خبثِ نفس سے اسے کیا نسبت!

تذکرہ کتابوں ہی کا مسلسل چل رہا ہے، اب ذرا دو منٹ کے لئے اس سے ہٹ کر بہ طور جملہ معترضہ ان شخصیتوں کا نام بھی سُن لیجئے، جو اس درمیان میں مجھے اسلام سے قریب لانے میں معین ہوتی رہیں۔ سوال قدرۃً یہاں پڑھنے والے کے ذہن میں یہ پیدا ہوگا کہ جب میرے تعلقات مسلمان دوستوں عزیزوں سے برابر قائم رہے، تو آخر ان لوگوں کی بڑی اکثریت کیوں خاموش رہی، ان میں سے بہتوں نے فریضۂ تبلیغ، جلی یا خفی کیوں نہ ادا کیا! ــــ جواب میں ایک حد تک تو نام، عام غفلت، جمود، بے حسی اور غلط قسم کی رواداری کا لے لیجئے، اور پھر دوسری بات یہ کہ اپنی حد تک تو ہاتھ پیر بہتوں نے مارے، لیکن میں کسی کو خاطر ہی میں کب لاتا تھا اور کسی کی کوششوں کا میرے اوپر اثر ہی کیا، فرنگی محل لکھنؤ کے ایک مشہور مولوی صاحب یوپی کے ایک مشہور شیخ طریقت، دلّی کے ایک مشہور و معروف صوفی، ان سب نے اپنی اپنی کمندیں میرے اوپر پھینکیں، میں کسی کے ہتھے ہی نہ چڑھا۔

ہرچہ کردند از عِلاج واز دوا

رنج افزوں گشت و حاجت ناروا

ہاں مخلصانہ وحکیمانہ کوششیں پھر اگر تھوڑی بہت کسی کی چپکے چپکے کارگر ہوتی رہیں تو بس ان ۲ دو ہستیوں کی:-

(۱) ایک الہ آباد کے ناموَر ظریف شاعر حضرت اکبرؔ، بحث و مناظرہ کی انھوں نے کبھی چھانوں بھی نہیں پڑنے دی، اور نہ کبھی پند و موعظت ہی کی طرح ڈالی۔ بس

موقع بہ موقع اپنے میٹھے انداز میں کوئی بات چپکے سے ایسی کہہ گزرتے، جو دل میں اُتر جاتی اور ذہن کو جیسے ٹھوکے دے دیتے کہ قبول حق کی گنجائش کچھ تو بہر حال پیدا ہو کر رہتی۔ ایک روز بولے کہ "کیوں صاحب، آپ نے تو کالج میں عربی لی تھی، پھر اب بھی اس سے کچھ مناسبت قائم ہے؟ علم و زبان کوئی بھی ہو، بہر حال اس کی قدر تو کرنی ہی چاہیئے"۔ میں نے کہا "اب اس کے لکھنے پڑھنے کا وقت کہاں ملتا ہے"۔ بولے کہ "نہیں کچھ ایسا مشکل تو نہیں، قرآن کی بے مثل ادبیت کے تو اہل یورپ بھی قائل ہیں، اور سُنا ہے کہ جرمن یونیورسٹیوں میں قرآن کے آخری پندرہ پارے عربی ادب کے کورس میں داخل ہیں' آپ عقائد نہیں، زبان ہی کے اعتبار سے قرآن سے ربط قائم رکھئے اور جتنے منٹ بھی روزانہ نکال سکتے ہوں اسے پڑھ لیا کریں، جتنے حصّے آپ کی سمجھ میں نہ آئیں، انھیں چھوڑتے جائیے، اور یہ سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کے لئے نہیں لیکن آخر کہیں تو کچھ فقرے آپ کو پسند آ ہی جائیں گے، بس انہیں فقروں کو دو چار بار پڑھ لیا کیجئے، اور آپ کے لئے کوئی قید باوضو ہونے کی نہیں"۔

یہ ایک نمونہ تھا ان کی تبلیغ کا۔

(۲) دوسری ہستی وقت کے نامور رہنمائے ملک و ملت مولانا محمد علیؒ کی تھی، بڑی زوردار شخصیت ان کی تھی، اور میرے تو گویا محبوب ہی تھے، کبھی خط میں، اور کبھی زبانی، جہاں ذرا بھی موقع پاتے، اُبل پڑتے، اور جوش و خروش کے ساتھ، کبھی ہنستے ہوئے، کبھی گرجتے ہوئے اور کبھی آنسو بہاتے ہوئے تبلیغ کر ڈالتے، ان کی عالی دماغی، ذہانت، علم، اخلاص کا پوری طرح قائل تھا اس لئے کبھی بھی کوئی گرانی دونوں کی تبلیغ سے نہ ہوئی اور دونوں حق نصح (خیر خواہی) ادا کر کے پورا اجر سمیٹتے رہے۔

ان دو بھاری بھرکم شخصیتوں کے بعد ایک تیسرا نام اور سُن لیجیے، یہ اپنے ایک ساتھی مولوی عبدالباری ندوی تھے، اور آج جولائی ۱۹۶۷ء کے مولانا شاہ عبدالباری خلیفہ حضرت تھانویؒ۔ دھیما دھیما ان کا اچھا ہی اثر پڑتا رہا ـــــ اور لیجیے چوتھا نام ایک غیر مسلم کا تو رہا ہی جاتا ہے، یہ بنارس کے فاضل فلسفی اور درویش بابو بھگوان داس تھے، مادیت کے تاریک گڑھے سے نکلنے اور روحانیت کی روشنی میں لے آنے میں خاصہ دخل ان کو بھی ہے، ان کی تحریروں سے استفادہ کے علاوہ ملاقات کا موقع بھی ان سے اکثر ملتا رہتا۔

•

گیتا کے مطالعہ کے بعد سے طبیعت میں رجحان تصوف کی جانب پیدا ہو گیا تھا، اور مسلم صوفیا کی کرامتوں اور ملفوظات سے اب وحشت نہیں رہی تھی، دل چسپی پیدا ہو گئی تھی اور خاصی کتابیں فارسی اور اُردو کی دیکھ بھی ڈالی تھیں۔ مؤثر شخصیتوں میں قابل ذکر نام دیوہ کے مشہور صوفی بزرگ حاجی وارث علی شاہ کا ہے۔ ان کے ملفوظات بڑے چاؤ سے پڑھتا، اور ان کے کرامات وخوارق کے چرچے بڑی عقیدت سے سننے لگا تھا واضح وشعوری طور پر مسلمان ہوئے بغیر۔

سنہ ۱۹۱۹ء کا آخر تھا کہ اپنے ایک عزیز سید ممتاز احمد بانسوی لکھنوی کے پاس مثنوی رومی کے چھ دفتر کان پور کے بہت صاف، روشن وخوش نما چھپے ہوئے دکھائی دیے اور طبیعت للچا اُٹھی، ان بچارے نے بڑی خوشی سے ایک ایک دفتر دینا شروع کر دیا ـــــ کتاب شروع کرنے کی دیر تھی کہ یہ معلوم ہوا کہ کسی نے جادو کر دیا۔ کتاب اب چھوڑنا چاہوں بھی تو کتاب مجھے نہیں چھوڑ رہی ہے۔ فارسی استعداد اپنی اس وقت

تھی ہی کیا۔ سیکڑوں، ہزاروں شعر سمجھ میں خاک نہ آئے، اس پر بھی کشش وجاذبیت کا یہ عالم کہ بے اختیار پڑھتا چلا جاتا ہوں اور سر نہیں اٹھا پاتا ہوں۔ دیوانوں کی طرح ایک مستی بے سمجھے بوجھے ہی محسوس کر رہا ہوں! کہاں کا کھانا پینا، اور کیسا سونا، بس جی میں یہی کہ کمرہ بند کر کے خلوت میں کتاب پڑھے جائیے۔ کہیں کہیں آنسو بہائیے، بلکہ کہیں کہیں چیخ بھی پڑیئے! کتاب کے حاشیے غضب کے تھے، خصوصًا "مرشدنا قبلہ عالم" کے قلم سے نکلے ہوئے۔ دیکھنے میں مختصر اور چند لفظی، لیکن سارے شعر کا جوہر و مغز نکال کر رکھ دیا ہے (بعد کو معلوم ہوا کہ یہ "مرشدنا" حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے تھے) ——— یاد نہیں کہ کتاب کتنے عرصے میں ختم کی۔ بہرحال جب بھی ختم کی، تو اتنا یاد ہے کہ دل ممتاز میاں کا نہایت درجہ احسان مند تھا کہ یہ نعمت بے بہا انھیں کے ذریعہ ہاتھ آئی تھی۔ شکوک و شبہات، بغیر کسی رد و قدح میں پڑے، اب دل سے کافور تھے، اور دل صاحب مثنوی پر ایمان لے آنے کے لئے بے قرار تھا! گویا خدا و رسول (نعوذ باللہ) سب کچھ وہی تھے ——— مسلمان بے شک اب بھی نہیں ہوا تھا، لیکن دل ملّتِ کفر سے بالکل ہٹ چکا تھا، اور تشکیک والحاد فرنگ پر لعنت بھیج رہا تھا۔

اسی دور میں تصوّف کی فارسی کتابیں خاصی پڑھ ڈالیں، فریدالدین عطار کی منطق الطیر، جامی کی نفحات الانس وغیرہ۔ جی خوارق و عجائبات میں بہت لگتا تھا، اور کشف و کرامات کے قصے غایت اعتقاد و اشتیاق سے سنا کرتا، لکھنؤ میں اسی گھر میں ایک خالہ زاد بھائی شیخ نعیم الزماں آکر رہے تھے، وہ خود ایک مستقل تذکرۃ الصوفیہ تھے، ان کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا، مزارات

پر حاضری، عُرسوں میں شرکت شروع ہوگئی، لکھنؤ میں بھی اور لکھنؤ کے باہر بھی۔ دیوہ کے حاجی وارث علی شاہ کو تو (نعوذ باللہ) کچھ دن تک حاضر و ناظر ہی سمجھتا رہا ـــــ اسلام سے بُعد مسافت اب روز بروز کم ہو رہا تھا اور ہر قدم اسی طرف بڑھ رہا تھا۔ گو قبر پرستی اور پیر پرستی کی راہ سے ہو کر۔

باب (۳۲)

اسلام کی طرف بازگشت

ان تدریجی اندرونی تبدیلیوں کے ساتھ آہستہ آہستہ اسلام کی طرف آرہا تھا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ ۵۰ فی صدی سے زیادہ مسلمان ہو چکا تھا کہ اکتوبر ۲۰ء میں سفر دکن میں ایک عزیز ناظر یار جنگ جج کے ہاں اورنگ آباد میں قیام کا اتفاق ہوا۔ اور ان کے انگریزی کتب خانہ میں نظر محمد علی لاہوری احمدی (عرف عام میں قادیانی) کے انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن مجید پر پڑ گئی۔ بے تاب ہو کر الماری سے نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ جوں جوں پڑھتا گیا الحمد للہ ایمان بڑھتا گیا۔ جس "صاحبانہ" ذہنیت میں اس وقت تک تھا، اس کا عین مقتضا یہ تھا کہ جو مطالب اُردو میں بے اثر رہتے اور سپاٹ معلوم ہوتے، وہی انگریزی کے قالب میں جا کر مؤثر و جاندار بن جاتے۔ یہ کوئی مغالطہ نفس ہو یا نہ ہو، بہر حال میرے حق میں تو حقیقت واقعہ بن کر رہا ——— اور اس انگریزی قرآن کو جب ختم کر کے دل کو ٹٹولا تو اپنے کو مسلمان ہی پایا۔ اور اب اپنے ضمیر کو دھوکا دیئے بغیر کلمہ شہادت بلا تامل پڑھ چکا تھا ——— اللہ اس محمد علی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اس کا عقیدہ مرزا صاحب کے متعلق غلط تھا یا صحیح مجھے اس سے مطلق بحث نہیں، بہر حال اپنے ذاتی تجربہ کو کیا کروں، میرے کفر و ارتداد کے

تابوت پر تو آخری کیل اسی نے ٹھونکی ——— جس اسلام سے دبے پاؤں، چپکے چپکے باہر نکل گیا تھا، اللہ کی کریمی کہ اسی اسلام میں اسی طرح آہستہ آہستہ پھر داخل ہو گیا اور جس طرح اخراج وارتداد کا وقت بہ قید یوم و تاریخ متعین کرنا دشوار رہا، اسی طرح بازگشت کا بھی دن تاریخ متعین کرنا آسان نہیں۔ لیکن بہر حال اب اکتوبر ۲۰ء میں مکمل ہو چکی تھی۔

ضلالت مطالعہ کے راستہ سے پائی، ہدایت بھی بحمداللہ اس کی راہ سے نصیب ہوئی، اکبر کے مصرعہ

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

کی تصدیق آپ بیتی سے پوری طرح ہو کر رہی، زندہ شخصیتوں کو دخل خاص ان انقلابوں میں کم ہی رہا۔

ہندو فلسفہ اور جوگیانہ تصوّف نے گویا کفر و ایمان کے درمیان پُل کا کام دیا۔ اس معروضہ کو وہ مُتقشّف حضرات خاص طور پر نوٹ کریں، جو ہندو فلسفہ کے نام ہی سے بھڑکتے ہیں اور اُسے یکسر کفر و ضلالت کے مُرادف قرار دیتے ہوتے ہیں، ہدایت کا ذریعہ بھی اسے بآسانی بنایا جا سکتا ہے، اور یہ حضرات اپنے جوش دین داری میں شبلی اور محمد علی لاہوری کی خدمت تبلیغ کو سرے سے نظر انداز نہ کر جائیں، میں نے تو دونوں کی دست گیری محسوس کی بلکہ اسپرٹ آف اسلام والے جسٹس امیر علی کے کام کو بھی حقیر نہ سمجھیں حالاں کہ وہ بچارے تو قرآن مجید کو شاید کلام محمدؐ ہی سمجھتے تھے۔ اپنی سرگزشت کا تو خلاصہ یہی ہے کہ جس فکری منزل میں مَیں اس وقت تھا، حضرت تھانوی جیسے بزرگوں کی تحریروں کو ناقابل التفات ٹھہراتا، ان کی طرف نظر تک نہ اٹھاتا۔ اور ان کے وعظ و

تلقین سے الٹا ہی اثر قبول کرتا۔ غذا لطیف و تقویت بخش سہی، لیکن اگر مریض کے معدہ سے مناسبت نہیں ہوگی تو الٹی مضر ہی پڑے گی۔

دولت ایمان حق تو اب بے شبہ نصیب ہو گئی تھی، لیکن ابھی تک رواجی تصوف (خانقاہی مشیخیت) میں ٹھوکریں کھا رہا تھا، درگاہوں پر حاضری اور عرسوں میں شرکت کا زور تھا۔ آج آستانہ اجمیر پر حاضری دی، تو کل درگاہ خواجہ بختیار قطب کاکی پر، لکھنؤ کی درگاہوں (شاہ مینا، اور صوفی عبدالرحمٰن) کے پھیرے تو ہوتے ہی رہتے اور جوار کے مزارات رُدولی، بانسہ اور دیوہ کے چکر برابر کاٹتا رہتا۔ خصوصی نسبت جاکر حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی سے قائم ہوئی اور مدتوں اسی کے طفیل میں مہمان خواجہ حسن نظامی کا جاکر ہوتا رہا۔ ۱۹۲۱ء کا آغاز تھا کہ لکھنؤ سے دریاباد منتقل ہو آیا اور یہیں کی سکونت اختیار کرلی۔ دو سال متصل عرس اپنے مورث اعلیٰ مخدوم آبکش دریابادی کا دھوم دھام سے کیا اور زوردار محفلیں قوالی کی کرائیں۔ ۲۲ء کی پہلی سہ ماہی تھی کہ وجد آفریں نعتیہ غزلیں مولانا محمد علی کی ہاتھ آگئیں اور ان پر خود بھی غزلیں کہہ کر انھیں قوالوں سے گوایا۔ اتفاق سے دریاباد میں قوال بھی خوب ہاتھ آگئے۔ خصوصاً افضل مرحوم، سماع جیسے روزمرہ کے معمولات میں داخل ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ گریہ بھی طاری ہونے لگا۔ خصوصاً صبح کے وقت کی بھیرویں میں، اور نعتیہ غزلوں پر تو خوب یاد ہے کہ پہلی بار جس مضمون پر آنسو بے اختیار جاری ہو گئے تھے، وہ جامی کی ایک مشہور غزل کا مطلع تھا ؎

بہ خرام باز جلوہ دہ آں سروِ ناز را
پامال خویش کن سر اہل نیاز را

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک سُن، بارہا آنسو بے اختیار بھر آئے، بزرگوں کو خواب میں بارہا دیکھا۔ اور زندہ اہلِ دل و اہلِ طریق کی زیارتیں بھی بارہا ہوئیں۔

یہ دَور کوئی ڈھائی تین سال قائم رہا۔ ۱۹۲۳ء کا غالباً ستمبر تھا، کہ مکتوبات مجدد سرہندی کے مطالعہ کی توفیق ہوئی۔ بڑا اچھا نسخہ، خوب خوش خط و روشن اچھے کاغذ پر، حاشیہ کے ساتھ (مثنوی کے کان پوری ایڈیشن کی طرح)، نَو حصّوں میں امرتسر کا چھپا ہوا مل گیا۔ اس نے طبیعت پر تقریباً ویسا ہی گہرا اثر ڈالا، جیسا تین چار سال قبل مثنوی سے پڑ چکا تھا، فرق اتنا تھا کہ مثنوی نے جوش و مستی کی ایک گرمی سی پیدا کر دی تھی۔ بجائے اِدھر اُدھر کی آوارہ گردی اور ہر صاحب مزار و صاحب آستانہ سے لَو لگانے کے، اب متعین شاہراہ اتباعِ شریعت کی مل گئی۔ منزلِ مقصود متعین ہو گئی کہ وہ رضائے الٰہی ہے، اور اس کے حصول و وصول کا ذریعہ اتباعِ احکامِ مصطفوی ہے ——— مثنوی اور مکتوبات دونوں کا یہ احسان، عمر بھر بھولنے والا نہیں، راہ ہدایت جو کچھ نصیب ہوئی، کہنا چاہیئے کہ بالآخر انھیں دونوں کے مطالعہ کا ثمرہ ہے۔ اور یہ اس صورت میں جب کہ دونوں کا مطالعہ بغیر کسی استاد کی رہ نمائی، اور اپنی کم استعدادی کی بنا پر تمام تر سطحی اور سرسری ہی رہا۔

اب مطالعہ خالص دینی کتابوں کا شروع کیا، اور کالج کی پڑھی ہوئی ٹوٹی پھوٹی عربی کام آئی، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام کی کتابوں کی ورق گردانی شوق و سرگرمی سے کر ڈالی، زیادہ تر اُردو ترجموں کا سہارا لئے ہوئے۔ بحمد اللہ ان علوم کی مُہمات کتب

اُردو میں اکثر منتقل ہو آئی ہیں۔ قرآن مجید کے اُردو اور فارسی ترجمے ہاتھ لگ گئے، سب ایک ایک کر کے کھنگال ڈالے۔ پھر نوبت بیضاوی، کشاف وغیرہ کی آئی، حدیث کے سارے دفتر تو خیر کیا پڑھتا۔ صحاح کے جستہ جستہ مقامات اپنے مذاق کے کچھ نہ کچھ پڑھ ہی لیے، اسی طرح فقہ کی زیادہ مشہور و متداول کتابوں کے، اپنے کام کے ٹکڑے ترجموں اور حاشیوں کی مدد سے دیکھ لیے۔ لغت قرآن، لغت حدیث، لغت فقہ پر جو کتابیں ہاتھ آگئیں، ان سے بھی کام لینے لگا۔ پڑھ ڈالنے کا جو مرض شروع سے تھا، وہ اس وقت بھی کام آیا اور سمجھے اور بے سمجھے بہت سارے اوراق چاٹ گیا۔

لکھنؤ میں ایک صاحب دل بزرگ تھے، مولوی عبدالاحد کسمنڈوی، بظاہر کلکٹری میں ملازم، لیکن صاحب باطن، ان کی خدمت میں بہت شوخ بلکہ ڈھیٹ رہا، متوفی ۱۹۲۹ء جوار بارہ بنکی میں ایک اور بزرگ تھے، مولوی عابد حسین فتح پوری، صاحب علم، متبع شریعت و صاحب نسبت (متوفی ۱۹۲۷ء) ان دونوں سے بھی بقدر اپنے ظرف و بساط کے استفادہ رہا۔ سب سے بڑھ کر استفادہ ایمانی مولانا محمد علی جوہر (متوفی ۱۹۳۱ء) سے رہا۔ دیکھنے میں نہ درویش، نہ عالم، نہ مصلح، لیکن حقیقت میں دس درویشوں کے ایک درویش۔ حرارت ایمانی کے ایک دہکتے ہوئے تنور، عشق رسول و عشق قرآن کو گویا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے، اپنے ایمان میں اگر جان پڑی تو انھیں کے فیض صحبت سے، اخیر ۲۳ء سے اخیر ۳۰ء تک ان سے بارہا ملاقاتیں رہیں، اکثر تو لکھنؤ اور دہلی میں، اور کبھی بمبئی، علی گڑھ وغیرہ میں بھی۔ ہر صحبت ازدیاد ایمان ہی کا باعث ہوتی رہی ——— خلافت کمیٹی ہی کے سلسلے میں نیاز مولانا حسین احمد صاحب سے پہلے کان پور میں دسمبر

۱۹۲۵ء میں حاصل ہوا، پھر دیوبند، لکھنؤ، سہارن پور، اور خود دریاباد میں حاصل ہوتا رہا۔ جولائی ۲۸ء میں انھیں کی وساطت سے رسائی حضرت تھانویؒ تک ہوئی اور حضرت تھانوی سے جس قدر استفادہ دینی، روحانی، اخلاقی حیثیت سے ہوا، وہ حد بیان سے باہر ہے، حضرت ہی کے ایک شاگرد اور بڑے صاحب کمال حاجی محمد شفیع بجنوری (متوفی ۱۱ر ستمبر ۱۹۵۱ء ۸ر ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ) اس درجہ مہربان ہوئے کہ بالکل عزیز قریب معلوم ہونے لگے ——— اللہ ان سب اللہ والوں کو مرتبۂ اعلیٰ سے سرفراز فرمائے۔ ایک بے مایہ عامی وعاصی، ان سب کے احسانات کے عوض میں بجز دعائے خیر کے اور کر بھی کیا سکتا ہے۔

باب (۳۳)

سیاسی زندگی

جب اپنے ہوش کی آنکھیں کھلیں تو مسلمانوں کی مسلّم پالیسی سرکار انگریزی کی تائید و وفاداری کی پائی۔ علی گڑھ تو خیر اس کے لئے مشہور ہی تھا، باقی دیوبند، ندوہ، فرنگی محل، بریلی، بدایوں کیا علماء و مشائخ اور کیا قومی لیڈر اور اخبار سب اسی خیال و عقیدے کے تھے، کہ سرکار کی وفاداری کا دم بھرے جائیے مفادِ ملّی کا عین تقاضا یہی ہے۔ اس شاہراہ سے الگ چلتے تھے، مگر خال خال، اور وہ اِنے گنے افراد، قوم کی لعن طعن کا ہدف بنے ہوئے۔ اپنے صوبہ میں بس ایک حسرت موہانی تھے، اور بمبئی، مدراس و بنگال میں بدرالدین طیب جی وغیرہ۔ سرکار سے وفاداری کوئی چیز عیب و شرم کی نہیں عین ہنر و فخر کی تھی، اور پھر والد ماجد تو خود ایک سرکاری عہدہ دار ڈپٹی کلکٹر تھے، دادا صاحب کو اگرچہ ۱۸۵۷ء میں سزا جرم بغاوت و سازش "کالے پانی" کی سزا نو برس کی ہوئی تھی اور عدالت سے وہ باغی سرکار ثابت ہوئے تھے، لیکن خاندانی روایت یہ تھی کہ سزا بے جا ہوئی تھی اور الزام غلط لگا تھا۔ انھوں نے ایک انگریز کی جان بھی باغیوں سے بچائی تھی ——— میٹرک پاس کر کے (جون ۱۹۰۸ء) تک اپنا بھی یہی رنگ ماحول کی تقلید میں رہا، کالج میں آنے اور لکھنؤ میں قیام کے بعد جب "آزادی" کی ہوا لگی، تو اپنے خیالات

بھی بدلنے اور کانگریس کی طرف مائل ہونے لگے۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء میں کلکتہ سے الہلال مولانا ابوالکلام کی ایڈیٹری میں بڑے آب وتاب اور اہتمام خصوصی کے ساتھ نکلا۔ میں اس سے کچھ زیادہ متاثر نہ ہوا، بلکہ ان کے مخالفین ہی کے گروہ میں شامل رہا۔ اس وقت تک اپنے "پندارِ علم" میں مبتلا تھا اور ان کے علم وفضل کا قائل تھا نہیں، اس وقت تک انھیں محض ایک پرجوش خطیب سمجھے ہوئے تھا، لکھنؤ سے اسی زمانہ میں ایک زوردار ہفتہ وار مسلم گزٹ نکلا، اور کچھ دن مولانا شبلی نے ان کی سرپرستی کی۔ میں اسے اتنا بھی خاطر میں نہ لایا۔ اکتوبر ۱۲ء میں لکھنؤ سے بی، اے کرنے کے بعد ایم اے کرنے علی گڑھ گیا، وہاں طلبہ میں خوب جوش وخروش برطانیہ کے خلاف تھا۔ جنگ بلقان کے سلسلہ میں، میں اس سے بھی الگ تھلگ رہا، اسے علمی وقار کے منافی سمجھتا رہا۔ لکھنؤ میں مسلمانوں کے جو جلسے انتخاب جداگانہ کے سلسلے میں ہوتے تھے، ان میں البتہ خوب شوق سے شریک ہوتا۔ یہ رنگ ۱۳ء، ۱۴ء بلکہ ۱۶ء تک رہا۔ دسمبر ۱۶ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں خوب دھوم دھام سے ہوا، اس میں شریک ہوا، مگر محض تماشائی کی حیثیت سے۔ صرف جلسہ کی سیر اور بہار دیکھنے، مولانا محمد علی کی ذات سے البتہ بڑی عقیدت تھی، اس لئے قدرۃً ان کے انگریزی کامریڈ اور ہمدرد سے بھی۔ لیکن یہ عقیدت بس اسی حد تک تھی کہ ان کی تحریریں بڑی دل چسپی سے چٹخارے لے لے کر پڑھتا۔ باقی ان کی سیاسیات میں ان کا شریک نہ تھا۔ ہمدرد کے لئے کچھ ترجمے انگریزی سے کرکے بھیجے، لیکن وہ اصول سیاست پر علمی رنگ کے تھے، عملی مسائل حاضرہ سے انھیں سروکار نہ تھا۔ البتہ ۱۷ء میں جب حکومت نے مسز بسنٹ جیسی آفاقی شخصیت رکھنے والی کو تحریک ہوم رول کے سلسلہ میں گرفتار ونظربند کردیا، تو اس دھماکے سے سالا

ملک دَہل گیا، اور مجھ پر بھی ایک جوش کا عالم طاری ہوگیا۔ پھر حیدرآباد بہ سلسلۂ ملازمت چلا گیا اور سیاست سے بےتعلقی جوں کی توں باقی رہی۔ ۱۹ء سے تحریک خلافت و ترک موالات کا زور بندھا اور ہر روز ہر جگہ جلسے ہونے لگے۔ اور جلوس نکلنے لگے، اور مجھے جو عقیدت گاندھی جی اور مولانا محمد علی کے ساتھ تھی، اس کے تقاضے سے ان جلسے جلوسوں میں شریک تو ہونے لگا لیکن کسی اور عملی قدم پر آمادہ نہ ہوا، عقیدت ان دونوں سے برابر بڑھتی رہی اور مارچ ۲۲ء میں عُرس خواجہ اجمیری کے موقع پر اجمیر جاکر گاندھی جی سے ملا۔ مولانا تو اس وقت جیل میں تھے، بلکہ مولانا کے جیل جانے کی خبر سنتے ہی میں نے بھی پلنگ پر لیٹنا چھوڑ دیا کہ مولانا کو جیل میں کہاں پلنگ ملتا ہوگا! مولانا کی رہائی پر اگست یا ستمبر ۲۳ء میں بھوالی جاکر ان سے ملا، اور پھر دسمبر ۲۳ء میں جب وہ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تو ان کے حسب طلب علی گڑھ جاکر ان کے ضخیم خطبۂ صدارت کا ترجمہ دوسروں کے ساتھ مل کر انگریزی سے اُردو میں کیا۔

اکتوبر ۲۴ء سے مولانا نے ہمدرد دہلی سے از سرِ نو جاری کیا اور اب کی میں اس میں پوری طرح شریک رہا اور شروع ۲۵ء سے دوسروں کی شرکت سے ہفتہ وار سچ نکالا، اور پھر اس کا تنہا ایڈیٹر ہوگیا۔ اور چند سال بعد صدق نکالا۔ اس سب کا تفصیلی ذکر اپنی صحافت کے ذیل میں کر چکا ہوں۔

تحریک خلافت کا زور ۲۴ء ہی میں گھٹ گیا تھا۔ اور ۲۵ء میں تو تحریک نیم مردہ ہو چکی تھی، دسمبر ۲۵ء میں اودھ کی صوبہ خلافت کمیٹی کے نئے انتخابات ہوئے اس میں لوگوں نے اصرار کر کے اس کا صدر بنا دیا۔ پھر مرکزی خلافت کمیٹی کا بھی ممبر ہوگیا

فروری ۲۷ء میں لکھنؤ میں خلافت کانفرنس کا جلسہ ہوا، میں مجلس استقبالیہ کا صدر تھا، جو خطبہ اس میں پڑھا، میری توقع و اندازے سے کہیں زیادہ حسن قبول حاصل ہوا اور مولانا محمد علی نے بڑھ کر گلے لگا لیا اور پیشانی اور داڑھی کے خوب بوسے لئے۔

اس کے بعد خلافت کمیٹی کے جلسوں میں برابر شریک ہوتا رہا۔ اور صوبہ کمیٹی کا صدر بھی غالباً چار سال تک رہا۔ مولانا محمد علی کی زندگی بھر انھیں کو اپنا سیاسی پیشوا سمجھتا رہا۔ ان کے فہم و اخلاص دونوں پر سو فی صدی اعتماد تھا۔ ان کے بعد سے کوئی لیڈر اس پایہ کا نہ ملا۔ اور اسی لئے بعد کی کسی تحریک مسلم لیگ وغیرہ میں عملاً نہ شریک ہوا۔ گو اعتماد بہادر یار جنگ (متوفی ۴۲ء) اور چودھری خلیق الزماں (متوفی ۵۴ء) پر بعد کو برابر رہا کیا۔ ۲۸ء میں دو سکھ لیڈر سردار کھڑک سنگھ اور سردار منگل سنگھ لکھنؤ آئے، اور مولانا محمد علی بھی لکھنؤ میں تھے، تینوں کے لئے گنگا پرشاد میموریل ہال میں ایک بڑی میٹنگ ہوئی، صدر جلسہ چودھری خلیق الزماں کو کچھ دیر کے بعد ضرورت چلے جانے کی پیش آگئی، مجھے اپنی جگہ صدارت کی کرسی پر بٹھا گئے ——— اس ہال میں اسی سنہ میں ایک بڑا جلسہ ولایت سے آتے ہوتے سائمن کمیشن کی مخالفت میں منعقد ہوا، اس میں ایک مختصر سی تقریر مجھے بھی کرنا پڑی ——— ۱۹۳۲ء میں کسانوں کی تحریک کے سلسلہ میں پنڈت جواہر لال نہرو دورہ کرتے ہوئے دریاباد بھی آئے میٹنگ ہوئی اور اس کی صدارت مجھے کرنا پڑی۔

پاکستان کے قیام کا میں اصولاً حامی تھا کہ اس سے مسلمانوں کو ایک ہوم لینڈ ہاتھ آیا جاتا ہے، لیکن تحریک جس رُخ پر چلی اور جو جو مرحلے پیش آتے رہے ان سے میرا کوئی تعلق کبھی نہ رہا، اور تقسیم ملک کا انجام مسلمانان ہند کے لئے اتنا دردناک

اور اَلم انگیز ہوگا اس صورت حال کا تو کوئی اندازہ ہی نہ تھا ____ مسلمانوں پر جو کچھ گزری، اور اب تک جو گزر رہی ہے اس پر دل خون کے آنسو روتا ہے اور دل بار بار یہ سوال کرتا ہے کہ ہجرت اگر اب بھی فرض نہ ہوگی تو پھر کب ہوگی؟ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوٓا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ۔ جمعیۃ العلماء کے کارکنوں میں لے دے کے حفظ الرحمٰن تھے وہ بھی ۱۹۶۳ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

۱۹۴۶ء میں سالم و غیر منقسم ہندوستان میں آخری الکشن ہوتے تھے، اس میں مسلم لیگ کے امیدواروں کو شاندار فتح حاصل ہوئی تھی، جب وہ منظر یاد آجاتا ہے تو جیسے کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ کس طرح گلی گلی گھر گھر، اللہ اکبر کے نعرے لگ رہے تھے! کون جانتا تھا کہ اس سرزمین پر اللہ کے نام کی یہ آخری پکار جلوسوں کی شکل میں ہے! اب کبھی یہ سننے میں نہ آئیں گے۔ اور نہ کبھی شکل محمد علی اور بہادر یار جنگ تو خیر کیا، چودھری خلیق الزماں تک کی دکھائی دے گی! رہے نام اللہ کا۔

باب (۳۴)

بیعت و ارادت

اپنا خاندان علاوہ ایک صاحب علم خاندان ہونے کے ایک نیم صوفی خاندان بھی تھا، اور چند پشت قبل تک مشرب چشت رکھتا تھا، پھر رفتہ رفتہ قادریت غالب آگئی۔ بچپن میں نمونے اس رواجی تصوّف اور رسمی پیرزادگی کے اپنے خاندان میں اچھے خاصے دیکھنے میں آئے تھے، اور کم سنی ہی میں بزرگوں کے ملفوظات اور مناقب غوث اعظم اور بڑی گیارہویں قسم کی کتابیں خاصی پڑھ ڈالی تھیں، "غوث اعظم" سے عقیدت تو خیر، البتہ ان کے نام کی ہیبت اور ان سے دہشت دل میں بیٹھ گئی تھی، بلا وضو ان کا نام تک لیتے ہوئے ڈرتا تھا، خیر جب بڑا ہو کر کالج میں پہنچا، تو تصوف اور قادریت کیا معنی، خود اسلام ہی دل سے رخصت ہو چکا تھا۔ سالہا سال کے بعد جب کفر و ضلالت کے بادل چھٹنے لگے، تو پہلی روشنی، دھیمی اور دھندلی جو نظر آئی، وہ ہندو تصوّف اور جوگ ہی کی تھی۔ جوگ بششٹ وغیرہ اردو میں اور بھگوت گیتا وغیرہ انگریزی میں پڑھ کر، عقیدت ہندو بزرگوں سے پیدا ہوئی اور کرشن جی سے علی الخصوص، اس عبوری دور کے بعد جب دامن مسلمان صوفیہ کا ہاتھ آیا تو پہلا سابقہ، بے قید قسم کے فقیروں، مجذوبوں اور نیم مجذوبوں سے پڑا، اور ایک مدت تک

ان کے مستانہ نعرے، کرامات و عجائب، ہُوحق کی محفلیں، قوالی کی مجلسیں بھی مرکز عقیدت بنی رہیں۔ مزارات اور درگاہوں کی زیارت، اور عرسوں کی شرکت ہی کو حاصل تصوف اور مآل درویشی سمجھتا رہا۔ جامی وغیرہ کی غزلوں اور اُردو اور ہندی کے بعض اور کلام پر لوٹ جایا کرتا، خدا خدا کرکے وہ دَور بھی ختم ہوا، تصوف کی کتابوں میں سب سے بڑا اور گہرا اثر، مثنوی معنوی کا پڑا، اس نے جیسے زندگی کا رُخ ہی پلٹ دیا۔ پھر غزالی، جیلانی، جیلی وغیرہم کی کتابوں سے مستفید ہوا اور آخر میں سب سے زبردست اثر مکتوبات مجدد سرہندی کا پڑا۔ اور اب ٹھیٹھ اسلامی تصوّف کا قائل ہوا۔ محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم بڑے شوق سے کئی بار پڑھنا چاہی مگر جی نہ لگا، فارسی شرحیں بھی پڑھیں، اور ترجمہ بھی دیکھا، مگر ہر دفعہ یہ کتابیں کھول کر بس بند ہی کر دیں۔

صحبتیں بعض طویل اور بعض سرسری و مختصر، وقت کے اچھے اچھے اہل دل و ارباب طریق سے رہیں، بعض نام ایک پچھلے باب "اسلام کی طرف بازگشت" میں آچکے ان کے علاوہ لکھنؤ کے مولانا عین القضاۃ اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی، اور پھلواری کے شاہ سلیمان، اور حیدرآباد کے مولوی شاہ محمد حسین اور کمال احمد شاہ اور شیخ حبیب العیدروس اور صفی پور کے شاہ عزیز اللہ قابل ذکر ہیں، مگر اتنی عقیدت کسی سے بھی نہ ہوئی کہ بیعت کی خواہش کرتا۔ مولانا محمد علی کا نام اس سلسلہ میں بظاہر بالکل بے محل نظر آئے گا، لیکن اخلاص، تدیّن، رسوخ فی الدین، بے ریائی، حُبِ رسولؐ، غیرت ایمانی اگر کوئی چیز ہیں تو محمد علی اس معیار پر کھرے اور پورے اُترے ارادہ بار بار ان سے بیعت کا ہوا، اور رہ رہ گیا۔

کچھ برائے نام مشقیں ان میں سے بعض بزرگوں کی بتائی شروع کیں از قسم ذکر و شغل، کچھ زیادہ چل نہ سکیں، کچھ تھوڑی بہت کوشش کشف قبور کی کی، یہ گاڑی بھی چل نہ سکی، علمی رنگ میں ملفوظات رومی، فیہ مافیہ کو قلمی نسخوں کی مدد سے صحت کر کے چھاپا، کتاب تصوف اسلام لکھی، اور پھر آخر میں مناجات مقبول کی شرح چھاپی، ابوالقاسم العارف کا عربی رسالہ القصد الی اللہ کا قلمی نسخہ کسی کتب خانہ سے ڈھونڈھ نکالا۔ اور کیمبرج کے پروفیسر نکلسن کو طبع و اشاعت کے لئے بھیج دیا۔ کچھ مضمون بھی اُلٹے سیدھے اسی تصوّف کے موضوع پر لکھ ڈالے، غرض آیا گیا کچھ خاک نہیں، ایک جھوٹا رُعب عوام کے دلوں پر، صوفیہ و مشائخ کی بولی بول کر قائم کرلیا۔ اور حضرت رومی کا قول اپنے ہی حسب حال نظر آیا ؎

حرف درویشاں بہ دوزد مردِ دُوں
تا بہ خواند بر سلیمے آں فسوں

۱۹۲۶ء ہوگا، جب سے تلاشِ مرشد شروع ہوئی، اور ہر متبع سُنّت، جامع شریعت و طریقت بزرگ کو ٹٹولنا شروع کیا۔ ۲۷ء میں دربار صفی پور (ضلع اُناؤ) کا سفر اسی نیت سے کیا، ایک بڑے معمّر بزرگ عزیز اللہ اس وقت تک زندہ تھے، ان کی نعتیہ غزل، محفل قوالی میں سُنی ہوئی، دل پر اثر کر چکی تھی ؎

دو عالم بہ کاکل گرفتار داری — ہر بر مُو ہزاراں سیہ تار داری
زِ سر تا بہ پا رحمتی یا محمّد — نظر جانبِ ہر گنہ گار داری

بڑے مرتاض نکلے، یقیناً مقبولین میں ہوں گے، مگر جو بات دل میں تھی، وہ نہ ملی۔

بعض دوستوں نے مولانا حسین احمد دیوبندی کا نام بھی پیش کیا، اسے بھی دل میں لئے رہا۔ خلافت کمیٹی کے سلسلہ میں ان سے نیاز اخیر ۱۹۲۵ء میں ہو چکا تھا۔ شخصیت بڑی دل کش و جاذب نظر آئی، خصوصاً ان کی تواضع و انکسار، اور عبادات پر مواظبت، بہ حیثیت مرشد ان کی شہرت اس وقت تک نہیں ہوئی تھی، حضرت تھانوی کا نام اس وقت تک محض ایک مشہور فقیہ کی حیثیت سے سننے میں آیا تھا، اور تحریک خلافت کے وہ سخت مخالف تھے، اس لئے ان کی بزرگی اور روحانی عظمت تسلیم کرنے کو دل بالکل تیار نہ تھا۔ اور یہ نقش دل میں خود مولانا ہی کے متقشف مریدوں نے اور گہرا بٹھا دیا تھا۔

۲۷ء کی آخری سہ ماہی تھی، کہ ایک مخلص وصل بلگرامی نے حضرت کے کچھ وعظ تلاش مرشد میں میرے شوق و اشتیاق کو دیکھ کر پڑھنے کو دیئے۔ اور میں نے بے دلی سے لے لئے ـــــ اب کھولنا اور پڑھنا جو شروع کیا تو دل بند کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جی ایسا لگا کہ ایک عالم ہی دوسرا نظر آنے لگا، نظر اتنی حکیمانہ، باتیں اتنی دل نشین، گہری اور عارفانہ کہ مواعظ و ملفوظات کی دوسری کتابوں سے کوئی مناسبت ہی نہیں پڑھتے ہی پڑھتے امراض قلب کے متعلق ان کی حکیمانہ تشخیص دل میں بیٹھ گئی اور دماغ ان کی بزرگی اور درویشی کا کلمہ پڑھنے لگا۔ لیکن وہ جو دل میں مدت سے مولانا کی شدت کی دہشت بیٹھی ہوئی تھی، اس نے خواہش بیعت سے روکا۔ آخر سوچ بچار کے بعد خط مولانا کی خدمت میں لکھا، کہ آپ کے وعظ پڑھ پڑھ کر آپ کا غائبانہ معتقد ہو گیا ہوں لیکن اپنی پست ہمتی کی بنا پر آپ سے بیعت ہونے کی ہمت نہیں پڑتی، آپ کی حذاقت فن سے البتہ پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں کہ بیعت کسی نرم مزاج بزرگ سے ہوں مگر آپ

ہی کے حسب مشورہ و ہدایت، میرے لئے انتخاب آپ ہی کسی بزرگ کا فرمائیں، اور آگے بہ طور مثال و نمونہ دو نام بھی درج کر دیئے تھے، ایک مولانا حسین احمد صاحب مدنی دوسرے مولانا انور شاہ کاشمیری ـــــــ حضرت کے ہاں سے جواب آیا مشفقانہ و ہمدردانہ، مگر کچھ اس رنگ کا کہ سلسلہ مراسلت آگے نہ بڑھ سکا، اور بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔

رفیق قدیم مولوی عبدالباری صاحب ندوی بھی اتفاق سے اسی زمانہ میں اسی تلاش مرشد کے چکر میں مبتلا تھے، جولائی ۲۸ء کا آغاز تھا کہ انھیں ساتھ لے، پہلے دیوبند پہنچا، اور انھیں نے درخواست بیعت کی مولانا حسین احمد صاحب سے کی، اس میں ایک بڑا دخل سیاسی ہم مزاجی کو حاصل تھا۔ اور ایک دن کی یکجائی کے بعد مولانا کی رائے سفر تھانہ بھون کی ہوئی۔ تینوں کا قافلہ آدھی رات کو خانقاہ تھانہ بھون پہنچا۔ سناٹے کا وقت ـــــــ سب سوتا پڑا ہوا تھا۔ دل اس وقت بھی حضرت تھانوی کی بیعت سے لرز رہا تھا، اور اس وقت کے عقائد کے لحاظ سے یقین تھا کہ حضرت پر یہ ساری کیفیت روشن ہو گی، گویا نعوذ باللہ حاضر و ناظر ہیں! خیر بعد فجر پیشی ہوئی، اور اسکے بعد مولانا نے تخلیہ میں حضرت سے سفارش کی کہ وہی اپنی بیعت میں ہم دونوں کو لے لیں۔ حضرت اپنے اصول و ضوابط کے لحاظ سے بیعت کے معاملہ میں کسی سعی و سفارش کو کیسے قبول کرتے۔ اور مولانا کو جواب دیا کہ نہیں، ان لوگوں کے خیالات کی نوعیت کے لحاظ سے آپ ہی ان کے لئے موزوں ہیں۔ مولانا نے کچھ اور اصرار کیا اور ازراہ انکسار اپنے کو اس منصب کا نااہل بتایا۔ مگر حضرت کی مدلّل گفتگو کے آگے کون پیش پا سکتا تھا۔ آخر ہم لوگ دیوبند واپس آئے، اور یہاں مولانا نے تخلیہ میں لے جا کر

ہم دونوں کو بیعت کرلیا۔ اور ہم لوگوں سے کہا کہ اسے مخفی ہی رکھتے گا ـــــ اس وقت تک مولانا کے مریدوں کی تعداد بس خال ہی خال تھی۔

مولانا سے عقیدت کچھ روز تک خوب زور شور سے قائم رہی، اور مولانا کے اس تحریری ارشاد کے بعد بھی قائم رہی کہ آپ لوگ حضرت تھانوی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیں، لیکن جوں جوں تجربے اور سابقے زیادہ پڑتے گئے، اسے کیا کیجئے کہ ایسے ایسے تجربے پیش آئے، جو عقیدت کو بڑھانے والے تو کیا، اس کی بنیادیں ہلا ڈالنے والے تھے، پُرانے زمانے کے بزرگ عموماً دنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے، ان کا اور ان کے مُسترشدین کا معاملہ بس ذکر و شغل، اوراد و وظائف وغیرہ مسائل سلوک و روحانیت تک محدود رہتا تھا۔ مشکل یہ آپڑی کہ مولانا اس قسم کے بزرگ نہ تھے، کثرت سے دنیوی تحریکوں، اور پبلک اداروں میں ہر طرح شریک و دخیل تھے، اور یہ کسی طرح ممکن نہ ہوا کہ سیکڑوں زیر بحث مسائل ہیں، مرشد و مُسترشد کا ضمیر ایک ہی فیصلہ پر پہونچے!

مسلم یونیورسٹی، مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء، ندوہ، دیوبند، خلافت کمیٹی، چھوٹے بڑے کتنے جلسوں میں بے اندازہ جزئی سوالات میں رائے زنی ان ممدوح کو بھی کرنا پڑتی اور مُجھ ہیچ میرز کو بھی، اور کوئی صورت اس کی بن نہ پڑی کہ اتباع شیخ سو فیصدی نہ سہی، ۹۰ اور ۹۵ فی صدی میں کر سکتا، مسلم یونیورسٹی کے فلاں ملازم کو ترقی دی جائے یا نہیں، صوبہ کونسل کے لئے ووٹ فلاں کو دیا جائے یا فلاں کو۔ فلاں سیاسی مسئلہ میں مسلمانوں کی پالیسی کیا رہے؟ جمعیۃ العلماء کی صدارت اس سال کس کو ملے! فلاں امتحان

ہیں فلاں طالب علم کو نمبر میں اس کے جوابات کے لحاظ سے دوں یا اس کا لحاظ رکھوں کہ وہ مولانا کا مُرید ہے۔ اس قسم کے بے شمار مسائل آئے دن پیش آنے لگے، اور اس بار کا تحمل وہ نازک رشتہ نہ کر سکا، جو مرشد کے درمیان ہونا چاہیئے، مولانا کی ریاضتیں اور عبادات ہیں ان کی جفاکشی، رمضان ہیں ان کی شب بیداریاں ان کا انکسار و تواضع، ان کی سیر چشمی و عالی ہمتی، ان کا بذل و ایثار، ان کا جذبہ خدمت خلق، بڑوں کی عظمت و خدمت، اور چھوٹوں پر شفقت و مرحمت، یہ اور اسی قسم کے ان کے بہت سے فضائل مسلّم ہیں، یہاں سوال ان کا نہیں، صرف رشتہ پیری مریدی کا ہے۔

نتیجہ اس ساری کش مکش کا قدرتہً یہ نکلا کہ مرکز عقیدت بجائے دیوبند کے، تھانہ بھون ہی میں خوب مستحکم ہوگیا۔ اور زندہ و عملی تعلق، سلوک و اصلاح کا اپنے ظرف و بساط کے لائق، حضرت تھانوی ہی سے ان کے وقت وفات (جولائی ۱۹۴۳ء تک قائم و برقرار رہا —— اپنے ہر نفسانی مرض کے علاج و تدبیر کے لیے" اپنے ہر دینی و روحانی اشکال کے لئے، اپنے خوابوں کی تعبیر کے لئے برابر حضرت ہی کو زحمت دیتا رہا۔ علاوہ سلسلہ مراسلت کے بار بار سفر کر کے تھانہ بھون حاضر ہوتا۔ کبھی چند گھنٹوں کے لئے بھی اور زیادہ تر کئی کئی دن اور کئی کئی ہفتوں کے لئے، اور عجب پُر بہار، پُر سرور، پُر کیف، پُر لطف، وہ وقت ہوتا جو تھانہ بھون میں گزرتا! کبھی کبھی گھر والوں کو بھی ساتھ لے گیا، حضرت کے لطف و کرم نے بے تکلفی بالکل عزیزوں کی سی پیدا کر دی تھی۔

بزرگ اور بھی بہت دیکھنے میں آئے، سب اپنی اپنی جگہ قابل تعظیم و احترام

لیکن بہ حیثیت مصلح، مزکی معلّم و مرشد حضرت کو فرد و فرید پایا، جس طرح ملّی و سیاسی لیڈر کی حیثیت سے محمد علی کو پایا تھا۔ اپنی اس محرومی و حرمان نصیبی کو کیا کہیئے کہ اتنی رسائی ہو جانے کے بعد بھی بے مایہ و تہی دست ہی رہا۔ اور جو اول میں کورا تھا وہ آخر تک کورا ہی رہا —— پڑھنے والے جب اس مقام پہنچیں تو حسبۃً للہ اس ناکارہ و ننگ خلائق کے حق میں دعائے خیر فرمادیں۔ یہ کسی قسم کا مطالبہ نہیں، محض ایک بھیک ہے۔

باب (۳۵)

تصنیف وتالیف نمبر (۱)

اسکول کے آٹھویں درجہ میں پڑھتا تھا، اور عمر ہوگی یہی کوئی ۱۳ سال کی، کہ جی میں شوق کتاب لکھنے کا چرایا۔ مضمون نگاری پر ہاتھ ایک آدھ سال قبل ہی ڈال چکا تھا، اودھ اخبار کے ذریعہ سے، اس لئے اس نئی اُپج میں کوئی غیر معمولی انوکھا پن نہ تھا ـــــ لیکن بہرحال اس سن میں "کتاب" لکھ ڈالنے کی استعداد کہاں سے لے آتا؟ ہوا یہ کہ اس زمانہ میں شوق مذہبی مناظرہ کا سمایا ہوا تھا، خصوصاً عیسائیوں سے، مونگیر (صوبہ بہار) کے ایک فاضل تھے، مولانا محمد علی رحمانی جو آگے چل کر ناظم ندوۃ العلماء ہوئے، وہ کان پور سے ایک ماہ نامہ تحفہ محمدیہ نامے، عیسائیوں کے رد میں نکالتے تھے، بس اسی کے چند نمبر والد صاحب کے کتب خانہ میں نکل آئے، انھیں معلومات کو، ترتیب تھوڑی سی بدل کر ایک کاپی پر خوش خط نقل کر لیا بس یہی کل کائنات اس "کتاب" کی، آج کتاب کی اس بساط پر ہنسی آتی ہے، لیکن افسوس بھی ہو رہا ہے کہ وہ ورق محفوظ کیوں نہ رہے، ورنہ اس کا کچھ نہ کچھ نمونہ یہاں ضرور درج کیا جاتا، اس سن کے چند سال بعد جب "عقلیت" اور "روشن خیالی" کا زور ہوا تو جوش کے عالم میں وہ سارے ورق پارہ پارہ کر ڈالے! ـــــ انسان کی زندگی بھی

کیسے اُلٹ پھیر کی نذر ہوتی رہتی ہے۔ آج کا ہنر کل عیب بن جاتا ہے، اور پرسوں پھر وہی عیب ہنر نظر آنے لگتا ہے، بچپن کے شوق جوانی میں قابل مضحکہ بن جاتے ہیں، اور سن کہولت پر پھر ان کی یاد حسرت کے ساتھ آنے لگتی ہے!

نویں درجہ میں آیا، تو غلبہ ادبی ذوق کا ہوا، شعر و شاعری ناول و ڈراما وغیرہ۔ اور اُردو کے ساتھ خیر سے انگریزی کے متعلق بھی کچھ دعویٰ سا ہو گیا۔ مشہور یونانی سافو کلیز SAPHOCLES کا ایک چھوٹا سا ڈراما انٹی گان ANTIGONE پڑھا اور پسند آیا، اور جی میں آیا کہ اسے اُردو قالب میں ڈھالئے، شکسپیر کے دو ایک ڈراموں کے اردو ترجمے دیکھ چکا تھا، اور انھیں کو دیکھ کر اس ترجمہ کی لہر دل میں اٹھی تھی۔ افسوس ہے کہ اس کا بھی نہ کوئی پرزہ کاغذ محفوظ ہے، نہ حافظہ ہی میں اس کی کوئی یاد تازہ، یہ نظر آجاتا کہ میں بر خود غلط اس وقت کتنے پانی میں تھا۔

۹ء آیا اور میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا (کیننگ کالج لکھنؤ) کہ دو مقالے ذرا بڑے بڑے وکیل (امرت سر) کے لئے لکھے، اس وقت مسلمانوں کا اونچا اور با اثر سہ روزہ تھا۔ ایک عنوان تاریخی تھا اور موضوع کلامی، یعنی محمود غزنوی، اور اس میں تاریخ یمینی وغیرہ پڑھ کر دکھایا یہ تھا کہ سلطان محمود پر بخل وغیرہ کے جو الزام لگائے گئے ہیں، وہ صحیح نہیں۔ یہ مولانا شبلی کے رنگ کا مضمون انھیں کی کتابوں کے مطالعہ کا ثمرہ تھا۔ دوسرا عنوان طبی تھا اور موضوع اسی طرح کا کلامی، یعنی غذائے انسانی اس میں ڈاکٹری کتابوں کے حوالے سے یہ دکھایا تھا کہ انسان کے دانت، اور انسان کے آلات ہضم وغیرہ سب اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ انسان کی قدرتی غذا علاوہ نباتات وغیرہ کے گوشت بھی ہے۔ دونوں مقالے رسالوں کی شکل میں وکیل بک ٹریڈنگ

ایجنسی نے ۱۹۰۸ء میں چھاپ دیئے، اور اخبار کے مالک منشی غلام محمد مرحوم کے دو خط بھی مقالوں کی داد وتحسین میں آئے۔ ان سے بڑی حوصلہ افزائی ہوئی، دوسرے جاننے والوں نے بھی خوب واہ واہ کی۔ غذائے انسانی کا ایک نسخہ تو آفتاب سلمہ (حکیم عبدالقوی) کے پاس موجود تھا، اور محمود غزنوی کا قلمی مسودہ بھی اپنے کاغذات کی الٹ پلٹ میں مل گیا۔ اس سن میں مَیں اچھا خاصہ خوش خط تھا۔ ۱۹۰۹ء کے دور الحاد میں انتہائی عقیدت کا مرکز ایک برطانوی فلسفی جان اسٹورٹ مل تھا، اسے خوب پڑھا، بلکہ چاٹا تھا، اس پر ایک چھوٹی سی کتاب کا مسودہ انگریزی میں تیار کر ڈالا، نام بھی مل ہی کی تقلید میں خوب لمبا چوڑا سا رکھا، غالباً یہ تھا J. S MILL: ABILOGRAPHICAL SKETCH, WITH THE CRITICAL REVIEW OF SOME OF HIS WRITINGS چھپواتا تو خیر کیا، خود ہی پڑھ پڑھ کر اس سے لطف لیتا اور دوسروں کو سناتا رہتا —— چند سال ادھر تک اس کا مسودہ میرے کاغذات میں محفوظ تھا، خدا معلوم اب بھی ہے یا نہیں۔ ۱۹۱۲ء تھا کہ ہکسلے پر اردو میں لکھنا شروع کیا، اور کئی باب لکھ ڈالے، خوب یاد ہے کہ ایک لمبی مجلّد کاپی پر اسے خوب خوش خط لکھ لیا تھا، اور اسے معنون اپنے علمی و تصنیفی محسن مولانا شبلی کے نام سے کیا تھا، یہ مسودہ سالہا سال تک محفوظ رہا پھر اس کے بعد ایک روز دین داری کے جوش میں آکر اسے چاک کر ڈالنا بھی یاد ہے، افسوس کے ساتھ۔

سائیکالوجی (نفسیات) اس وقت تک سائنس کی نہیں، فلسفہ کی شاخ تھی، میری خصوصی دل چسپی کی۔ سائنس کی آمیزش سائیکالوجی میں ہم لوگ بڑی حقارت سے دیکھتے تھے، اور جرمنوں نے جو ملغوبہ تیار کیا تھا اسے PYSCIO - PHYSICS

کہہ کر اس پر ہنستے بھی تھے، ۱۳ء سنہ تھا اور بی، اے کئے ہوئے مجھے ابھی چند ہی مہینے ہوئے تھے کہ ایک مستقل کتاب دو ڈھائی سو صفحہ کی فلسفہ جذبات کے نام سے لکھ ڈالی (نفسیات جذبات اس وقت بالکل ہی نامانوس نام ہوتا) مولوی عبدالحق اس وقت نئے نئے سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہوئے تھے، انھوں نے اس کتاب کی قدردانی کی، کتاب ۱۴ء کے اوائل میں چھپی، اور بابائے اُردو نوآموزوں کی ہمت افزائی کے لئے اس وقت بہت ممتاز تھے، خواجہ غلام الثقلین کے مشورے سے انھوں نے ایک روپیہ فی صفحہ کے حساب سے اس کے ڈھائی سو مجھے دیئے۔ وقت کے معیار اور میری نوآموزی کو دیکھتے ہوئے یہ رقم دو ڈھائی ہزار کی تھی، کتاب ”تصنیف“ تو کسی معنی میں بھی نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی، زیادہ سے زیادہ ایک اچھی تالیف کہی جا سکتی تھی، دس بارہ انگریزی کتابیں سامنے رکھ کر انھیں کو اُردو میں اپنا لیا تھا۔ خوب دھوم مچی اور اپنے محدود حلقہ میں ہر طرف واہ واہ ہوئی —— دوسرا ایڈیشن نظرثانی کے بعد ۱۹۱۹ء میں نکلا، اور تیسرا نظر ثالث کے بعد ۱۹۳۰ء میں بھی۔

۱۲ء میں مولانا شبلی سیرۃ النبی کا کام بڑی کاوش و اہتمام سے کر رہے تھے، شاید میری بے شغلی پر نظر کر کے انگریزی معلومات کے لئے مجھے اپنے اسٹاف میں لے لیا۔ بعض کتابوں کے نام انھیں نے بتائے، بعض میں نے تجویز کئے، پچاس روپے ماہوار معاوضہ طے پایا، اور ان کی تاکید رہتی تھی کہ ”لائبریریوں میں آنا جانا لکھنا لکھانا سب ملا کر دو گھنٹہ روز سے زیادہ وقت نہ صرف کیا کرو“۔ ۱۴ء کے پچاس روپے آج کے تین سو بلکہ ساڑھے تین سو کے مساوی تھے، گھر بیٹھے اتنی بڑی رقم اس وقت ایک نعمت

معلوم ہوئی۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق دونوں کے یہ احسان عمر بھر بھولنے والے نہیں۔ شہرت و ناموری تو خود خریدار و قدر دان دینے لگتی ہے، قدر تو اس وقت ہوتی ہے جب مصنف نوآموز و گمنام ہوتا ہے ـــــ یہ سیرۃ النبی کے لئے مواد فراہم کرنا ظاہر ہے کہ خود کوئی تصنیفی کام نہ تھا، لیکن اس کی طرف ایک اہم اقدام ضرور تھا۔ اور مولانا شبلی کے سے جید اہل قلم کا فیض صحبت بجائے خود ایک نعمت تھا۔

سنہ ۱۹۱۴ء تھا کہ ایک کالجی رفیق کی فرمائش پر ایک چھوٹا سا تعلیمی رسالہ فرائض والدین کے نام سے چٹ پٹ تیار کر کے انھیں دے دیا، اس وقت میں تعلیم کی کتابیں خوب گھوٹا کرتا تھا۔ رسالہ "ایک خادمِ تعلیم" کے نام سے چھپا اور ان صاحب نے سَو کی نقد رقم لاکر میرے ہاتھ میں رکھ دی۔ بے معاشی کے اس دَور میں اس کی بڑی ہی قدر ہوئی ـــــ خیر، یہ تو ایک ایک بالائی آمدنی ہوگئی۔ سنہ ۱۳ء میں ایک بڑا سا مقالہ انگریزی میں PSCHO LOGY OF LEDERSHIP کے نام سے لکھا اور ٹائپ کرا کے اسے برطانیہ کے نامور ماہ نامہ نائنٹینتھ سنچری میں چھپنے کے لئے بھیجا۔ اس میں وہ کیا چھپتا، شکریہ کے ساتھ واپس آیا، اب اس پر نظر ثانی و اضافہ کر کے اسے کتابی صورت میں کر دیا۔ لندن اب کی بھی بھیجا، اب کی قسمت لڑ گئی اور وقت کے ایک مشہور پبلشر T. FISHERUNWIN نے اسے چھاپنا قبول کر لیا، مصنف کے خرچ پر، خیر روپیہ جوں توں کر کے اسے بھیجا اور کتاب نومبر سنہ ۱۵ء میں وہیں سے شائع ہوگئی، اور انگریزی پریس میں اس پر تبصرے نکلنے شروع ہوگئے، یہاں تک کہ ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ نے بھی کیا، اور گویا مجھے دولت بے بہا مل گئی، پھولے نہیں سماتا تھا ـــــ یہ احساس تو مدتوں بعد ہوا کہ شہرت و ناموری کی حسرت بھی کس درجہ بے ثبات و

ناپائدار ہوتی ہے۔

اُدھر میری کتاب انگریزی میں چھپ رہی تھی، ادھر اس کے نفس مطالب کو اُردو میں لئے، نئی نئی مثالوں کا خوب اس میں اضافہ کیا، یہاں تک کہ اس کی ضخامت انگریزی سے دگنی ڈھائی گنی ہوگئی اور اس کا نام بجائے نفسیات اجتماع کے فلسفۂ اجتماع رکھا۔ انجمن ترقی اُردو نے اسے بھی لے لیا اور غالباً ۱۹۱۶ء میں اسے چھاپ دیا، معاوضہ نقد اس کا بھی فلسفہ جذبات ہی کی شرح سے دیا، کتاب ضابطہ سے نفسیات کے موضوع پر تھی، لیکن یہ زمانہ میرے الحاد کے شباب کا تھا، کتاب کی گویا سطر سطر میں زہر کوٹ کر بھر دیا تھا اور ٹھیک مستشرقانہ انداز میں، یعنی سیرۃ نبوی اور قرآن پر کوئی ظاہری حملہ کئے بغیر، دونوں کے متعلق تفصیلات، تصریحات ایسی لکھ دی تھیں کہ جن سے دونوں کی پوری بے وقعتی ذہن میں بیٹھ جاتی تھی۔ سال ڈیڑھ سال بعد جب حیدرآباد سررشتہ تالیف و ترجمہ، عثمانیہ یونیورسٹی میں ملازم ہو کر جانا ہوا، تو اس کتاب پر مذہبی حیثیت سے بڑی لے دے ہوئی، فتوے پر فتوے تکفیر کے نکلنے لگے، اس وقت تک وہی نشہ سوار تھا، خوب جوابات دیتا اور دلواتا رہا، ہاں اور کئی برس بعد جب ہوش آیا اور از سرِ نو مشرف بہ اسلام ہوا، تو سب سے پہلے اس گندی کتاب پر لاحول پڑھی اور اعلان کے ساتھ اس کو اپنی فہرست تصنیفات سے خارج کر دیا۔ اللہ سے پناہ مانگتا ہوں اس کتاب اور اس دور کے دوسرے کفریات سے۔

مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) نے کچھ تو ان دونوں کتابوں سے خوش ہو کر، اور کچھ میری حاجت مندی پر نظر کر کے مجھ سے مستقل ترجمے میری ہی پسند اور انتخاب سے

انگریزی کتابوں کے شروع کرادیئے۔ ان میں سے پہلی کتاب LECKY'S HISTORY OF EUROPIAN MORALS تھی، دو جلدوں میں، اس کا ترجمہ بھی دو جلدوں میں تاریخ اخلاق یورپ کے نام سے کیا۔

دوسری کتاب HISTORY OF CIVILIZATION IN ENGLAND تھی تین جلدوں میں، اس کے ایک بڑے حصّہ کا ترجمہ ایک اور صاحب کر کے وفات پا چکے تھے، باقی کا تکملہ میں نے کیا۔

دونوں کتابوں کے ترجمہ کا معاوضہ، انگریزی کتاب کے فی صفحہ ایک روپیہ کے حساب سے ہر مہینہ ملتا رہا۔ میں اوسطاً ہر مہینہ ۷۰، ۸۰ صفحہ ترجمہ کر کے بھیج دیتا اور اتنی ہی رقم ادھر سے آجاتی۔ کبھی کبھی سَو صفحہ کی بھی نوبت آجاتی۔ اس بے معاشی کے زمانہ میں اتنا بھی بہت غنیمت تھا۔

اس سلسلہ میں دو باتیں کام کی بتاتا چلوں۔

(۱) ایک یہ کہ میرے ترجمہ کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے پوری کتاب پڑھ ڈالتا۔ اس کے بعد ایک ایک باب پڑھتا، تیسری مرتبہ دو صفحہ تین صفحہ، غرض اتنا پڑھ لیتا، جتنا ترجمہ اس دن مقصود ہوتا، چوتھی بار ایک ایک پیراگراف پڑھتا، اس طرح مطلب و معنی پر پورا عبور ہو جاتا، اور پھر قلم برداشتہ ترجمہ کر ڈالتا۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ یہ فی صفحہ معاوضہ والا طریقہ ہے نفس کے لئے بڑی آزمائش والا۔ طبیعت میں طمع قدرۃً اس کی پیدا ہو جاتی ہے کہ کم سے کم وقت میں جتنا کام زیادہ سے زیادہ ممکن ہو کر ڈالئے، اور جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ پیسے بٹور لیجئے ـــــ خصوصاً جب کہ کام کا کوئی نگراں اور جانچ کرنے والا نہ ہو۔

یہ سلسلہ سال ڈیڑھ سال ضرور رہا ہوگا کہ انھیں مولوی عبدالحق کی تحریک پر مجھے حیدر آباد بلا لیا گیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی نئی نئی قائم ہو رہی تھی اور اس کا پیش خیمہ سررشتہ تالیف و ترجمہ وجود میں آچکا تھا، یہ اگست ۱۹۱۷ء تھا، میں اسی سررشتہ میں بہ حیثیت مترجم و فلسفہ بلایا گیا تھا، مشاہرہ تین سو روپے ماہوار سے شروع ہوا۔ ۱۹۱۷ء کے تین سو ۱۹۶۷ء کے دو ہزار سے اوپر ہوئے (ہر چیز کا نرخ کم سے کم سات گنا بڑھ چکا ہے، اکثر چیزوں کا اس سے کہیں زائد) میں نے اپنے فن میں خالص ترجمہ نہیں کیا، بلکہ ایک دو انگریزی کتابوں کو اپنا کر ایک مستقل کتاب منطق۔ استخراجی و استقرائی تیار کر دی۔ اس کا مطبوعہ نسخہ تو میرے پاس موجود نہیں، صرف اس کی نقل ہاتھ سے لکھی ہوئی موجود ہے۔ دوسری کتاب میرے فن، منطق یا فلسفہ سے متعلق نہیں بلکہ تاریخ یورپ پر ہے۔ اس کا ترجمہ کسی صاحب سے ناتمام رہ گیا تھا، اس کا تکملہ مجھ سے کرایا گیا۔

یکم ستمبر ۱۹۱۷ء کو میں حیدر آباد پہنچ گیا تھا۔ ۱۱ مہینے قیام کر کے جب یکم اگست ۱۹۱۸ء کو میں لکھنؤ واپس پہنچا ہوں تو یہیں سے استعفا لکھ کر بھیج دیا تھا۔ تو اس دور بے کاری میں دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے لئے مشہور فلسفی بارکلے BAR KALEY کی کتاب مقالات DIOLOGUE BETWEEN HAYLAS PHILONAUS کا ترجمہ کر ڈالا اور نام مکالمات برکلے رکھا، شرح معاوضہ ایک روپیہ فی صفحہ انگریزی رہی ـــــ انگریزی کتاب سائیکالوجی آف لیڈرشپ جب تیار ہو گئی تو ایک اور انگریزی کتاب سائکالوجی آف قرآن کی طرح ڈالی۔ انگریزی ایڈیشن کے تو شروع ہی کرنے کی نوبت نہ آئی اور اردو ایڈیشن کے لئے بھی تحریر صفحہ دو صفحہ سے آگے نہ بڑھی اور یہ اللہ کا بہت ہی فضل ہوا، الحاد کے جراثیم پہلی ہی کتاب میں کیا کم بھر چکا تھا کہ اس

میں تو نوبت خدا معلوم کہاں تک آتی، اور آج کیسی پشیمانی اٹھانا پڑتی!

۱۵ء کی پہلی سہ ماہی تھی، کہ وقت کے مشہور ڈرامہ نگار آغا حشر مع اپنی تھیٹر کمپنی کے لکھنؤ آئے۔ سینما کے بجائے اس وقت اصل زور تھیٹر ہی کا تھا: اور میں خود تھیٹر کا بڑا شوقین تھا، آغا صاحب سے مجھ سے اچھے خاصے پینگ بڑھ گئے۔ اور جب وہ چلے گئے اور مئی ۱۵ء میں ایک دوست کی فرمائش پر اور انھیں کے خرچ پر میرا بمبئی جانا ہوا، تو ریل پر طبیعت بڑی موزوں پائی اور ۲۴ گھنٹے کے اندر دوران سفر میں ایک پورا ڈرامہ تیار ہو گیا! بعد کو نظر ثانی و اضافہ کے بعد زود پشیماں کے نام سے شائع کر دیا اپنا نام ظاہر کرنے کی ہمت نہ ہوئی "ناظر، بی، اے" کے نام سے شائع کی۔ یہی اس وقت تخلص تھا، ڈرامے کے اندر غزلیں جو رکھیں ان میں یہی تخلص ڈالا، مولانا سید سلیمان ندوی مولوی عبدالحلیم شرر، مرزا محمد ہادی رسوا، اور سید سجاد حیدر (یلدرم) سے دیباچے لکھوائے۔

باب (۳۶)

تصنیف و تالیف نمبر (۲)

صحافت برائے صحافت کی طرح تصنیف برائے تصنیف بھی بحمد اللہ اپنا مقصد کبھی نہ رہا۔ ہر دور میں وہی لکھتا جو اپنے خیال و عقیدہ کے مطابق تھا، قلم سے وہی ٹپکا، وہی چھلکا جو دل و دماغ کے اندر موجود تھا۔ جب الحاد کی شامت سوار تھی، تو رنگ تحریر ملحدانہ تھا۔ جب اسلام کی حلقہ بگوشی از سر نو نصیب ہوئی تو وہی رنگ تحریر کا بھی ہو گیا۔ کام اُجرت پر کیا، رائلٹی لی، حق تالیف یک مشت فروخت کیا۔ لیکن اللہ نے ہر صورت میں مخالفت ضمیر کی بھٹی میں گرنے سے محفوظ رکھا ——

اگست ۱۸ء میں حیدرآباد سے واپسی پر اس تعلق سے استعفا کے بعد کوئی ذریعہ معاش اب گویا باقی نہ رہا۔ اس اثنا میں شادی ہو چکی تھی اور اولاد کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا، قدرۃً فکر دامن گیر ہوئی، وقتی اور عارضی یافتوں کا کیا اعتبار تھا، لگی تو روزی نہیں تو روزہ، حیدرآباد کے زمانۂ قیام کے ایک بڑے مہربان اور قدردان نواب سر امین یار جنگ سید احمد حسین بہادر اعلیٰ حضرت نظام دکن کے چیف سکریٹری اور مدار المہام پیش گاہ بڑے علم دوست تھے، اور خود بھی فلسفہ میں ایم اے، کئی ہفتے تو اِدھر اُدھر سے کام چلایا۔ بالآخر فروری ۱۹ء میں ایک عرض داشت ان کے

توسط سے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کی، کہ جس طرح کے علمی وظیفے حالی اور شبلی کو مرحمت ہو چکے ہیں، اسی قسم کے علمی وظیفہ کا امیدوار ہوں، اخیر اپریل میں جواب تار سے ملا کہ طلبی ہوئی ہے، چلے آؤ۔ یقین نہ آیا، تار ہی سے پھر تصدیق کرائی۔ یکم مئی کو حیدرآباد پہنچ گیا، اب کی قیام سرکاری طور پر مولانا حبیب الرحمن خاں صدر یار جنگ صدر الصدور امور مذہبی کے ہاں کرایا گیا۔ ساڑھے پانچ بجے سہ پہر کو باریابی ہوئی، اور دیر تک بڑی مہربانی کے ساتھ رہی، دوسرے دن فرمان خسروی سوا سو ماہوار سکۂ انگریزی (اس وقت تک سکۂ حیدرآبادی بھی جاری تھا) وظیفہ علمی کا ہو گیا، اس شرط کے ساتھ کہ ہر سال ایک کتاب لکھ کر پیش کی جاتی رہے۔ یہ زمانہ وہ ہے کہ میں الحاد سے ہٹ کر رفتہ رفتہ مذہب کی طرف آ رہا تھا، لیکن پھر بھی مسلمان ہو جانے میں ایک آدھ سال کی مدت باقی تھی۔ سلسلہ آصفیہ میں جو چیز سب سے پہلے آٹھ دس مہینہ بعد شروع ۲۰ء میں شائع کی، وہ کتاب کاہے کو تھی ایک مجموعہ انتخاب تھا عدل و آداب جہاں بانی پر۔ آیات قرآنی و احادیث نبوی سے جو کچھ اس وقت مل سکا، وہ تھا اور اس کے بعد کچھ ٹکڑے تھے کیمیائے سعادت، اخلاق جلالی، گلستان و سیاست نامہ، فارسی کی سات آٹھ کتابوں کے، کل ۷۰ صفحہ کا رسالہ ۱۸ + ۲۲ سائز پر چھاپ، اس کا نام تحفۂ خسروی رکھ دیا۔ چھپنے کے بعد یہ کتاب اپنے کو کچھ ایسی پست نظر آئی کہ اپنی جانب اسے نسبت دیتے شرم آنے لگی۔ اس کے اشتہار و اعلان کی نوبت برائے نام آئی۔ اسی زمانہ میں ایک فرنچ فلسفی پال رچرڈ کی انگریزی TO THE NATIONS نظر سے گزری، عین جنگ کے خاتمہ پر، مستقل پیام امن کی دعوت لے کر شائع ہوئی۔ میں نے اسے اُردو میں شروع ۲۰ء ہی میں اپنا لی اور پیام امن کا نام دے کر پھر اس پر مقدمہ، اور مفصل تبصرہ

وغیرہ کا اضافہ کر کے اسے بجائے ترجمہ کے تالیف سے قریب تر کر دیا۔ طبع واشاعت کی نوبت تین ساڑھے تین سال بعد کہیں اخیر ۲۳ء میں آئی ــــــ ۲۱ء کا اخیر ہو گا کہ ولایت کے کسی بڑے ناشر غالباً (MACMILAN) کے ہندوستانی ایجنٹ نے لاہور سے مجھے لکھا کہ "ہمیں تین کتابوں کے اُردو ترجمے کرانے ہیں۔ ڈاکٹر سر اقبال نے آپ کا نام تجویز کیا ہے" میں نے ایک کتاب انتخاب کر لی، نام کچھ اس قسم کا یاد پڑتا ہے EMIN ENT MEN OF SCIENCG ترجمہ کا نام مشاہیر سائنس رکھا، ترجمہ کا معاوضہ اس کمپنی نے میرا مسودہ پہنچتے ہی ارسال کر دیا۔ اب یاد نہیں پڑتا کہ کیا تھا، مگر اچھا تھا ــــــ اب یہ زمانہ تھا کہ میں شہر کے شور و شغب سے پریشان ہو کر اور مہمانوں اور ملنے والوں کی کثرت سے اُکتا کر، لکھنؤ سے دریاباد مستقلاً منتقل ہو آیا تھا۔ یہاں اپنے خالہ زاد بھائی شفاء الملک حکیم عبدالحسیب صاحب کے کتب خانہ میں ایک قلمی نسخہ مصحفی کی ایک چھوٹی سی مثنوی بحرالمحبت کا نظر سے گزرا، نکال لایا اور ذرا وقت صرف کر کے اس کی تصحیح کی اور حاشیے کثرت سے دیے۔ پہلے اسے انجمن ترقی اُردو کے رسالہ اُردو میں چھاپا، پھر مقدمہ کے ساتھ اور نظر ثانی کے بعد کتابی صورت میں، اور چند سال بعد اس کا دوسرا ایڈیشن بھی نکالا ــــــ یہی زمانہ تھا کہ مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن کی طرف سے آکسفرڈ GXFORD CONCISE DICTIONARY کا اُردو ترجمہ کرانا چاہا، اور مجھے ترجمہ کے لئے انگریزی کا حرف E عنایت ہوا۔ اور میں نے معقول معاوضہ پر اپنے حصہ کا ترجمہ کر کے بھیج دیا۔ اب ۲۳ء و ۲۴ء آچکا تھا۔ تصوف کی کتابیں پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ تصوّف کے نام سے جو بڑا ملغوبہ مسلمانوں میں آگیا ہے اسے چھانٹ کر صرف اس کے اسلامی عنصروں کو یک جا

کر دیا جائے، تو ایک بڑی خدمت ہو جائے۔ چنان چہ فتوح الغیب، عوارف المعارف رسالۂ قشیریہ آٹھ دس مستند کتابیں فن کی پڑھ کر، اور ان کے نامی گرامی مصنفوں کے حالات کا اضافہ کر کے اسے تصوف اسلام کے نام سے شائع کر دیا۔ اللہ نے قبولیت بخشی اور پانچ ایڈیشنوں کی نوبت آگئی۔ ہر بار اضافہ نظر ثانی کے بعد ـــــ یہی زمانہ تھا کہ رام پور جانا ہوا اور پہلے وہاں کے اعلا سرکاری کتب خانہ میں الٹ پلٹ میں نظر مولانائے رومی کی فیہ ما فیہ پر نظر پڑ گئی۔ اور وہاں سے اس کی نقل منگانے کا انتظام کر آیا، پھر کچھ روز بعد حیدر آباد جانا ہوا، اور وہاں بھی نواب سالار جنگ کے نادر کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ مل گیا، اور یہ بھی اللہ کا مزید کرم کہ ایک تیسرا نسخہ حیدر آباد کے سرکاری کتب خانہ میں نکل آیا۔ یہ تین تین نسخوں کا ہاتھ آجانا بغیر کسی تلاش و تفحص کے محض اللہ کی دین نہیں تو اور کیا کہا جائے۔ بہر حال ان تینوں کے نقل کا بھی انتظام ہو گیا مگر ظاہر ہے کہ اس میں وقت بہت لگ گیا، اور جن لوگوں نے اس کے لئے سعی و پیروی کی، ان کے لئے دل سے دعائیں نکلیں۔ کیمبرج یونیورسٹی کے استاد عربی پروفیسر نکلسن سے بھی مراسلت تھی، انھیں لکھا ان بچارے نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر ایک نسخہ قسطنطنیہ سے نقل کرا بھیجا۔ اس وقت تک قلمی مخطوطات کے فوٹو لے لینے کا طریقہ اگر رائج ہو بھی چکا تھا، تو میری دست رس سے تو بہر حال باہر تھا۔ سوا اس نقل و کتابت کے فرسودہ طریقہ کے اور کوئی صورت میرے علم میں نہ تھی، مہینوں نہیں، برسوں ان سارے نسخوں کی فراہمی، اور پھر ان کے مقابلہ و تصحیح میں لگ گئے، اور بعض دوستوں کی اعانت بھی اس میں حاصل ہوتی رہی۔ مگر یہ نقلیں جو ہو کر آئیں، خود ہی بہت غلط تھیں۔ ان غلط در غلط نسخوں کا مقابلہ اور پھر تصحیح! کام کی

دشواریاں بہت بڑھ گئیں، پھر اپنی ایک تو فارسی میں استعداد ہی واجبی سی، اور اس سے بڑھ کر ترتیب و تہذیب (ایڈٹ کرنے کا کام) میں عدم مہارت، نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب بالکل چوپٹ ہو کر نکلی، اور کتاب میں غلطیاں لاتعداد رہ گئیں ——— سالہا سال بعد جب ایران کے وزیر تعلیم ڈاکٹر بدیع الزماں فروزاں فر نے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ذریعوں کو کام میں لاکر ایک اعلیٰ نفیس ایڈیشن شائع کیا، تو اپنی نااہلی اور اپنے کام کی انتہائی پستی کا مشاہدہ برائے العین ہو گیا۔

مارچ ۲۹ء میں ایک قافلہ ساتھ لے کر حج و زیارت کو روانہ ہوا، مئی میں واپس آیا، اور واپسی پر اپنے مشاہدات و تاثرات پہلے اپنے پرچہ میں شائع کئے، پھر انھیں کتابی صورت دے کر سفر حجاز کا نام دے کر اور ایک اوسط درجہ کی ضخامت کے ساتھ شائع کر دیا اللہ نے ایسے بندوں کے دل میں اُسے جگہ دی علاوہ اخباروں رسالوں کے مداحانہ تبصروں کے، نجی خطوط کثرت سے حوصلہ افزائی کے آئے۔ چند سال بعد دوسرا ایڈیشن بعد اضافہ و نظر ثانی نکلا۔ اور عین اس وقت جولائی ۶۷ء میں تیسرا ایڈیشن پریس سے باہر آنے کو ہے، حالاں کہ ظاہر ہے کہ سفر کے خارجی حالات ہر سال دوسرے سال بالکل بدل جاتے ہیں، اور حرمین شریفین کے تو کہنا چاہیے کہ چند سال کے اندر زمین و آسمان ہی نئے ہو گئے ہیں، اور نئے معلومات کے آگے پرانے معلومات بالکل ہی فرسودہ اور دور از کار ہو کر رہ گئے ہیں ——— علمی و فلسفیانہ مضمون ایک زمانے میں کثرت سے لکھے تھے، ایک صاحب نے انھیں بغیر میری اجازت کے فلسفیانہ مضامین کے نام سے یک جا کر کے چھاپ دیا۔ اور دوڑ دھوپ کر کے کتاب کو

لکھنؤ یونی ورسٹی میں ایم اے کے کورس میں داخل کرادیا۔ مجھے جب اس کا علم ہوا تو میں نے ان پر نظرِ ثانی کر کے ایک خاص ترتیب کے ساتھ مبادی فلسفہ کے عنوان سے جمع کیا، اور دو حصّوں میں اسے شائع کیا، پہلا ۳۱ء میں دوسرا ۱۹۳۴ء میں۔ عام فہم نام ان کا فلسفہ کی پہلی کتاب اور فلسفہ کی دوسری کتاب رکھا۔

۳۳ء ہی سے اس خدمت عظیم کا حوصلہ ہوا، جسے حاصل زندگی اور توشۂ آخرت سمجھتا ہوں، اور دل و دماغ کی بہترین توانائیاں اس کی نذر کر دیں۔ اس کا مستقل ذکر ایک اگلے باب میں ان شاء اللہ ملے گا۔

۳۸ء تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مجلس اسلامیات نے ایک خطبہ سنانے کے لئے علی گڑھ طلب کیا۔ اور میں اپنے پسند کئے ہوئے عنوان اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام کے ماتحت ایک خطبہ جاکر سنا آیا، تین سال بعد ۴۱ء میں پھر اسی مجلس کی طرف سے دعوت آئی، اور اب کی تمدن اسلام کی کہانی اسی کی زبانی کے عنوان سے جاکر لکچر دے آیا۔ دونوں لکچر پسند کئے گئے اور مجلس مذکور کی جانب سے شائع ہوئے اور خوب نکلے ــــــ اسی درمیان میں سچ کے مضمونوں اور مقالوں کی خداداد مقبولیت دیکھ، حیدرآباد کے ایک ناشر نے تین مجموعے محمد علی؛ ذاتی ڈائری، مضامین عبدالماجد دریابادی اور مُردوں کی مسیحائی کے نام سے چھاپ ڈالے اور نقد معاوضہ برائے نام سا بھیج دیا۔ چند سال اور گزرے کہ ریاست حیدرآباد ہی کے ایک صاحب نے ایک مجموعہ سچی باتیں کے نام سے شائع کر دیا۔

۱۹۴۱ء کی آخری سہ ماہی تھی کہ رام پور کی رضا اکیڈمی نے فرمائش کی کہ ہمارے ہاں آکر کسی علمی و ادبی عنوان پر علمی رنگ میں آکر مقالہ پڑھو، دعوت منظور کرلی اور

اسی وقت ایسی ہی فرمائش مجلس اسلامیات پشاور کی طرف سے موصول ہوئی (آہ، پشاور اس وقت ہندوستان ہی کا حصہ تھا، اور کٹ کر جدا نہیں ہوا تھا) اسے بھی منظور کر لیا۔ پہلے دسمبر ۴۱ء میں رام پور گیا اور وہاں بعض "قدیم مسائل جدید روشنی میں" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ اور پھر جنوری ۴۲ء میں پشاور کا سفر اختیار کر وہاں ایک مبسوط مقالہ پڑھا "جدید قصص الانبیاء کے دو باب" کے عنوان سے پڑھا۔ پشاور میں وہی مقالہ دوبارہ ایک دوسری جگہ بھی پڑھوایا گیا، بعد کو یہ دونوں لکچر یکجا کر کے نظر ثانی و ترمیم کے بعد کتابی صورت میں شائع کرائے اور نام قصص و مسائل رکھا پہلا ایڈیشن چند سال میں ختم ہو گیا جب پھر دوسرا ایڈیشن نکلا۔

فلسفہ و نفسیات پر کچھ لکھنا لکھانا ایک عرصہ سے ترک تھا، ۴۵ء میں ہندوستانی اکیڈمی (الہ آباد) نے فرمائش کی کہ "پاپولر سائیکالوجی" (عام فہم نفسیات) پر ایک رسالہ دو ڈھائی سو کی ضخامت کا تیار کر دو ۴۶ء میں اس فرمائش کی تعمیل کر دی۔ اور نام ذرا عجیب سا ہم آپ رکھا، کہیں ۴۸ء میں جا کر شائع ہوئی۔ معاوضہ بارہ سو نقد ملا، اور فروخت پر ۱۰ فی صدی رائلٹی اس کے علاوہ۔ اسی زمانہ میں اپنے ادبی مقالوں کی اشاعت کا خیال آیا، صدق کے علاوہ اور بھی متعدد رسالوں میں نکل چکے تھے، پہلی جلد مرتب کر کے انشائے ماجد یا ادبی مقالات کے نام سے پبلشر (تاج آفس بمبئی) کو بھیجی، چھپ کرائی تو نام "مقالات ماجد" پڑا ہوا تھا۔ اب کیا کرتا! معاوضہ ایک ہزار نقد ملا اور کتاب کے کچھ نسخے بھی۔ دوسرا ایڈیشن لاہور کی عشرت پبلشنگ کمپنی نے شائع کیا، اور معاوضہ اس نے بھی شاید وہی ایک ہزار پیش کیا۔ تیسرا ایڈیشن اسی حصہ اول کا دسمبر ۶۲ء میں نکلا اور دوسرے حصہ کا پہلا ایڈیشن مارچ ۶۱ء میں یہ دونوں حصے

صحیح نام انشائے ماجد سے نکلے۔ اور انھیں نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔۔۔۔۔ نشری ریڈیائی تقریروں کی بھی خاصی تعداد ہوگئی تھی، ان کا مجموعہ بھی اسی نسیم بک ڈپو نے مارچ سنہ ۶۳ء میں نشریات ماجد حصہ اول کے نام سے شائع کیا۔ وقت کے مشاہیر اہل علم، اہل شعر و ادب و اہل سیاست کے خطوں کا ذخیرہ اپنے پاس ایک عرصہ سے موجود تھا۔ جی میں آیا کہ انھیں مرتب کرکے اور ان پر اپنے حاشیے بڑھا کر انھیں چھاپ دیجئے۔ چناں چہ پہلی جلد خطوط مشاہیر کے نام سے مولانا شبلی اور اکبر الہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر کے خطوں کی اپنے دیباچوں اور بکثرت حاشیوں کے اضافہ کے ساتھ تاج کمپنی کو پانسو نقد کے معاوضہ پر دے دی اور اس نے غالباً سنہ ۴۷ء میں چھاپ دی، مولانا شبلی کے خط تو پہلے بھی نکل چکے تھے، مولانا حسین احمد، اقبال، اور مولانا ابو الکلام کے خطوط ان کے خطوں کے مجموعہ میں نکل گئے ہیں اور مولانا سید سلیمان ندوی کے خطوط کی پہلی جلد مکتوبات سلیمانی کے نام سے سنہ ۱۹۶۳ء میں چھاپ دی اور دوسری جلد عین اس وقت (جولائی سنہ ۶۶ء میں) زیر طبع ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کے خطوط ایک صاحب کو چھاپنے کے لئے مدت دراز ہوئی بھیج چکا ہوں۔ مہدی حسن کے خط بھی ان کے مجموعۂ خطوط میں نکل چکے ہیں۔ اب میرے پاس شرر، ریاض خیرآبادی، مولانا شوکت علی، سید جالب دہلوی وغیرہ کے خطوط باقی رہ گئے ہیں۔

حضرت تھانوی کی وفات جولائی سنہ ۴۳ء میں ہوئی۔ اس کے کچھ ہی روز بعد خیال آیا کہ اپنے اور حضرت کے تعلقات پر، حضرت کے خطوط کی روشنی میں کچھ لکھ ڈالو خطوط سیکڑوں کی تعداد میں محفوظ مل گئے، میرے اصل عریضے بھی اور ان ہی پر حضرت

کے جوابات بھی، بڑا وقت ان کے چھانٹنے اور تاریخ وار مرتب کرنے میں لگ گیا، پر کتاب کو بھی قدرۃً ضخیم ہی ہونا تھا۔ خیر، خدا خدا کرکے کتاب سنہ ۵۰ء میں حکیم الامت یا نقوش و تاثرات کے عنوان پر تیار ہوگئی اور سنہ ۵۲ء میں پریس سے باہر آگئی۔ حضرت کے نام کی برکت سے کتاب مقبول بھی خوب ہوگئی اور اب کئی سال سے اس کا کوئی نسخہ باقی نہیں رہا، لکھنؤ سے ایک بڑے پرانے مخلص مولوی سید رئیس احمد ندوی جامعی نے اسے بہت شوق سے دوسرے ایڈیشن کے لئے مانگا، لیکن خدا معلوم کیا بجوگ پڑگیا کہ اب تک نہ چھپ سکی، اور نہ اب کوئی جواب ہی مل رہا ہے![1] اب خیال آیا کہ مولانا محمد علی کا قرضہ تو اس سے بھی پرانا اپنے اوپر باقی چلا آرہا ہے، کسی طرح اسے بھی بے باق کیجئے۔ مرحوم کی وفات کے بعد ہی سچ میں ان پر لکھنا شروع کردیا تھا، اور محمد علی! ذاتی ڈائری کے چند ورق کے عنوان سے ۱۶، ۱۷ نمبر سچ میں لکھ ڈالے تھے، اب انھیں کو بنیاد بنا کر کتاب از سر نو لکھنا شروع کی، اور ۸۸ بابوں میں اور متعدد ضمیموں کے ساتھ دو جلدوں میں ختم کی۔ مسودہ سنہ ۴۸ء میں تیار ہو چکا تھا، دو چار سال اچھے ناشر کے انتظار میں پڑا رہا، بلکہ کچھ گشت بھی کرتا رہا۔ اخیر سنہ ۵۲ء میں پریس کو خود ہی دی، پہلی جلد سنہ ۵۴ء میں پریس سے باہر آئی اور دوسری سنہ ۵۶ء میں۔

حضرت تھانوی کی بہترین کتابوں میں سے ایک کا نام مناجات مقبول ہے۔ کچھ قرآنی اور زیادہ تر حدیثی دعاؤں کا بہترین مجموعہ گویا قرآن وحدیث دونوں کا انتہائی عطر نکال کر پیش کر دیا ہے اور ترجمہ بھی حضرت ہی کے ایک خلیفہ اعلیٰ کا کیا ہوا

[1] یہ دوسرا ایڈیشن لاہور سے سنہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوگیا (عبدالقوی)

صحیح و شستہ اُردو میں۔ مدت سے آرزو تھی کہ اس کی شرح عام فہم زبان میں کیجئے اور کتاب اپنے ہی سے عامیوں اور عاصیوں کے حلقے میں پہنچائیے۔ آرزو سنہ ۵۰ء میں پوری ہوئی، اور ہلکی ہلکی سی نظرثانی زبان ترجمہ پر بھی۔ اور آخر میں ایک بندۂ مقبول کے معمولات میں سے ایک دعا کا اضافہ کیا۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۵۲ء میں نکلا۔ دوسرا سنہ ۵۵ء میں، تیسرا سنہ ۶۵ء میں۔ جو دُعا کرنے میں خود حد درجہ بدہمت و غفلت شعار ہے، عجب کیا کہ اس کی کوتاہیوں غفلتوں، بدراہیوں کا کفارہ کسی درجہ میں اسی دُعا آموز کتاب سے ہو جائے۔

شاعروں میں سب سے زیادہ لکھنے لکھانے کا اتفاق اکبر الہ آبادی پر ہوا، خدا معلوم کتنے مضمون، مقالے، نوٹ ان پر لکھ ڈالے، اور نشر کیے اس کے علاوہ سنہ ۵۱ء میں نظرثانی کر کے بہت سی تحریروں کو یکجا کر کے اور نام اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں کے رکھا اور سنہ ۵۴ء میں لکھنؤ کے ایک پبلشر نے انسے چھاپ دیا، لیکن کتاب کیا ہے، مطبعی غلطیوں کی پوٹ ہے کتابیں یوں بھی میری بہت غلط چھپتی ہیں، اس کا نمبر سب سے اول ہے، اور شعر تو چند ہی اس میں صحیح چھپے ہوں گے۔ پڑھ کر دلی اذیت ہوتی ہے۔

سنہ ۵۵ء کا آغاز تھا کہ پاکستان کے گورنر جنرل جناب غلام محمد صاحب نے کراچی آنے کی دعوت دی، جی کوئی بہانہ ہی ڈھونڈ رہا تھا، تاہم منظوری بہت کچھ سوچ بچار کے کے بعد ہی دی، اور اپریل میں ایک مختصر قافلہ کے ساتھ جا، لاہور و کراچی ہو آیا، واپس آکر صدق میں قسط وار ایک مضمون ڈھائی ہفتہ پاکستان میں کے عنوان سے لکھا، بہت سے پرچوں نے اسے نقل کیا۔ ختم پر نظرثانی کے بعد اسی عنوان سے سنہ ۵۶ء میں چھاپ بھی دیا۔

باب (۳۷)

تصنیف و تالیف نمبر (۳)

۱۳۳۳ھ تھا، اور اپنا قیام اس وقت تھانہ بھون کئی ہفتے کی مدت کے لئے تھا، کہ ایک مقیم خانقاہ مولوی سراج الحق مچھلی شہری، استاد مجیدیہ انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد سے ملاقات ہوئی اور تعلقات بڑھے۔ یہ مخلص ہونے کے ساتھ ہی صاحب فہم و نظر بھی نظر آئے، جو ایک بہت بڑی بات ہے، ایک روز انھوں نے باتوں میں کہا کہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہم اہل سنت و جمہور امت کی طرف سے قرآن مجید کا انگریزی ایک بھی موجود نہیں۔ آپ ضرور یہ کام کر ڈالئے۔ میں اپنی انگریزی اور عربی دونوں کی قابلیت کے حدود اربعہ سے خوب واقف تھا، ان کی فرمایش پر دنگ ہی رہا، اور جواب کچھ اس طرح کا دیا کہ آپ نے حسن ظن کی حد کر دی، کہاں میں اور کہاں اتنا بڑا کام! کچھ تھوڑی بہت مناسبت بھی تو ہو؟ لیکن وہ کیا ماننے والے تھے، اصرار کئے گئے، آخر میں بولے "نیا ترجمہ نہ سہی، آخر محمد علی لاہوری کا ترجمہ تو موجود ہی ہے، اسی کو زمین بنا کر اسی میں ترمیم و تصرف کر کے کام چلائیے" ــــــ اب ان کے اخلاص کی کرامت سمجھئے یا جو کچھ، بات دل میں اُتر سی گئی، اپنی کامل نااہلی کے احساس کے باوجود بھی آخر ہمت کر ہی ڈالی، اور اللہ کا نام لے کر جوں توں قلم ہاتھ میں

لے لیا۔

کام شروع کر دیتے اور تھوڑا بہت کر ڈالنے کے بعد ہی جا کر کام کی عظمت اور پھیلاؤ کا اندازہ ہوا، یہ اگر پہلے سے کہیں ہو گیا ہوتا، تو ہرگز جرأت ہی نہ کرتا۔ ابتدائی خیال کہ دو ایک ڈکشنریوں کی مدد سے اور دو ایک انگریزی ترجمہ سامنے رکھ لینے سے کام چل جائے گا، اب بالکل طفلانہ نظر آنے لگا۔ سچ (صدق کا پرانا نام) عارضی طور پر بند کر کے اس کے کام سے چھٹی لے لی، اور کہنا چاہیے کہ سارا ہی وقت اس خدمت قرآنی کے نذر کر دیا۔ بعد عصر باہر بیٹھنے کا جو معمول تھا، اسے روزانہ سے سہ روزہ کرنا پڑا۔ اس ساری کتر بیونت کے بعد بھی معلوم ہوا کہ وقت بالکل ناکافی ہے، اور تفسیری حاشیوں کی تیاری کے لئے تو کتابوں کے انبار کی حد ہی نہیں! کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا کا معاملہ۔ بیسیوں نہیں، پچاسوں، اور پچاسوں کیا سیکڑوں ہی جلدیں، کیسی کیسی ضخیم و گراں قیمت، لغت عربی کی، لغت عربی انگریزی کی، جغرافیہ عرب کی، جغرافیہ شام و عراق و مصر کی، تاریخ اقوام عرب و اسرائیل کی، تاریخ روم و ایران کی، تاریخ مذاہب یہود و نصاریٰ کی، عقائد مجوس و مشرکین کی، تاریخ تمدن کی، اور علاوہ تفسیر کے، حدیث، فقہ، کلام وغیرہ مختلف علوم و فنون کی کتابیں منگانا اور مطالعہ کرنا پڑ گئیں۔ اور تفسیری حاشیے الگ رہے، نفس ترجمہ ہی کا کام کتنا دشوار نکلا۔ شروع شروع میں دلیل راہ محمد علی لاہوری کے ترجمہ کو بنانا سوچا تھا، آگے چل کر اسے بالکل ترک کر دیا۔ پکھتال، سیل، ہیل وغیرہ کے مکمل اور لین و سید حسین بلگرامی کے نامکمل ترجموں سے یقیناً بڑی مدد ملی، پھر بھی مشکلات ایسی ایسی پیش آئیں کہ کہنا چاہیئے رُو رُو دیا ہوں! لین کے عربی انگریزی لغت نے بڑا سہارا دیا۔ سال ڈیڑھ سال جُٹ کر کام

کرنے کے بعد کہیں مسودہ اوّل تیار ہوا، پھر نظر ثانی کی، اس کے بعد منزل ٹائپ کرانے کی آئی۔ جو خود بڑی طویل اور پیچیدہ ثابت ہوئی۔ ایک مخلص سید مرتضیٰ علی بی اے دہلوی تھے، پارہ اول کی سو دو سو کاپیاں اپنے خرچ پر شملہ میں طبع کرا دیں، انھیں درمیان میں ایک ایک سادہ ورق لگا کر لوگوں کے پاس صلاح و مشورہ رائے زنی کے لئے بھیجا۔ شکریہ و تحسین کے خط تو بہت سے آ گئے، عملی کام کے خط بہت ہی کم آتے۔ ایسے ایک ہی صاحب کا نام اس وقت یاد آ رہا ہے، یوپی کے رہنے والے لیاقت علی ایم اے ایل ایل بی، بھوپال میں غالباً وزیر قانون و سیاست تھے، اور انگریزی کے بڑے اچھے لکھنے والے، ان کا خط کام کا آیا۔ دو آدمی اس دوران میں شدّت سے یاد آتے رہے۔ ایک مولانا حمید الدین فراہی، کہ ان سے عربی عبارت کے کتنے نکتے حل ہو جاتے، دوسرے اپنے مولانا محمد علی (کامریڈ والے) کہ وہ ترجمہ کی انگریزی کو کچھ سے کچھ بنا دیتے!

خیر اسی الٹ پلٹ میں ۶، ۷ سال کی مدت گزر گئی اور جولائی ۳۹ء آ گیا، اب سوال طبع و اشاعت کا تھا، نظریں اِدھر اُدھر بہت دوڑائیں سب ناکام رہیں۔ آخر ایک مخلص خصوصی مولوی سید رئیس احمد جعفری کی وساطت سے معاملت، لاہور کی مشہور تاج کمپنی سے طے پائی۔ مینجنگ ڈائرکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب نے دعوے بہت بڑھ بڑھ کر کئے۔ معاہدہ کا فارم آیا، دستخط ہوتے، طے یہ پایا کہ مسودہ پہنچتے ہی وہ ایک پارہ ہر مہینہ نکالتے رہیں گے، یہاں تک کہ پورا کلام مجید تیس مہینے میں نکل جائے گا۔ ڈھائی سال کی مدت بڑی طویل اور صبر آزما معلوم ہوئی لیکن کرتا کیا اسے قبول کر لیا۔ میری رائلٹی انھوں نے خود ہی ۲۰ فی صدی رکھی۔ ٹائپ شدہ مکمل

مسودہ ان کے پاس ۱۹۴۰ء میں پہنچ گیا!

اب سنیے، پورا سال ۱۹۴۱ء گزر گیا، اور پارہ صرف پہلا نکل سکا، گو خوش نما و دیدہ زیب، لیکن غلطیوں سے لبریز! اور ۱۹۴۲ء یوں ہی خالی گیا، یعنی دو سال کی مدت میں بجائے ۲۴ پاروں کے کُل ایک پارہ! دوسرا پارہ کہیں ۱۹۴۳ء میں جاکر نکلا، وہ بھی بہ اعتبار ظاہر پہلے سے کہیں گھٹیا اور بدزیب! معاملت کرتے ہوئے کوئی تصور بھی اس صورت حال کا کر سکتا تھا، نہ پوچھیے کہ کتنے خط یاددہانی اور تقاضے کے جاتے رہے اور دل پر کیا گزرتی رہی؟ اور ۱۹۴۳ء کے بعد سرے سے سنّاٹا! ایک سال، دو سال، چار سال، یہاں تک کہ ۱۹۵۶ء آگیا۔ ہندوستان کی تقسیم کو بھی کتنے سال گزر چکے، او لاہور اور دریاباد کے درمیان رابطہ کتنا دشوار ہوگیا، منی آرڈر وغیرہ کا سلسلہ تو ۴۹ء ہی سے بند ہو چکا تھا——— عذرات انوکھے بھی اور نامتناہی بھی، کبھی یہ کہ کاغذ اچھا نہیں مل رہا ہے، کبھی یہ کہ اچھے کمپوزیٹر غائب ہوگئے ہیں وقس علیٰ ہذا۔ رائلٹی کی شرح معاہدہ میں خود ہی ۲۰ فی صدی رکھی تھی، ۲۰ سے گھٹا کر ساڑھے بارہ فی صدی کردی! اور پھر اس سے بھی گھٹا کر کُل ۱۰ فی صدی!

۱۹۵۷ء میں اللہ کے بندے کو کچھ ہوش آیا اور ایک ایک منزل کی ایک ایک جلد چھاپنا شروع کی، گو بہ اعتبار ظاہر پارۂ اوّل سے کوئی مناسبت ہی نہیں، بہت ہی گھٹیا اور بالآخر خدا خدا کرکے ۱۹۶۱ء میں پورا قرآن ختم ہوا——— اللہ بھلا کرے میاں جمال الدین عبدالوہاب سلمہٗ لکھنوی فرنگی محلی ثم پاکستانی کا کہ انھوں نے پاکستان کی ایک مقتدر ہستی چودھری محمد علی سابق وزیر اعظم کو شیخ صاحب پر مسلّط کیا، اور انھیں

تو کاہ سے کام کوہ کا، اور چیونٹی سے ہاتھی کا لے لے!

اُردو تفسیر نکلی ہی تھی، کہ اس میں خامیاں، کوتاہیاں نمایاں طور پر نظر آتے اور کھٹکنے لگیں اور جی بے اختیار چاہنے لگا کہ جابجا ترمیم سے کام لیا جائے۔ ایک بڑی ضرورت بعض حالات خارجی نے پیدا کر دی۔ سنہ ۴۰ء، سنہ ۴۲ء تک بنی اسرائیل دنیا کی ایک مغضوب ترین قوم تھی۔ ہر ملک میں مقہور و رسوا۔ اس وقت قدیم تفسیروں کی طرح اپنی بھی تفسیر کی آیات متعلقہ میں ان کی اسی حالت کا اظہار ضروری تھا۔ سنہ ۴۵ء کے بعد سے صورت حال بدلنا شروع ہوئی، یہاں تک کہ سنہ ۴۸ء میں ان کی ایک مستقل حکومت قائم ہوگئی، اور حکومت روز بروز ترقی کرتی گئی، اب لازم ہوگیا کہ ان آیات کی تفسیر و تاویل پر دوبارہ نظر کی جائے اور حواشی متعلقہ پر حذف و اضافہ، ترمیم و تصرف سے کام لیا جائے۔ پھر خلائی پرواز وغیرہ میں جو جو حیرت انگیز ترقیاں ان چند برسوں کے اندر ہوئیں، ان کا لحاظ بھی طبعیات تکوینیات والی آیتوں کی تفسیر میں کرنا ضروری تھا اور متعدد ترمیمات بھی ضروری نظر آئیں۔ نظر ثانی کا کام شروع کر دیا اور ختم بھی ہوگیا اب فکر طبع و اشاعت کی ہوئی۔ ہندوستان کے کسی مسلمان ناشر میں اب یہ دم کہاں تھا۔ دہلی، بمبئی وغیرہ میں ساری کوششیں بے کار گئیں۔ پاکستان کے بعض مخلصوں سے بھی مراسلت رہی۔ اور مہینوں کی نہیں، برسوں کی مدت اسی حیص بیص میں گزر گئی۔ یہاں تک کہ سنہ ۶۶ء آ گیا، اور اب اللہ نے ہندوستان نے باہر، کویت میں اپنے ایک مخلص کے دل میں اس کام کی اعانت ڈال دی۔ دس ہزار کی رقم وصول ہوگئی۔ کاغذ و سامان طبع کی ہوش رُبا گرانی میں اس رقم کی بساط ہی کیا۔ پھر بھی ان شاء اللہ پہلی جلد کے لئے تو کافی ہی ہو جائے گی اور آگے کے لئے اللہ مالک ہے۔ کتابت لکھنؤ

میں کئی مہینے ہوئے شروع کردی تھی اور چھپائی کے لئے انتخاب دہلی کے ایک پریس کا ہوا ہے، چنانچہ عین اس وقت (جولائی ۶۷ء میں) دہلی میں پہلی جلد کی چھپائی بس ان شاء اللہ عنقریب ہی شروع ہو جانے والی ہے۔

الحمد للہ کہ اس بڑی خدمت کے علاوہ کچھ اور خدمتوں کی توفیق بھی قرآنیات ہی کے سلسلہ میں ہوگئی ہے، تین کتابیں تو گویا ایک ہی سلسلہ کی اس وقت شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) الحیوانات فی القرآن یا حیوانات قرآنی۔ قرآن میں مذکور حیوانات (ابل، جمل، بقرہ، بعیر، حمار، فیل، وغیرہ) کے اسماء اور ان کے افعال و صفات کا ایک جامع قاموس، بہ حساب حروف تہجی۔

(۲) ارض القرآن یا جغرافیۂ قرآنی۔ قرآن میں مذکور سارے جغرافی اسماء، ملک، شہر، پہاڑ (بابل، مصر، طور، جودی، کعبہ، عرفات وغیرہ) اور ان کے متعلقات کا جامع لغت، ہجی وار ۱۲۹ عنوانات کے ماتحت۔

(۳) ان دونوں سے ضخیم تر اعلام القرآن یا قرآنی شخصیات، جنّ، انس، ملکی، ہر قسم کی قرآنی شخصیات (آدم، آزر، فرعون، ابلیس، جبریل، قارون وغیرہ) پر محیط اور ان کا جامع لغت ۱۵۸ عنوانات کے ماتحت۔

یہ سارے رسالے ۵۵ء اور ۶۰ء کے درمیان شائع ہو چکے ہیں، اسی زمانہ کا ایک اور کتابچہ الاعداد فی القرآن (قرآنی گنتی اور ہندسے) کے نام سے ابھی غیر مطبوعہ ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ کتابچہ ابھی تیار ہی کہاں ہوا ہے، صرف اس کا خاکہ وجود

میں آچکا ہے (احد، واحد، الف، اثنا عشر اثنین وغیرہ پر مشتمل) ـــــ حیوانات قرآنی ہی کے طرز و نمونہ پر دو اور رسالوں کا بھی منصوبہ بنا رکھا ہے، نباتات قرآنی (بقل ریحان حرث وغیرہ) اور جمادات قرآنی (طین ذہب، فضہ، حدید، وغیرہ)۔

ضرورت جس طرح چند ہی سال کے اندر اُردو تفسیر کی کامل نظر ثانی کی محسوس ہونے لگی، اس سے کہیں بڑھ کر نظر ثانی کی محتاج انگریزی تفسیر تھی، جسے لکھے ہوئے تو اور زمانہ ہو چکا ہے یعنی ۲۷، ۲۸ سال ہو چکے۔ اور اس وقت کا "علم" آج اپنے ہی کو "جہل" نظر آرہا ہے! اللہ اکبر کیا بساط ہے انسانی علم و معلومات کی! ـــــ لیکن انگریزی کام میں اُردو کے مقابلہ میں کہیں زیادہ محنت پڑتی، اور کہیں زاید وقت صرف ہو جاتا۔ کاش کوئی اچھا انگریزی نگار رفیق کار مل جاتا تو اس کی مدد سے جوں توں اس فرض کو بھی انجام دے ڈالتا، لیکن تنہا اتنا تعب اٹھانے کی ہمت اب اس ۸۰ سالہ بوڑھے میں نہیں، خصوصاً جب کہ بصارت بالکل جواب دیتی جارہی ہو ـــــ کتنی ہی آرزوئیں اور تمنائیں ایسی ہیں کہ ان کی حسرت انسان قبر میں ساتھ لے جاتا ہے!

گر بمیریم عذر ما بہ پذیر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

ایک ہلکی سی امید اس کی بھی پڑی تھی کہ ایک انگریزی کتاب اپنے ہی انگریزی ترجمہ قرآن سے اخذ کر کے VOCUBQULARY OF THE QURAN کے نام سے تیار کر ڈالتا! توقع تھی کہ آفتاب سلمہٗ سے بڑی مدد اخذ و التقاط میں مل جائے گی، ان کی ہمت جواب دے گئی، مدد بالکل نہ مل سکی، اور یہ خواب، خواب ہی بن کر

رہ گیا!

دو کام اور بھی اس سلسلے کے محض توفیق الٰہی سے انجام پا گئے، ایک سیرۃ نبوی قرآنی۔ مدت دراز سے، یعنی اپنی جوانی ہی کے زمانے سے تمنا دل میں تھی کہ ایک سیرۃ نبوی محض قرآن سے اخذ کر کے لکھی جائے، نوبت نہ آئی، اب ۵۷ء میں مدراس کے ایک مخلص و فاضل، افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق ایم اے، ڈی فل، زحمت سفر اٹھا کر دریاباد تشریف لائے، اور کہا کہ مدراس یونیورسٹی فلاں خاتون محترم کے فنڈ سے کسی دینی عنوان پر تم سے چند لکچر دلوانا چاہتی ہے، میں نے عنوان یہ عرض کیا، اسے انھوں نے منظور فرما لیا، اور اس طرح اس کا سامان غیب سے ہو گیا، اور جنوری ۵۸ء میں مدراس گیا، یہ لکچر وہاں کئی نشستوں میں سنا آیا۔ اور شروع ۶۳ء میں یہ کتاب خطبات ماجدی یا سیرۃ نبوی قرآنی کے نام سے چھپ گئی۔

ایک اور نئی بالکل نئی چیز ان سب کے بعد حال ہی میں تیار ہو کر نکلی ہے۔ فضائل انبیاء سے تو اُردو لٹریچر بھرا ہوا ہے، لیکن اس کے مقابل کی چیز یعنی "بشریت انبیا" کی طرف شاید کسی کا ذہن ہی نہیں منتقل ہوا، اور لازمی طور پر لوگوں کے دماغ غلو فی العقیدت سے لبریز ہیں، بڑی ضرورت اس میں اعتدال پیدا کرنے کی تھی تاکہ عقیدۂ توحید کمزور اور مجروح نہ ہونے پائے، اللہ کے فضل و کرم نے دست گیری کی اور ۵۹ء یا ۶۰ء میں بشریت انبیاء قرآن مجید میں کے عنوان سے ایک کتاب اوسط ضخامت کی چھپ کر تیار ہو گئی۔

اضافہ ۶۹ء

دنیا نے اردو تفسیر کی واہ واہ کر دی، مگر اپنا دل اس سے بالکل مطمئن نہ تھا

اور اس میں خامیاں، کوتاہیاں نظر آتی تھیں اور دل برابر نظرثانی واضافہ کے لئے تڑپتا رہتا، خصوصاً ایک نئے مقدمہ کے لئے۔ آخر اللہ نے سُن لی، اور بڑی اور چھوٹی اپنی والی ساری کوشش کر ڈالنے کے بعد، کویت کے ایک مخلص ومقبول بندہ کے دل میں اس نے ڈال دی، دس ہزار کی رقم وصول ہو گئی، اور نیا ایڈیشن معنوی اعتبار سے ایک بڑی حد تک نیا ہو کر ۶۸ء میں نکل آیا۔ چھپائی دہلی میں ہوئی، گو اچھی نہیں ہوئی اور کاغذ بھی معمولی سا رہا، پھر چھپائی کی غلطیاں بڑی کثرت سے اور مجھے شرم سے ڈبو دینے والی۔ پہلی جلد سورۂ آل عمران تک کی ہے، اور دوسری جلد (بارہ دس کے ختم تک) کی کتابت اس وقت (جولائی ۶۹ء میں) لکھنؤ میں ہو رہی ہے، یہ بھی انھیں کویت والے صاحب خیر کا فیض ہے، اس کی چھپائی ان شاء اللہ لکھنؤ میں ہوگی۔

بقیہ جلدوں کا اللہ مالک ہے، اندازہ سات جلدوں میں مکمل ہونے کا ہے، ، دو جلدوں کی بھی امید کس کو تھی، اب سارا دل اسی نئے ایڈیشن کی تکمیل میں لگا ہوا ہے، اور وقت کا بڑا حصہ بحمد اللہ اسی کی نظرثانی میں گزر رہا ہے۔

۶۸ء میں بے شان وگمان تاج کمپنی کا خط وصول ہوا کہ انگریزی ترجمہ قرآن (محض ترجمہ بلا تفسیر) ہمارے لئے کر دو، ہم اُسے ارزاں قیمت پر بہت بڑی تعداد میں شائع کریں گے، معاوضہ ۵ ہزار ہم اس مسودے کے وصول ہو جانے کے بعد نوّے دن میں ادا کر دیں گے، میں نے لکھا کہ ۳۰ پاروں کی ٹائپ کرائی (دہری بلکہ تہری کاپیوں کے ساتھ) کاغذ برائے مسودہ وٹائپ کی قیمت ہر ہر پارہ کا محصول ڈاک رجسٹرڈ وغیرہ متفرق مصارف کی میزان تخمیناً ایک ہزار ہوگی، تاج کمپنی نے اسے بھی منظور کر لیا، اس وقت تک ۲۶ پارے انھیں روانہ ہو چکے ہیں، اور ۲۷ و ۲۸ ان شاء اللہ

اسی ماہ کے اندر روانہ ہو جائیں گے۔ اس انگریزی ترجمہ میں جی نہیں لگ رہا ہے، دل تو اسی اُردو تفسیر میں اٹکا ہوا ہے بس لشتم پشتم کسی طرح ضابطہ کی تعمیل کئے دیتا ہوں۔ آگے جو اللہ کو منظور ہو۔

سنہ ۶۸ء ہی تھا کہ پاکستان کے ایک ماہ نامہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی انتخاب کردہ چہل حدیث مع اُردو ترجمہ کے نظر پڑی، جی میں آیا کہ اس کی شرح بڑھا کر اس رسالہ کو بھی اپنا لیا جائے، چنانچہ چہل حدیث ولی اللہی کے نام سے اس کی شرح کے ساتھ اسے مرتب کر دیا ہے اور امید ہے کہ ایک صاحب خیر (دریابادی مقیم کلکتہ) کی اعانت سے اسی سال کے اندر طبع ہو جائے ان شاء اللہ۔ قربان جائیے اس کی شان کریمی کے کہ لگے ہاتھوں یہ خدمت حدیث بھی اس بے علم کے ہاتھوں انجام دلا دی۔

مکتوبات سلیمانی حصہ دوم کا ذکر اوپر آ چکا ہے سنہ ۶۷ء ہی میں وہ بھی سید صاحب ہی کے ایک پاکستانی مرید باختصاص کے سرمایہ سے، حسب معمول میرے کثیر حاشیوں کے ساتھ طبع ہو گئی۔

باب (۳۸)

تصنیف و تالیف نمبر (۴)

تصنیف و تالیف کا تذکرہ کچھ ناتمام سا رہ جائے گا، اگر ایک تصنیف نہیں، محض خوابِ تصنیف کا بھی ذکر نہ کر دیا جائے۔ سنہ ۱۹۱۶ء تھا، ماہ نومبر یا دسمبر کا ذکر ہے، ایک روز شام کو راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں گیا، یہ راجہ علی محمد خان، جو بعد کو "سر" بھی ہوئے اور پھر "مہاراجہ" بھی، اودھ کے تقریباً سب سے بڑے مسلمان رئیس اور بڑے علم دوست اور بڑے مہذب، شائستہ و نستعلیق، مسلمانوں کے ہر کام میں پیش پیش، وقت کے ایک بڑے مسلمان لیڈر، مذہب امامیہ اب دو چار پشتوں سے رکھتے تھے، ورنہ پشتینی سُنی اور نسلاً شیخ صدیقی، اور ہم لوگوں کی برادری میں شامل، چندہ دینے اور مالی اعانت کرنے میں حاتم وقت، اس دورِ زندگی میں مہینہ میں ایک آدھ بار بعد مغرب ان کے ہاں حاضری دے آتا تھا، اور بار بار کھانا بھی ان ہی کی میز پر کھایا، ہاں تو اس روز بھی حاضری اپنی معمول کے مطابق تھی، اب یاد نہیں کہ کس تقریب سے ذکر انگریزی کی نامور ضخیم در ضخیم کتاب انسائکلوپیڈیا برٹانیکا کا چھڑ گیا اور راجہ صاحب بولے کہ اس کا اردو ترجمہ اگر کوئی کرے تو میں ایک لاکھ کی رقم دینے کو تیار ہوں! اتنی بڑی رقم (آج کے ۹، ۱۰ لاکھ کے برابر) کا نام سُن کر جیسے مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا! میرا سن یاد کر لیجئے،

اس وقت ۲۴ سال کا تھا، اور شادی اسی جون میں ہوئی تھی۔

مولانا سید سلیمان ندوی اتفاق سے اس وقت لکھنؤ ہی میں ایک طویل مدت کے لئے مقیم تھے، اور میرے ہی محلہ میں۔ ان سے ذکر آیا، تو وہ بھی باغ باغ ہو گئے، چند روز بعد میں محمود آباد ہاؤس (قیصر باغ) گیا تو اب کی سید صاحب کو بھی ساتھ لیتا گیا، اور تعارف کرایا، آج راجہ صاحب نے پھر وہ وعدہ دُہرایا، مگر مطلق صورت میں نہیں، بلکہ ایک معنی خیز شرط کے ساتھ، یعنی "کوئی اور اگر ایک روپیہ دیتا ہے تو میں ایک لاکھ دیتا ہوں" ہم لوگ اب کی گفتگو میں اسے صاف کر آتے تھے، کہ ترجمہ تو خیر کیا ہوگا، یہ کہیے کہ اسے اُردو کے قالب میں ڈھالنا ہوگا —— خیر ہم لوگوں نے اس کا خوب چرچا لکھنؤ کے علمی، ادبی حلقوں میں کیا، اور اب کی جو میرا جانا ہوا، تو کوشش و اہتمام کے بعد، ایک چھوٹا سا وفد اُردو والوں کا اپنے ساتھ لیتا گیا، تین نام یاد ہیں۔ ایک مولانا عبدالحلیم شرر، دوسرے مرزا ہادی رسوا، اور تیسرے عبدالوالی بی اے (ایڈیٹر ماہ نامہ معلومات) اس صحبت میں راجہ صاحب نے پھر اس عہد کی تجدید کی، لیکن اب کی بشاشت و خوش دلی نہ تھی۔

اب اسے میری خام کاری کہیے یا خوش خیالی، کہ محض ان زبانی وعدوں پر ایک پوری خیالی محفل جمالی، ایک شاندار ہوائی قلعہ تیار کر لیا۔ ترجمہ تو خیر کیا ہو سکتا، یہ کہیے کہ برٹانیکا کے نمونہ پر، اور اسی شاہانہ پیمانہ پر اردو میں ایک عظیم الشان انسائیکلو پیڈیا تیار ہوگی، کام مہینوں نہیں، برسوں تک چلے گا، ایک پورا اسٹاف بھرتی ہوگا، اونچی تنخواہیں ہوں گی، شاندار عمارت میں دفتر قائم ہوگا، مقالہ نگاروں کو معقول معاوضے دیے جائیں گے، تاریخ، طب، قانون، ادب، سیاست، جغرافیہ،

مذہب، فلسفہ، سائنس، آرٹ کی ہر ہر شاخ پر مستند فاضلوں سے مقالے تیار کرائے جائیں گے، بہت بڑا ذاتی پریس قائم ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ شیخ چلی سے بھی بڑھ کر، خدا معلوم کتنے منصوبے بنا ڈالے، کتنی اسکیمیں مرتب کر ڈالیں۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ سید صاحب اور ایک ندوی رفیق (مولانا عبدالباری) کو اپنا ہم خیال بنا کر کتنے اخباروں میں مضمون لکھ ڈالے۔ لکھنؤ کا روزنامہ ہمدم تو اپنا تھا ہی، کلکتہ اور دہلی وغیرہ کے پریس میں جی بھر کر پروپیگنڈا کرایا۔ شعبوں کی تقسیم اور پھر ہر شعبہ کی مختلف شاخوں کی تحتانی تقسیم کر کے، کمیٹیاں سب بنا ڈالیں، اور فلاں ڈاکٹر کو خط لکھ بھیجا کہ شعبہ طب کے انچارج آپ رہیں گے، فلاں ریٹائرڈ جج ہائی کورٹ کو اطلاع دے دی کہ شعبہ قانون کے چیف ایڈیٹر آپ رہیں گے وقس علیٰ ہذا۔ ہفتوں بلکہ مہینوں کی مدت اس خواب شیریں کے دیکھنے میں گزر گئی، اور نتیجہ مطلق کچھ نہ نکلا! ——— اُردو اپنی نشوونما کی جس منزل میں اس وقت تھی یہ کام سرے سے ممکن ہی نہ تھا۔ اور آج اس سارے خیالی پلاؤ کو سوچتا ہوں تو ندامت کی ہنسی اپنے اوپر آتی ہے۔

اس کے سالہا سال بعد، حیدرآباد کے ڈاکٹر محی الدین زور مرحوم نے ایک بہت ہی محدود و مختصر غریبانہ سے پیمانہ پر یہ کام کرنا شروع کیا، اور اس کے حصۂ اوّل کے لئے ایک آدھ مضمون میں نے بھی لکھا، لیکن پھر کام آگے نہ بڑھا۔

بالکل ابتدائی دور کو اگر نظر انداز کر دیا جائے اور ۱۹۱۰ء (عمر کے ۱۸ ویں سال) سے اگر حساب رکھا جائے تو میری تصنیفی عمر اب ۵۶، ۵۷ سال کی ہوتی ہے! العظمۃ للہ! اخباری، کتابی، سارے مسودات تحریر کی کوئی میزان لگائے، تو نوبت ہزارہا مضمون

سے کچھ اوپر کی تو یقیناً آجائے گی ــــــ مالک و مولا! خدا معلوم کتنوں کی زندگی اس قلم نے بگاڑی، کتنا حصہ شر کا اس نے پھیلایا، اور بجائے عبرت و بیداری کے غفلت کا سبق اس نے کتنا دیا! اور یہ علم بھی بس خدا ہی کو ہے کہ کتنے موقعوں پر اس نے بجائے حق کے باطل کا ساتھ دیا! حساب کتاب اور اس کے بعد عفو و مغفرت بھی سب آپ ہی کے ہاتھ میں ہے!

یقیناً بعض دلوں میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ لکھنے لکھانے کا فن آخر کس سے میں نے سیکھا اور کب سیکھا، اصل اور صحیح جواب یہ ہے کہ کسی سے بھی اور کبھی بھی نہیں سیکھا، اور حقیقی معنی میں بالکل بے اُستادا ہوں۔ نہ کسی کی شاگردی اختیار کی، نہ کسی سے اصلاح لی، لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی کے مختلف دوروں میں متاثر بہتوں کی تحریروں سے رہا ہوں۔ اور شعوری ولاشعوری تقلید خدا معلوم کتنوں کے قلم کی کی ہے۔ بالکل بچپن میں یہ اثر مولوی احسان اللہ عباسی چریا کوٹی ثم گورکھپوری (صاحب "الاسلام" و "تاریخ اسلام" وغیرہ) تک محدود رہا، پھر نمبر مولوی ثناء اللہ امرتسری، مولوی حکیم نورالدین "احمدی" اور مولوی نذیر احمد دہلوی کا آیا۔ اس کے بعد دَور خواجہ غلام الثقلین، ظفر علی خان، اور مولوی عبداللہ عمادی کا رہا۔ اور محض ادب و زبان کی حیثیت سے قائل محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، سجاد حسین (اودھ پنچ)، راشد الخیری، ریاض خیرآبادی، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، محمد علی، سید محفوظ علی، اور خواجہ حسن نظامی کا رہا ہوں۔ خیر یہ تو سب میرے بڑوں میں ہوئے۔ برابر والوں اثر کچھ نہ کچھ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا مودودی، مولانا

عبدالباری ندوی اور جہاں تک محض ادب وانشا کا تعلق ہے، قاضی عبدالغفار، سید ہاشمی فریدآبادی کا قبول کیا ہے، بلکہ چھوٹوں میں بھی رشید احمد صدیقی کا، اسوقت نام خیال میں یہی آرہے ہیں، ان کے علاوہ بھی کچھ اور ضرور ہوں گے۔

پھر بھی اگر کسی کے لئے لفظ استاد کا اطلاق کرسکتا ہوں تو وہ بلاشک وشبہ مولانا شبلی تھے، ان کا ممنون احسان دل کی گہرائیوں سے ہوں، لکھنا لکھانا جوکچھ بھی آیا ان کی نقالی میں آیا۔ برسوں ان کا چربہ اُتارتا رہا ہوں۔ ان کے فقرے کے فقرے، ترکیبوں کی ترکیبیں نوک زبان تھیں۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، حُسن ترتیب صفائے بیان ان کا حصہ تھا، اب بھی میرا مشورہ مبتدیوں کے لئے یہی ہے کہ ہر علمی، سنجیدہ مضمون نگاری اگر سلیس انداز میں سیکھنا ہے، تو مولانا ہی کی کتابوں سے سیکھئے ــــ شبلی کے بعد اگر زبان کسی سے میں نے سیکھی ہے تو ان حضرات سے، مرزا محمد ہادی رسوا، مولوی نذیر احمد دہلوی، اور سرشار لکھنوی اور ریاض خیرآبادی ــــ دونوں آزادوں (محمد حسین آزاد، اور ابوالکلام آزاد) کے رنگ وانشا کی دادیں نے بارہا دی ہے۔ فقروں، ترکیبوں پر جُھوم جُھوم گیا ہوں، لیکن اس ساری داد وتحسین کے باوجود ان کے رنگ کی تقلید کی ہمت نہ ہوئی۔ اور اگر کبھی کچھ کرنا چاہی بھی تو نبھ نہ سکی۔ ان پُرشکوہ عبارتوں میں خاصہ رنگ تکلف کا نظر آیا۔ اپنا جی ان تحریروں پر لوٹ ہوتا رہا۔ جو سلیس، سادہ، بے تکلف، رواں، سبک، بے ساختہ ہوں۔

رہی انگریزی، تو انگریزی لکھنا آئی ہی کب، لیکن بہرحال کچھ جھک تو اس زبان میں بھی ماری ہے، اپنی طالب علمی بھر شغف مِل اور اسپنسر، اور اس کے بعد ہکسلے کی تحریروں کا رہا، انھیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پڑھتا، اور قدرۃً نقل انھیں کے انداز

بیان کی کرتا رہا۔ آخر میں رنگ ولیم جیمس (امریکی) کا چڑھ گیا تھا۔ اس دور کے خاتمہ پر اپنے لوگوں میں سب سے زیادہ گرویدگی ایڈیٹر کامریڈ (محمد علی) کی تحریروں سے ہوئی، اور پھر ایڈیٹر ینگ انڈیا (گاندھی جی) کے انداز عبارت سے۔ آخر میں جب انگریزی ترجمہ قرآن کی باری آئی، تو سب سے زیادہ جاذب نظر مارماڈیوک پکھتال کی زبان نظر آئی۔

باب (۳۹)

معاشی و مالی زندگی

تھوڑی بہت زمین داری اودھ کے مسلمان شریف گھرانوں میں عام تھی، ہمارے یہاں بھی تھی، مگر والد صاحب کا اصل ذریعہ معاش اونچی سرکاری ملازمت تھا، بچپن، بلکہ سارا لڑکپن اس وقت کے ۵۰۰ (اور سنہ ۶۷ء کے ۵ ہزار) ماہوار کی آمدنی میں سنہ ۱۹۱۲ء تک والد صاحب کی زندگی میں خاصہ عیش و تنعم کے ساتھ گزر گیا۔ ان کے بعد یہ آمدنی کے یک بیک رُک جانے سے خاصی تنگی شروع ہوگئی، بھائی صاحب کی چھوٹی آمدنی اس کی تلافی ۱/۴ حصہ کا بھی نہ کر سکی، خیر سنہ ۱۳ء میں جب تعلیم ختم کر چکا، تو اب فکر ملازمت کی ہوئی —— ہم "میاں لوگ" اس دَور میں بہ جز ملازمت کے، زراعت یا تجارت کا تو خیال بھی نہیں کر سکتے تھے —— پہلا خیال کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری کی جانب گیا۔ میری فلسفیت کی شہرت خواہ مخواہ ہوگئی تھی اور پرنسپل ڈاکٹر کیمرن بھی مجھ سے خوش تھا، حُسن ظن یہ قائم ہوا کہ جگہ مل جانا یقینی ہے، ملازمت چاہتا بھی ایسے ہی سکون و عافیت کی تھا، ورنہ یوں سنہ ۱۳ء میں گریجویٹ ہو جانے پر خاصہ امکان ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ کا پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اس طرف رُخ قصداً نہیں کیا تھا، اور اس خیال میں مگن تھا کہ کالج والی جگہ تو مل

ہی جائے گی ـــــ نوعمری میں کیسی کیسی خوش خیالیاں قائم رہتی ہیں، اور کیسا کیسا حُسن ظن اپنے متعلق ہو جاتا ہے، خیر وہ جگہ نہ ملنا تھا، نہ ملی۔

۱۳ء میں جب نسبت اپنے دل خواہ طے پا چکی، اور ذکر شادی کا چھڑ چکا تھا تو تلاش معاش اور زیادہ اہمیت سے شروع ہوئی۔ پوسٹ آفس، ریلوے دونوں میں افسر گریڈ کے لئے کوششیں کیں اور سفارشیں بھی اونچی مل گئیں، پھر بھی ناکامی ہی رہی۔ دو ایک دفعہ دہلی میں تو ایسی طبیعت جھنجلائی کہ خودکشی تک کا ارادہ کر بیٹھا ۱۲ء میں کچھ خیال ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد، تعلیمات میں جانے کا ہوا تھا، اور ایک اسکیم راجہ صاحب محمود آباد کے خرچ پر ولایت جاکر کوئی ڈگری لانے کی تھی۔ یہ سب بس خیال ہی خیال رہا، اسباب ناکامی نہ اب یاد، اور نہ ان کے خوامخواہ بیان سے کوئی فائدہ۔

۱۲ء و ۱۳ء میں کچھ خفیف سی آمدنی اُردو کے دو ماہناموں ادیب (الہ آباد) اور الناظر (لکھنؤ) سے ہوتی رہی۔ ایک روپیہ فی صفحہ کے حساب سے، لیکن سال میں اس کی میزان ہی کتنی؟ مولانا شبلی نے عارضی دست گیری کی، کہ سیرۃ النبی کے اسٹاف میں انگریزی ماخذوں سے مواد فراہم کرنے کے لئے، ڈیڑھ دو گھنٹہ روزانہ کام پر ۵۰ ماہوار پر رکھ لیا۔ کام سے وہ بہت خوش تھے، کہ کسی "مولوی صاحب" نے علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کو لکھ بھیجا کہ "مولوی شبلی تو ایک ملحد کی اعانت سے کتاب تیار کر رہے ہیں"۔ میرا الحاد اس وقت کھلا ہوا تھا، اور اس پر وہ تعلق بھی ختم ہو گیا ـــ "فلسفہ جذبات" کا پہلا ایڈیشن نکلا، اور اس پر غالباً ڈھائی سو کی رقم انجمن ترقی اُردو نے دی، ایک

اور صاحب کو ایک تعلیمی رسالہ لکھ کر دے دیا، اور انھوں نے سنو کی رقم پیش کر دی۔
بس اسی طرح لشتم پشتم کام چلتا رہا، بڑی بات یہ کہ بھائی صاحب بچارے (پہلے نائب تحصیلدار، اور پھر تحصیلدار) پوری مدد کرتے رہتے رہے، اور خرچ بڑی حد تک اٹھائے رہے، اور یہی نہیں، بہنوئی جو سگے چچازاد بھائی بھی تھے، وہ بھی ایسی یگانگت میں بھائی صاحب سے کچھ کم نہ تھے ۱۵ء آیا اور راجہ محمود آباد نے محکمۂ تعلیمات میں ایک اونچے عہدہ کے لئے لفٹننٹ گورنر سے مجھے ملوایا بھی اور سفارش بھی کی، لیکن کام نہ نکلا ۱۵ء کے آخر میں انگریزی کتاب سائیکالوجی آف لیڈرشپ لندن میں چھپی، اور کچھ تھوڑی بہت آمدنی اس کی فروخت سے بھی ہوئی۔
۱۶ء آگیا اور شروع جون میں شادی ہو گئی۔ علی گڑھ کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے میری انگریزی کتاب سے خوش ہو کر مجھے کانفرنس آفس میں بطور لٹریری اسسٹنٹ طلب کیا اور ۱۷۵ تنخواہ مکان مفت گویا ۲۰۰۔ اور صاحبزادہ صاحب کام سے خوش بھی رہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ نئی اور محبوب بیوی کو چھوڑ کر گیا تھا۔ جی نہ لگا، چھوڑ کر چلا آیا، اور اب وہی فکر معاش سر پر سوار ہوئی۔ مولوی عبدالحق (انجمن ترقی اُردو والے) پھر کام آئے۔ فلسفہ اجتماع اس درمیان میں چھپ چکی تھی، اور کوئی ڈھائی سو روپیہ اس کا بھی معاوضہ مل گیا تھا اب انھوں نے بعض انگریزی کتابیں اُجرت پر (ایک روپیہ مطبوعہ صفحہ کی شرح سے) ترجمہ کرانا شروع کیں اور اس سے وقت کٹ گیا۔
اگست ۱۷ء تھا کہ انھیں مولوی عبدالحق نے تار بھیج کر مجھے حیدرآباد بلا بھیجا عثمانیہ یونی ورسٹی قائم ہو رہی تھی، اور اس کا پیش خیمہ سرشتۂ تالیف و ترجمہ کھل چکا

تھا، مجھے اس میں مترجم فلسفہ و منطق کی جگہ ملی تھی، مشاہرہ تین سو ماہوار (۶۷ء کے دو ڈھائی ہزار کے برابر) پہلی ستمبر ۱۷ء سے شروع جولائی ۱۸ء تک جم کر رہا. دوست احباب، مخلصین کا مجمع اچھا خاصہ، محبوب بیوی ساتھ، لیکن ملازمت بہرحال ملازمت تھی، جی نہ لگا، پہلی اگست ۱۸ء کو واپس آگیا اور لکھنؤ سے استعفا لکھ کر بھیج دیا۔ اور اب پھر فکر معاش کا سوال پیدا ہوا، اب کی زیادہ شدت سے۔ پہلے تنہا تھا اب بیوی والا تھا، اور بیوی بھی خوش حال گھرانے کی، اونچی معاشرت کی عادی، پھر اولاد کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ بے کاری و بے شغلی بہت کھلی۔ مکالمات برکلے کا ترجمہ اسی زمانہ میں دارالمصنفین کے لئے کیا، اور کچھ کام اس سے چلتا رہا۔ اور معارف کے لئے معاوضہ پر لکھنا بھی شروع کر دیا۔ برطانیہ کے مشہور استاد پروفیسر گیڈس GEDDES ان دنوں بمبئی یونیورسٹی میں تھے، سوشیالوجی کے استاد کی حیثیت سے، انھوں نے اپنی ماتحتی کے لئے بمبئی بلایا، نہ گیا، معذرت لکھ بھیجی۔

فروری یا مارچ ۱۹ء تھا کہ ایک عرض داشت اپنے علمی وظیفہ کے لئے اعلیٰ حضرت نظام کو سر امین جنگ صدرالمہام پیش گاہ عالی کے توسط سے لکھ بھیجی شروع مئی میں تار پر طلبی ہوئی، باریابی ہوئی، بڑے کرم و اخلاق سے پیش آئے۔ بالآخر تصنیفی پنشن سوا سو روپے ماہوار کی مقرر ہو گئی، جو گھر بیٹھے ماہ بہ ماہ پہنچتی رہی، اور ادھر میں دھڑا دھڑ تصنیف و تالیف میں لگا رہا۔ اور یہ مستقل صورت آمدنی کی، حالی و شبلی ہی کی طرح پیدا ہو گئی۔ وہ دونوں بھی اسی دربار آصفی کے پنشن خوار تھے۔

۴۶ء تک یہی رقم جاری رہی، ظاہر ہے کہ ۱۹ء کا مشاہرہ ۴۶ء میں کہاں تک کافی ہو سکتا تھا، جب سر مرزا اسماعیل صدر اعظم ہو کر حیدر آباد آئے، تو میرے مخلص دوست ہوش بلگرامی (ہوش یار جنگ) نے انھیں توجہ دلائی، ان بچارے نے یہی نہیں کہ رقم بڑھا کر پورے ۲۰۰ کر دی بلکہ دو ہزار نقد بھی دلوایا۔

ستمبر ۴۸ء میں سلطنت آصفیہ کا قلع قمع ہو گیا، اور اس لپیٹ میں میری پنشن بھی آگئی، اکتوبر ۵۰ء میں حکم آیا کہ پنشن بند! دہلی سے مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیمات نے میری حمایت میں بڑا زور لگایا، اور بار بار اجراء پنشن کے لئے لکھا، کامیابی نہ ہوئی آخر میں دہلی جا کر پنڈت جواہر لال نہرو سے ملا، ان بچارے نے بھی میری حمایت کی، جب کہیں جا کر جون ۵۱ء میں پنشن دوبارہ کھلی، مگر ۲۰۰ سے گھٹ کر پھر اس سوا سو پر آگئی! دو چار سال بعد میں نے اسے یو پی اسٹیٹ میں منتقل کرا لیا۔ اور اب یہیں لکھنؤ کے خزانہ سے ہر ماہ ملتی رہتی ہے —— اگست ۶۶ء میں اس سرکاری آمدنی میں یوں اضافہ ہوا کہ سرکار ہند نے اس سال اعزازی سند فاضل عربی ARBIC SCHOLAR کی دی، اس سند کے ساتھ ڈیڑھ ہزار کا عطیہ بھی سالانہ ملتا ہے (گویا سوا سو ماہوار) —— اگست ۶۹ء سے یہ رقم بڑھ کر ۳ ہزار سالانہ کی ہو گئی۔ ساتھ ہی یو پی سرکار نے مصنفین واہل فن کے امدادی فنڈ سے بھی ۶۵ء سے علمی پنشن پچاس روپیہ ماہوار ایک سال کے لئے مقرر کر دی اور توقع ہے کہ اس ماہ جولائی سے بڑھ کر ۵۰ کی رقم ایک سال کی اور ہو جائے۔ چنانچہ سو روپے کی ماہوار مجموعی رقم یہ ملنے لگی۔

صدق جب تک دوسروں کے ہاتھ میں رہا، برابر یہی سننے میں آتا رہا کہ خسارہ

سے چل رہا ہے، جب سے انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، اور منیجر حکیم عبدالقوی سلمہٗ کو کیا، جنھیں خود بھی مناسبت صرف تحریری کام سے ہے، انتظامی سے نہیں، پرچہ ماشاء اللہ خاصہ چل رہا ہے، اور اب تو دو چار سال سے خرچ سب نکال کر کارکنوں کی تنخواہ دے کر بچت ماشاء اللہ ۱۸۰ ماہوار کی ہو رہی ہے بلکہ اب کچھ دن سے بڑھ کر ۲۰۰ تک پہنچ گئی ہے، اور صدق کے ساتھ جو چھوٹی سی بک ایجنسی ہے اس کا بھی ماہوار اوسط یہی کوئی ۵۰ کا پڑ جاتا ہے ـــــــ کتابوں کی رائلٹی بھی خاصی مل جاتی ہے، بعض کتابوں کی تو کئی کئی ہزار ملی ہے، گو یکمشت نہیں، بلکہ ایک حد تک قسط وار۔ کتابوں کی فروخت سے ماہانہ آمدنی تقریباً ۱۰۰ کی ہو جاتی ہے۔ مارچ ۶۶ئ میں یوپی گورنمنٹ کی ایک لسانی کمیٹی نے پانچ ہزار کا انعام بہ حیثیت بہترین مصنف اُردو عطا کیا، چند سال قبل ایک اور ترجمہ قرآن کی نظر ثانی کے معاوضہ میں بمبئی کے ایک تاجر نے ایک ہزار کی رقم پیش کی تھی، بعض اور مخلصین بھی گاہے ماہے کچھ نہ کچھ پیش کر دیتے ہیں، ان سب سے زیادہ قابل ذکر کویت کے ایک مخلص ہیں سال میں ایک بار ہزار پان سو کی رقم بھیجتے ہیں، بلکہ ایک سال تو دو ہزار بھیج دیئے تھے، اور اس وقت جو تفسیر قرآن نئے ایڈیشن کی پہلی جلد دہلی میں چھپ رہی ہے، یہ انھیں کے دس ہزار یکمشت عطیہ سے! ایسے مخلصوں کے لیے دعائے خیر، رویں رویں سے نکلتی ہے ـــــــ ایک پرانے مخلص سورت کے (مضافات بمبئی) تھے سیٹھ داؤجی دادابھائی، اب مدت سے ہجرت کر کے ملایا چلے گئے ہیں، بمبئی کی جس کمپنی کے یہ حصہ دار اعظم ہیں، اس کو انھوں نے لکھا کہ تیس ہزار ۳۰۰۰۰ کی بھیج دی جائے، معلوم ہوا کہ اس کمپنی والے اس کی تعمیل میں تامل کر رہے ہیں، تاوقتیکہ اس میں سے پانچ ہزار کی رقم ان کے پسند کیے ہوئے فلاں مدرسہ کو نہ دے دی جاتے۔

چنانچہ اس وعدہ کے بعد ۲۰ ہزار وصول ہو گئے، جس میں سے ۵ ہزار فوراً اس مدرسہ کو بھیج دیے گئے۔ چاروں بھتیجے اور داماد بھی کچھ نہ کچھ اپنی حسب حیثیت پیش کرتے رہتے ہیں۔

غرض زندگی اب اس سن میں (جوانی میں خاصی تنگی جھیلنے کے بعد) ایک حد تک فراغت سے گزر رہی ہے، اور گو موجودہ شرح اشیاء کے زمانے میں خوش حالی کی تو نہیں کہی جا سکتی پھر بھی تنگ دستی کی بھی نہیں، خوش حالی کی ہوتی لیکن ایک بڑا بے ڈھب مسئلہ لکھنؤ میں مکان کا پیش آگیا۔ لکھنؤ کا جو مکان مدت دراز سے ہم لوگوں کا مسکن چلا آرہا تھا وہ خوب وسیع و آرام دہ تھا اس کی اصل مالک میری حقیقی خالہ زاد بہن اور رضاعی خالہ تھیں، بچاری لاولد و بیوہ تھیں۔ انھیں نے اپنی تنہائی کے خیال سے بڑے اصرار و سماجت کے ساتھ ہم لوگوں کو لاکر آباد کیا تھا۔ اب اس کے موجودہ مالک بچارے سخت تنگ حالی میں مبتلا ہو گئے اور اس لق و دق مکان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ایک ٹکڑا گو وہ بھی ہمارے کنبہ کی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں، میں نے سترہ ہزار کا خرید کیا، اور ابھی کچھ اور اس کی مرمت و تجدید میں لگے گا۔ یہ اتنا بڑا بار مصارف نہ پڑ گیا ہوتا تو نفس کو زیادہ فراغت نصیب رہتی —— انسان راحت و آسائش کا کس درجہ بھوکا، بلکہ حریص ہے! کھانے پینے کی طرح رہنے سہنے کو جتنا بھی مل جائے کم ہی ہے!

مالک و مولا کا شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے کہ حق و استحقاق سے کہیں زیادہ کتنی نعمتوں سے سرفراز کر رکھا ہے، اوپر لکھا جا چکا ہے کہ لکھنؤ کے مکان کی ضروری تعمیر میں "ابھی کچھ اور لگے گا۔ یہ "کچھ اور" عملی تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ ہزاروں کی رقم کا ایک

منہ کھولے ہوئے اژدھا ہے۔ اب تک جولائی ۶۹ء میں کم سے کم ۶ ہزار اس پر لگ چکا ہے اور ابھی ختم ہونے کے آثار بہت دُور ہیں۔ اس وقت تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آمدنی اگر ہزار ہا ہزار کی بڑھ جاتے تو سب اسی مکان کی مد میں کھپتی چلی جائے گی۔ ۶۸ء میں دریاباد کے بڑے مستحکم مکان کی ۴۵ فٹ کی لمبی چھت دیمک زدہ ہو کر یک بیک گر پڑی، اور اس کی از سرِ نو تعمیر میں ہزاروں کی رقم اُٹھ گئی۔

باب (۴۰)

شاعری یا تُک بندی

شاعری کہیے یا تُک بندی اس کا تھوڑا بہت خبط بچپن ہی سے سر میں سمایا ہوا تھا، ٹوٹے پھوٹے شعر جو اِدھر اُدھر کہیں سن پاتا، یا کہیں پڑھ لیتا، بس اکثر ہی یاد ہو جاتے اور انھیں موقع بے موقع پڑھ کر سنا دیا کرتا! نو دس سال کا سن ہوگا کہ گھریلو تعلیم کے لئے جو مولوی صاحب رہتے تھے، انھوں نے ایک ننھے منے سے مشاعرہ کی طرح ڈالی ایک چپراسی کو پکڑ کر وحشتؔ بنا دیا، دوسرے سپاہی کو تخلص دہشتؔ عنایت کیا، اور کچھ تخلص میرا بھی رکھ دیا، خود ہی الٹی سیدھی نظمیں ہم سب کی طرف سے کہہ دیتے، اور ان تک بندیوں میں جو سب سے بہتر ہوتی، وہ مجھ سے پڑھوا دیتے، میں خوب کڑک کر اسے پڑھ دیتا۔

دیوان حالی کو شائع ہوتے دو ہی چار سال ہوتے تھے، حلیم بھائی مرحوم (ان کا ذکر شروع میں کئی بار آچکا ہے) بڑے قدر دان کلام حالی کے تھے، ان کے پاس یہ دیوان بھی موجود تھا اور کلام حالی ہی کے دو ایک مجموعے اور۔ تو کلام حالی سے تھوڑی بہت مناسبت اسی زمانے سے ہوگئی۔ ریاض الاخبار میں دو ایک سال بعد جو ردّ و قدح اس کلام کی شائع ہوئی وہ بھی پڑھتا رہا، گو اس سن میں سمجھا خاک نہیں ـــــ سن

ذرا اور کھسکا تو گلچیں نامی ایک گلدستہ جو وسیم خیرآبادی نکالتے تھے وہ بھی پڑھنے لگا اور اسکول میں داخل ہونے کے بعد غالب، امیر، داغ کے نام سے خوب مانوس ہوگیا اور معاصرین میں اقبال و حسرت موہانی کے نام سے بھی کان خوب آشنا ہو گئے، حسرت کا ماہنامہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ سے نکلنا شروع ہوا تھا، اُسے بھی دیکھنے لگا، اسے پڑھ کر کچھ معنی تنقید کے سمجھ میں آنے لگے۔ یاد ہے کہ جس مضمون میں کسی شاعر کے کلام پر اعتراض ہوتا، وہ پڑھ کر بڑا خوش ہوتا ـــــــ لڑکپن کا زمانہ سیتاپور میں گزرا، وہاں شیعہ آبادی کثرت سے تھی، ان کی مجلسیں سننے کا بار بار اتفاق ہوا، اس سے طبیعت مرثیہ گوئی کی طرف تو نہیں، البتہ اس سلسلہ کی دوسری چیزوں، سلام، رباعیوں وغیرہ کی طرف مائل ہوئی اور کچھ نہ کچھ کوشش بھی بچکانہ معیار پر اس رنگ میں کہنے کی کر ڈالی شعر تو کثرت سے یاد ہو گئے تھے اور بیت بازی کا رواج اس وقت عام تھا، جس طرف میں ہوتا، اکثر وہی فریق جیتتا۔

کالج میں پڑھنے جب لکھنؤ آیا، اور عمر اب سولہ سال کی تھی، تو قدرۃً یہ رنگ اور چمک گیا، اور شعری مناظروں سے بڑی دل چسپی ہوگئی (مثلاً "معرکۂ چکبست و شرر" سے) کلاس میں ایک صاحب سے کچھ نوک جھونک ہوگئی، اور ان کی ہجو میں ایک پوری نظم کہہ ڈالی۔ وہی غلط در غلط قسم کی، اور لفظ و معنی دونوں کا خون کرتی ہوئی ہلکی سی جھلک اس کا ملاحظہ ہو، پہلے شعر میں اصل نام کے بجائے صرف اس کا وزن درج ہو رہا ہے:-

ایک صاحب "مفاعلن" تھا نام ان کا

تھے وہ کالج میں بہت مشہور عام

جس طرف سے ان کا ہوتا تھا گزر
لوگ کرتے تھے انکو جھک جھک کر سلام
کوئی کہتا (آگے کا مصرع یاد نہیں پڑتا)
ہم کھلائیں گے تمہیں املی اور آم

آخر میں دکھایا یہ تھا کہ یہ صاحب دلاّں قسم کے ہیں، اور اسی لئے ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے —— اس خرافاتی شاعری سے جلد ہی پیچھا چھوٹ گیا۔ ذہن کو پہلے تو کلام اکبر نے اپنی طرف ملتفت کیا، اور پھر سال ڈیڑھ سال بعد رسائی مولانا شبلی کی مجلس میں ہوگئی، اور حاضری اس دربار میں پابندی سے ہونے لگی، اس صحبت نے بڑا کام کیا۔ مولانا کے اور کمالات جو تھے، وہ تو تھے ہی، میری نظر میں ان کا شاید سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ شعر کے مُبصر اعلیٰ درجہ کے تھے، میں یہ کیا کرتا، کہ جو شعر اِدھر اُدھر سے کان میں پڑ جاتا، اسے کسی طرح مولانا کو ضرور سُنا دیتا، انھوں نے اگر اسے پسند فرمالیا، تو بس مجھے بڑی سند ہاتھ آجاتی اور اگر انھوں نے داد نہ دی تو وہ شعر میری نظر سے بھی گر جاتا۔ غرض جس طرح نثر نویسی میں مَیں نے مولانا کے مقالوں اور کتابوں سے جی بھر کر استفادہ کیا، اسی طرح سخن فہمی میں تھوڑی بہت جو تمیز حاصل ہوئی، وہ مصنف شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کی حاشیہ نشینی سے۔ مولانا کی عادت کبھی اس موضوع پر طویل گفتگو کی نہ تھی کوئی شعر پڑھ کر بس اس کی مختصر سی تشریح کر دیتے اور یہی بالکل کافی ہو جاتی۔ سارا مغز ان چند لفظوں کے اندر آجاتا۔ مولانا کی وفات نومبر ۱۴ء میں ہوئی، اور اس سے چند مہینے پیشتر وہ لکھنؤ بھی آچکے تھے اور اس کے بعد ہی میری نیازمندی حضرت اکبر الہ آبادی سے بڑھی، اور اس نے سخن فہمی کی اور آگے کی منزلیں میری بساط

کے لائق طے کرا دیں، شبلی اگر شعر کے ظاہر کے مبصر تھے اور اس کے ادبی حسن و صناعت کے، اس کے آرٹ کے پرکھنے والے، تو اکبر اس کے معنی کے مصوّر تھے، اس کے جمال معنوی کے روشن گر، اکبر کی زبان سے ان کے شعر سُن کر پہلی بار یہ بات سمجھ میں آئی کہ شعر معنوی حیثیت سے کتنا بلند و پُر معرفت ہو سکتا ہے، ان دونوں باکمالوں کا فیض اگر نہ شامل ہو جاتا تو اپنا مذاق شعری خدا معلوم کتنا پست و ناقص رہ جاتا!

۱۴ء ہی تھا کہ خود بھی غزل گوئی شروع کر دی۔ تازہ و جائز عشق اپنی منگیتر سے پیدا ہو چکا تھا، اس نے محبت کے شاعرانہ جذبات کو بیدار کر دیا، اور میں دیکھتے ہی دیکھتے غزلوں پر غزلیں کہنے لگا، یوں معتقد تو میں اُردو کے سب شاعروں سے بڑھ کر غالب کا تھا مگر حوصلہ ان کے رنگ میں کہنے کا کبھی نہ ہوا، کچھ گری پڑی کوشش تقلید کی اگر کی تو مومن اور حسرت موہانی، شیفتہ و داغ، ریاض و عزیز کی، اور غزلیں جو کہیں وہ زیادہ تر انھیں دونوں کی زمینوں میں۔ تعلقات لکھنؤ اور جوار لکھنؤ کے بعض مشہور شاعروں سے اچھے خاصے تھے، مثلاً ریاض، حسرت، عزیز، ثاقب سے، لیکن اپنے طبعی شرمیلے پن کا یہ عالم تھا کہ ان لوگوں کے سامنے کوئی شعر تو کیا پڑھتا، ان پر کبھی ظاہر ہی نہ ہونے دیا کہ میں بھی الٹی سیدھی قافیہ پیمائی کر لیتا ہوں۔ ہاں آخر میں حضرت اکبر سے ہیاؤ کھل گیا تھا، ان کی خدمت میں کبھی اپنی کوئی غزل اصلاح کی غرض سے بھیج دیتا، اکثر تو حضرت بس حوصلہ افزائی ہی کے کلمے لکھ کر انھیں واپس کر دیا کرتے تھے، اور کبھی ایک آدھ لفظ بدل دیتے، ایکبار ایک بات بڑی نکتہ کی لکھ بھیجی، سب کے کام آنے والی، فرمایا کہ "غزل کہہ کر بس رکھ لیا کیجئے اور کچھ دن بعد اسے اٹھا کر دیکھئے، تو خود ہی اپنے کلام کی خامیاں نظر آ جائیں گی"— یہ بات دل میں اُتر گئی، ورنہ کہتے وقت تو اپنا مہمل سے مہمل شعر بھی اپنے کو خوش نما اور

جاندار ہی نظر آتا ہے۔

تخلص ناظر اختیار کر لیا تھا، کئی غزلوں کے مقطع میں دیے آیا ہوں۔ اب اس دور کے کلام کو کیا دُہرایا جائے، اور پڑھنے والے کے ذوق سلیم کو دھچکا پہونچایا جائے۔ نہ زبان، نہ تخیل، کوئی بات بھی تو موجود نہیں، یہ حضرت اکبر کی محض مروت تھی جوان سے حوصلہ افزائی کے کلمے کہلوا دیتی اور ہاں لکھنؤ کے بہترین غزل گو شاعر اس وقت مرزا محمد ہادی مرزا تھے، یوں بھی کم گو تھے، اور مشاعروں میں تو اور بھی کم جاتے، شہرت نصیب میں نہ آئی۔ اپنی وفات (۱۹۳۳ء) پر مشہور ہوئے ہیں، تو شاعر کی حیثیت سے نہیں، محض ناول نگار کی حیثیت سے، ناول نویسی کو اس وقت کا ایک ثقہ طبقہ اپنے لئے باعث فخر نہیں، موجب ننگ سمجھتا، اور اس سے شرماتا۔ مرزا صاحب بھی اسی طبقہ کے تھے ناول لکھتے تو چہرہ پر "مرزا رسوا" کی نقاب ڈال لیتے، قسمت کی ستم ظریفی کہ شہرت جو کچھ نصیب ہوئی، وہ اسی رسوائی کو، "مرزائی" کو کسی نے پوچھا تک نہیں! بہرحال اپنے کو ان کی شاعری سے بھی خاصی عقیدت تھی، اور ایک آدھ غزل ان کی زمین میں کہہ ڈالی تھی اس پوچ گوئی کی یادگار کے طور پر دو ایک شعر آخر کے لکھے بھی دیتا ہوں، جو اتفاق سے حافظہ میں رہ گئے ہیں، ورنہ کوئی بیاض وغیرہ اب کہاں۔ ایک زمین تھی "خدا نے رکھا" "دوا نے رکھا"۔ اس میں عرض کیا تھا ؎

شوخیاں تیری نہ ظاہر ہوئیں خود تجھ پر بھی

تجھ کو دھوکے میں تری شرم و حیا نے رکھا

ایک اور زمین تھی "محنت کئے ہوئے" "قدرت کئے ہوئے" اس میں عرض کیا تھا:

پھر جی میں ہے کہ دیجئے ہمت کا امتحان
انجام کو حوالۂ قسمت کئے ہوئے!

وغیرہ ذلک من الخرافات ——— غزل گوئی کا یہ دَور کوئی چار سال قائم رہا، یعنی ۱۹۱۸ء تک، گو اس کا زور شادی کے بعد ہی جون ۱۶ء میں ختم ہو گیا تھا۔

۱۶ء میں مولانا محمد علی جوہر کے خطوں سے معلوم ہوا کہ مولانا نے چھندواڑہ ہی میں (سی، پی، موجودہ ام، پی) نظر بند رہ کر شاعری اور غزل گوئی شروع کر دی ہے چنانچہ یہ غزلیں پڑھ دل میں نئے سرے سے ایک امنگ پیدا ہوئی خود بھی ایک دو غزلیں کہہ ڈالیں۔ اور معارف (اعظم گڑھ) نے ۱۷ء میں وہ شائع بھی کر دیں۔

شاعری یا تک بندی جیسی کچھ تھی، چار سال تک اس کا چشمہ خشک رہا، یہاں تک کہ ۲۲ء مارچ اپریل کا زمانہ آگیا، اور اب میں الحاد کے چکر سے عرصہ ہوا نکل کر پختہ محمدیؐ ہو چکا تھا کہ اتنے میں مولانا محمد علی کی غزلیں بیجاپور جیل سے کہی ہوئی دست یاب ہو گئیں (مولانا کی پہلی اسیری ۱۹ء میں ختم ہو کر اب یہ دوبارہ جیل کی زندگی شروع ہو گئی تھی) اور یہ نعتیہ کلام پڑھ، طبیعت بے چین ہو گئی، اور جذبہ شعر و شاعری از سرِ نو بھڑک اٹھا، البتہ یہ شاعری زلف و کاکل، لب و رخسار کی نہیں رہ گئی تھی، اب رنگ تمام تر نعت نبیؐ کا غالب تھا، پہلی غزل جوہر ہی کی زمین میں تھی، جوہر کا مطلع تھا ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

اسی زمین پر غزل کہی تھی، اس کے دو شعر یہ تھے ؎

پڑھ صلِّ علیٰ حق کے محبوب کی ہوں باتیں
رحمت کی گھٹائیں ہوں اور نور کی برساتیں
محشر میں اماں پائی صدقے میں درودوں کے
دشواری میں کام آئیں، بھیجی ہوئی سوغاتیں

ایک دوسری غزل خوب چلی، یا یہ کہیے کہ قوّالوں نے خوب چلائی محفلوں میں گا گا کر، اور کم سے کم دریاباد میں تو اب بھی ۴۵ سال گزر جانے پر، عرس کے موقعوں پر سُنی ہی جاتی ہے۔ اور قوالوں کو روپیہ بھی دلوا جاتی ہے۔ دو ایک شعر عرض ہیں۔

پڑھتا ہوا محشر میں جب صلِّ علےٰ آیا
رحمت کی گھٹا اٹھی، اور ابر کرم چھایا
چرچے ہیں فرشتوں میں، اور رشک ہے زاہد کو
اس شان سے جنت میں شیدائے نبی آیا
عزت کی طلب چھوڑی، حکمت کا سبق چھوڑا
دنیا سے نظر پھیری، سب کھو کے تجھے پایا
اک عمر کی گمراہی، اک عمر کی سرتابی
جز تیری غلامی کے آخر نہ مفر پایا
فاسق کی ہے یہ میت، پر ہے تو تری اُمت
ہاں ڈال تو دے دامن کا اپنے ذرا سایا

دو چار غزلیں اور بھی اسی رنگ کی ہوں گی، یہ زور ۲۴ء تک قائم رہا، اس کے بعد سے شعر کہنا بند ہے، نہ کوئی داعیہ و ولولہ شعر کہنے کا پیدا ہوا، اور نہ کبھی یکسوئی

کے ساتھ فکر سخن کی فرصت نصیب ہوئی۔ ہاں تفریح و تفنن کے طور پر مصرعوں کی حد تک شاعری اب بھی کر لیتا ہوں، اور اپنے ہی کسی نثری مضمون میں وہ مصرعے کھپ بھی جاتے ہیں۔

اچھے شعر سننے کا شوق بدستور قائم ہے، اور اس میں کسی رنگ کی قید نہیں، معرفت کا ہو یا ٹھیٹھ مجاز کا، اس میں شعریت ہونا چاہیئے، بس اس سے لوٹ ہو جاتا ہوں۔ اور اگر شعر بہت ہی پسند آگیا تو اکثر ایک ہی دفعہ میں یاد بھی ہو جاتا ہے ("ہو جاتا ہے" نہیں، "ہو جاتا تھا" اب تو آیات قرآنی تک میں حافظہ دغا دے جاتا ہے) ــــــ محبوب شاعروں کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ سب کے نام لکھنے کی گنجائش ہی کہاں۔ مختصر یہ کہ فارسی میں سب کی سرتاج مثنوی ہے، اس میں جو کشش ہے، اس کی آدھی بھی، اسی شاعر کی غزلیات یعنی کلیات شمس تبریز میں نہیں پاتا ہوں۔ رومی کے بعد نمبر عطار کا آتا ہے، پھر خسرو کا اور پھر جامی کا اور سعدی کا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ میں نے ان کو پڑھا بس واجبی سا، حافظ کا بھی قائل ہوں لیکن صرف ان کی شاعری کا، ان کے تصوف و معرفت کا نہیں۔ عرفی، صائب، عراقی کو اور بھی کم پڑھا ہے، البتہ جب کہیں ان کا کوئی شعر نقل دیکھ لیتا ہوں تو طبیعت پھڑک جاتی ہے۔ ہندوستان کے فارسی گویوں میں غالب، شبلی، اقبال، حمید فراہی، خواجہ عزیز، اور عزیز صفی پوری کا گرویدہ ہوں۔ اور اقبال کی مثنویوں اور غزلوں میں تو جاذبیت بھی مولانا روم کے بعد ہی پاتا ہوں۔ رہے اُردو شاعر تو اس میں اپنے پسند کے شاعروں کی فہرست مختصر ہی رکھوں جب بھی اچھی خاصی طویل ہو کر رہے، صرف گنتی کے چند نام لکھ کر چھوڑے دیتا ہوں۔ غالب[۱]، حسرت[۲]، حالی[۳]، اکبر[۴]، اقبال[۵]، داغ[۶]، ریاض[۷]، مجذوب[۸]، عزیز لکھنوی[۹]، جوش[۱۰] ملیح آبادی اور ان دس کے کم سے کم

دس گُنے اور۔ یہ بھی عرض کر دوں جس طرح مریض، بہت معمولی طبیبوں بلکہ نیم حکیموں کے ہاتھ سے شفا پا جاتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ ہر شعر کا کہنے والا بھی کوئی اعلیٰ شاعر ہو۔ بعض بہت معمولی شاعر بھی شعر بہت اچھا کہہ جاتے ہیں۔

انگریزی شاعری سے مطلق مَس نہیں، اور عربی کی اتنی استعداد نہیں کہ عربی شاعری کو کچھ بھی پڑھ سکوں۔

باب (۴۱)

سفر

سفر میں نے نہ کچھ زیادہ کئے، نہ زیادہ دُور دراز کے، پھر بھی آپ بیتی کی خانہ پری کے لئے کچھ اس عنوان پر بھی لکھنا ضروری ہے۔

بچپن میں سفر کا شوق ہونا قدرتی ہے، اپنے کو بھی رہا۔ یاد ہے کہ ہر چھوٹے بڑے سفر کی کتنی خوشی ہوتی تھی، سفر کا دن گویا جشن کا دن ہوتا تھا۔ سن اور بڑھا، تو اسی کے ساتھ یہ شوق بھی اور بڑھا، اور طبیعت سفر کے بہانے ڈھونڈھنے لگی، نہ کسی ذمہ داری کا خاص احساس تھا، نہ کوئی تکلیف، تکلیف محسوس ہوتی تھی، خود اعتمادی خوب بڑھی ہوئی تھی، قرب و جوار کے بہت سے شہر اور دیہات بچپن ہی میں دیکھ ڈالے تھے، زیادہ تر والد مرحوم کے ساتھ، شہر جیسے لکھنؤ، فیض آباد، سیتا پور، لکھیم پور، گورکھپور، اور اناؤ۔ اور قصبات و دیہات جیسے سندیلہ، خیرآباد، لاہرپور، کاکوری۔

ادھیڑ سن میں تکلیف کا احساس بڑھ جاتا ہے، اور ضعیفی و پیرانہ سالی میں تو اور زیادہ سہارے کی ضرورت قدم قدم پر پڑنے لگتی ہے، اور ہندوستان کی ریلوں، بسوں وغیرہ میں تو "آزادی" کے بعد سے اب یہ تکلیفیں بھی بہت پیدا ہوگئی ہیں۔ اوقات کی پابندی نہ ہوتا، کرایوں کا بہت زیادہ بڑھ جانا، ہجوم کی ریل پیل، وغیرہا۔ اور اب سفر عموماً

بڑا باعث زحمت ہوگیا ہے۔

ذیل کے شہر پڑھنے یا امتحان دینے، بعد کو امتحان لینے کے سلسلہ میں بار بار دیکھے! الہ آباد، علی گڑھ، دہلی۔

ذیل کے مقامات حصول ملازمت کی تلاش میں دیکھنے میں آئے، نینی تال اور شملہ۔

زندہ بزرگوں یا مزارات کی زیارت کے سلسلہ میں مقامات ذیل پر حاضری ہوئی تھانہ بھون، صفی پور، پیران کلیر، ردولی، دیوا، اجمیر، عزیزوں، دوستوں سے ملنے ملانے ان مقامات پر پہونچا۔ پٹنہ، مرادآباد، ہردوئی، گونڈا، بستی پرتاپ گڑھ، اورنگ آباد، سہارن پور، دیوبند، نگرام، گدیہ، جگور، بڑاگاؤں، رسولی، مسولی، بانسہ، لاہور، کراچی، کرنول، بھوپال، بمبئی، کلکتہ، بنارس، سرائے میر، اعظم گڑھ، پھریا، بھیارا، دیسنہ، گیلانی، بھوالی، مسوری، امروہہ، رائے بریلی، گلبرگہ، پھلواری شریف۔ حیدرآباد بارہا جانے کا اتفاق ہوا، اور بہ سلسلہ ملازمت بھی قیام اٹھارہ مہینے رہا۔ مدراس لکچر دینے کی غرض سے گیا۔ اور باندا تو اپنی سسرال ہی تھی۔ پانی پت مولانا محمد علیؒ کے ساتھ جانا ہوا تھا، اردو کی ایک سرکاری کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے جے پور کا سفر بھی دو بار کیا۔

آرام طلب اور آسائش پسند (آرائش پسند نہیں) ہمیشہ سے رہا ہوں، اس لئے تھرڈ کلاس میں عموماً تکلیف محسوس کرتا ہوں، چھوٹے سفر عموماً انٹر کلاس، سکنڈ کلاس (پرانے انٹر کلاس) میں کرتا ہوں اور بڑے سفر اکثر فرسٹ یا پرانے سکنڈ کلاس میں۔ بڑے سفر میں خدمت گار بھی ساتھ رکھنے کا معمول ہے۔

میزبان بحمداللہ ہمیشہ بڑے خاطر مدارات کرنے والے ملے۔ کس کس کے نام لوں، اپریل ۵۵ء میں گورنر جنرل پاکستان ملک غلام محمد کی دعوت پر سفر کراچی کا کیا،

پھر ایک پوری پارٹی کے ساتھ اور راہ میں لاہور بھی ٹھہرتا گیا۔ گورنر جنرل ہاؤس کے ٹھاٹھ باٹ، سازوسامان، خاطرداریاں دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اگست ۵۷ء میں پٹنہ گیا۔ گورنر ڈاکٹر ذاکر حسین خان کا مہمان ہوکر، اور خوب ان کی میزبانی کا لطف اٹھایا دیسنہ، گیلانی، پھلواری شریف، نالندہ، راجگیر کی سرسری سیر بھی اسی ضمن میں ہوگئی، اخیر اگست ۵۶ء میں کلکتہ گیا، دریابادی تاجروں نے اپنے ہاں بلایا اور مہمان داری کا حق ادا کر دیا، اخیر ۵۷ء میں شروع ۵۸ء تک لاہور جانا ہوا، اسلامی مذاکرہ کے سلسلہ میں، اور اس کے بعد ہی مدراس جانا ہوا، سیرۃ نبوی قرآنی پر لکچر دینے، ڈاکٹر عبدالحق افضل العلماء ایک مثالی میزبان ثابت ہوئے، میرے معمولات اور جذبات کی رعایت ادنا جزئیات تک میں کی۔ ۶۲ء نئی دہلی میں نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان کا مہمان رہا۔ اور دوبارہ اپریل ۶۷ء میں ان کے صدر منتخب ہونے سے چند روز قبل بھی ان کا مہمان ڈیڑھ دو دن رہا۔

مصارف سفر، سرکاری سفروں میں تو حکومت کی طرف سے دیر یا سویر مل ہی جاتے ہیں، اور یوں بھی بعض مخلص بڑی حد تک بار ہلکا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جون ۵۶ء میں جب تین رفیقوں کے ہمراہ کلکتہ جانا ہوا تھا تو واپسی کا سارا خرچ وہاں کے امینیہ ہوٹل والوں (مخلصین دریاباد) نے پیش کر دیا تھا، اسی طرح اپریل ۵۵ء میں جو سفر تین رفیقوں کے ساتھ کراچی و لاہور کا گیا تھا، اس کا بل ۵، فی صدی وہاں کی حکومت ہی سے وصول ہو گیا تھا، پھر بھی اچھا خاصہ خرچ اپنی گرہ سے سفر میں ہو ہی جاتا ہے۔

دلّی طالب علمی کے زمانے میں ایک اجنبی شہر تھا، اور اس کے دو چار سال بعد

تک بھی اجنبی ہی رہا، جب جانا ہوتا تو چاندنی چوک کے کسی ہندوستانی ہوٹل میں ٹھہر جاتا پھر خواجہ حسن نظامی کا مہمان رہنے لگا ۲۲ء و ۲۳ء میں، اور خواجہ صاحب نے حق مہمان نوازی بڑی سیر چشمی کے ساتھ ادا کیا۔ اکتوبر ۲۴ء سے سنہ ۳۰ء تک دہلی جانا ہوتا زیادہ تر ہمدرد کے کام سے، اور کبھی خلافت کمیٹی کے جلسہ مرکزی میں شرکت کے لئے، مہمان ہمیشہ مولانا محمد علی کا رہا، اور ان کے ہاں کی پُر لطف صحبتوں کا مزہ زندگی بھر بھولنے والا نہیں، بعد کے میزبان کبھی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نائب صدر جمہوریہ رہے اور کبھی شفیع صاحب مالک پیکارڈ واچ کمپنی۔ دونوں نے اپنے اپنے مرتبے کے لائق خوب میزبانی کی۔ کئی سال کا ایک درمیانی زمانہ ایسا بھی گزرا، جب میزبان سید مرتضیٰ علی ہوا کرتے تھے، اخلاص و محبت کے پتلے ——— تھانہ بھون حاضری دس بارہ بار تو ضرور رہی ہوگی، دو چار دن کے لئے جاتا تو مہمان براہ راست حضرت تھانوی کا ہو جاتا اور جب کئی ہفتوں کے لئے جانا ہوتا تو الگ مکان لے کر، خود انتظام کھانے پینے کا رکھتا، مولانا کے الطاف بے کراں ہر صورت میں رہتے۔ کلکتہ ایک بار سنہ ۱۳ء میں اپنے آخری دور طالب علمی میں جانا ہوا تھا، اجنبی شہر تھا، مولانا ابو الکلام نے زبردستی اپنا مہمان بنا لیا اور ایک ہفتہ تک پوری خاطر داریوں کے ساتھ مہمان بنائے رکھا۔

حیدر آباد زندگی میں بارہا جانا ہوا، ابتدائی دور میں سید امین الحسن بسمل موہانی (ناظم سالار جنگ اسٹیٹ) کے اخلاص و اکرام بے کراں کا کیا کہنا، پردیس کو وطن بنا دیا، عرصہ کے بعد کبھی کبھی مولانا عبد الباری اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی بھی مہمان داریوں کا مزہ لوٹا۔ اور آخر میں تو ڈاکٹر ناظر الدین حسن (نواب ناظر یار جنگ) کا گھر تو اپنا ہی گھر تھا میرے حقیقی ہم زلف۔ اور ان دونوں بہنوں کی محبت ضرب المثل تھی ——— باندا اور سیتاپور

کا ذکر کیا کروں، باندے جاکر جوانی، بھرپور جوانی نئے شوہر اور داماد والی، یاد آجاتی ہے اور سیتاپور جاکر بچپن، ناز و نعمت سے بھرپور بچپن پورا نظر کے سامنے پھر جاتا ہے۔ سیتاپور سے کوئی خاص تعلق سالہا سال سے نہیں، پھر بھی بے تاب ہو کر کبھی کبھی چلا جاتا ہوں، اور کسی سے ملنے ملانے نہیں، بلکہ وہ کوٹھی، وہ اسکول، وہ سڑکیں، جن پر بچپن بھر گھومتا رہا، دیکھ کر اور ان پر رُو رُلا کر، حسرت کے داغ دل پر لئے واپس چلا آتا ہوں۔ ہائے وہ معصومیت کا سن! کیسے اس دَور کو واپس لے آؤں! ـــــ اور کچھ اسی سے ملتا ہوا تعلق خاطر سندیلہ کے اس مکان سے بھی ہے جو کبھی ایک شاندار حویلی تھا اور اب محض ایک کھنڈر ہے۔ دیکھا نہیں مگر بارہا سنا ہے کہ والد اور والدہ دونوں نے عیش و کامرانی کے کئی سال وہاں گزارے۔

سنہ ۱۹۲۹ء تھا اور میں ۳۷ سال کی عمر کا، کہ اللہ نے حج کی توفیق دے دی، ہم میاں بیوی، اپنے قویٰ کی پوری صحت کے زمانہ میں جاکر حج و زیارت سے فراغت کر آئے۔ وسط مارچ سے شروع ہو کر آخری مئی میں سفر ختم ہوا، اور یہ ساری مدت بڑے عیش و آرام سے گزری۔ ٹکٹ تھرڈ کلاس کے تھے، جہاز والوں نے خود ہی اول درجہ میں بلکہ اول درجہ خصوصی کر دیا۔ کپتان کے کمرہ سے بالکل متصل، قافلہ میں علاوہ مخلص عزیزوں کے رفاقت فاضل جلیل مولانا مناظر احسن گیلانی کی بھی حاصل رہی، جدّہ میں ہندوستانی قنصل جناب احسان اللہ خان پنجابی، خشک مشہور تھے، لیکن انھوں نے بھی ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور مدینہ منورہ میں تو مولوی سید احمد صاحب فیض آبادی کی مسافر نوازیوں نے سفر کو وطن ہی بنا دیا ـــــ ربوبیت کے بھی عجائب کاروبار ہیں، جو مجاہدہ ہوتے

ہیں، ان سے سفر میں بھی طرح طرح کے مجاہدات کرائے جاتے ہیں، اور پوری شان عزیمت کا ظہور ان کی ذات میں کرایا جاتا ہے، اور جو میری طرح پست ہمت و بے حوصلہ اور تن آسانی کے بھوکے ہوتے ہیں، انھیں انھیں کی خوراک پیٹ بھر تک بہم پہنچا دی جاتی ہے۔ کلًّا نُمِدُّ ھٰؤلاءِ وھٰؤلاءِ من عطاءِ ربّك وما كان عطاءُ ربّك محظورًا۔

اگست ۱۹۵۷ء میں ذاتی حیثیت سے گورنر بہار ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی، اور ایک لسانی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے ۶۲ء سے لے کر آخر ۶۴ء تک دو بار گورنر راجستھان، ڈاکٹر سمپورنانند کی میزبانی کا پورا لطف اٹھایا، جیسا کہ اس سے قبل اپریل ۵۵ء میں گورنر جنرل پاکستان ملک غلام محمد صاحب کی میزبانی کا لطف چار آدمیوں کے قافلہ کے ساتھ ایک ہفتہ تک اٹھا چکا تھا ——— کلکتہ، بمبئی، حیدر آباد، دہلی، لکھنؤ، شملہ، نینی تال، مسوری، لاہور کے مختلف ہوٹلوں کے تجربے، عمر کے مختلف حصوں میں ہوتے رہے اور گرم و سرد بہت کچھ چکھنے میں آگیا۔ اور جنوری ۵۸ء میں مدراس کا چند روزہ اور کرنول کا ایک روزہ سفر بھی یاد رہ جانے والی چیز ہے۔ مرحوم و محبوب افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق جہاں اور حیثیتوں سے بھی ایک مثالی انسان تھے، میزبان کی حیثیت سے بھی اپنی مثال بس آپ ہی تھے ——— اللہ بے شمار رحمتیں نازل کرے ان پر، اور ان کے علاوہ بھی دوسرے میزبانوں اور نیم میزبانوں پر۔

ختم پر میزبانوں کی طویل فہرست میں دو ایک نام اور یاد پڑ گئے، بھوپال کے میزبان مولانا محمد عمران خان ندوی، اور ان سے قبل سید مرتضیٰ علی سندیلوی جج ہائی کورٹ رامپور کے میزبان پہلے ہوش بلگرامی اور بعد کو عزیزی فہیم الزماں، اور لاہور کے میزبان عزیزی

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن سلمہ۔

سفر دہلی میں دو بار محمد شفیع صاحب گھڑی والے (مالک پیکارڈ واچ کمپنی) کے ہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، دونوں بار خوب خدمت کی۔ دہلی ایک بار غالباً ۶۲ء میں جانا ہوا، جب بھی انھیں کے ہاں۔ ایک لمبا سفر اور درمیان میں حیدر آباد کا کیا، قیام ناظر یار جنگ کے ہاں رہا اور خوب خوب خاطریں رہیں، زاہدہ سلمہا مع اپنی والدہ کے وہاں پہلے پہونچ چکی تھیں۔ واپسی میں ان کا ساتھ رہا۔ بھوپال بھی پڑا اور مولانا عمران خاں ندوی کی میزبانی کا لطف اٹھایا، بھوپال ایک بار پھر ۱۹۶۷ء میں گیا اور اب کی حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی کی زیارت کے لئے صحبت سے خوب مستفید ہوا۔ میزبانی اب کی بھی خاں صاحب ہی کے ذمہ رہی۔ علی گڑھ سال دوسرے سال جانا ہوتا رہتا ہے، شعبہ دینیات (یونی ورسٹی) کے ممبر کی حیثیت سے اور کئی سال سے قیام سوا ہاشم سلمہٗ کے اور کہاں ہو سکتا ہے۔

کسی بڑے سفر کی اب بہ ظاہر کوئی توقع نہیں۔ باندے میاں انور سلمہٗ کی لڑکیوں کی شادی میں دسمبر ۶۸ء میں جا کر اور واپس آکر معاً بعد یعنی ۲؍جنوری ۶۹ء کو اپنی رفیق حیات اور بوڑھی محبوبہ کی نماز جنازہ پڑھانے اور اپنے ہاتھ سے قبر میں اُتارنے۔

نوٹ ہندوستانی اکاڈمی یوپی کے جلسوں میں شرکت کے لئے اور اس سے قبل حضرت اکبر الہ آبادی سے الہ آباد جانے کا بھی بار بار اتفاق ہوتا رہا اور اعظم گڑھ کے سفر دارالمصنفین کے جلسوں کے سلسلہ میں سال میں دو ایک بار عموماً ہوتے رہے، آخری علالت کے زمانہ میں بھی ایک بار جلسہ میں شرکت کے لئے وہاں کا سفر کیا تھا (حکیم عبدالقوی)

باب (۴۲)

صحّتِ جسمانی

بچپن میں سنتا ہوں کہ خوب تندرست تھا۔ اپنے والدین کی آخری اولاد تھا، قویٰ والدین میں سے دونوں کے اچھے تھے، بچپن میں اپنی کوئی ایسی سخت بیماری یاد نہیں پڑتی۔ جب سنِ شعور کو پہونچنے لگا اور پہونچا تو کسی قسم کی ورزش سے گویا تعلق ہی نہ رکھا، کرکٹ، فٹ بال، ٹینس یہ تینوں کھیل اسکول میں کھیلے ضرور، اور فٹ بال ذرا زیادہ کھیلا۔ لیکن انھیں ہمیشہ کھیل ہی یا دل بہلاؤ سمجھا۔ ان کا ورزشی پہلو کبھی دھیان ہی میں نہ آیا۔ ڈرل اور تھوڑی بہت جمناسٹک بھی ذریعہ تفریح ہی بنی رہتی۔ "لانگ جمپ" (لمبی پھندائی) کی بھی کچھ مشق کی، مگر وہ ہی چند روز۔ والد مرحوم نے گھوڑے کی سواری کی بھی مشق کرانا چاہی، مگر گھوڑا اول تو وہی ٹٹو کے قد یا بچکانہ سائز کا زیر ران رہا۔ دوسرے اسے بھی خوب دوڑا کر چلانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ غرض تربیت جسمانی کے باب میں بڑی کمی رہ گئی۔ کھانے پینے اور دوسرے معمولات کے باب میں کوئی خاص احتیاط ملحوظ نہ رہی۔ ہاں دوسری طرف بدپرہیزیاں اور بے احتیاطیاں بھی کچھ بہت زیادہ نہ رہیں۔ اتنا یاد ہے کہ جب میں گیارہ، بارہ سال کا ہوا، تو برسات کے موسم میں ملیریا کی شکایت اکثر رہنے لگی اور قبض و زکام کی بھی گویا عادت سی پڑ گئی ـــــ شروع زندگی میں

ہمہ وقتی اور ہمہ جہتی نگرانی کرنے والا اور بے احتیاطیوں پر روک ٹوک کرنے والا کون کس کو ملتا ہے، اور اس طرح بیماریاں آہستہ آہستہ جڑ پکڑ لیتی ہیں۔ خوب یاد ہے کہ ایک بار دوپہر کے وقت کرکیٹ خوب کھیلا اور جب قدرۃً اس دوڑ دھوپ سے تیز پیاس لگی تو بغیر دم لئے معاً بہت سا پانی غٹا غٹ پی گیا، حلق میں خراش اور ورم پیدا ہو گیا ـــــ بچپنا بھی کیا چیز ہوتی ہے؟ اس وقت یہ خراش، ورم اور درد سب ایک کھیل تماشہ نظر آیا!

ملیریا کے سالانہ حملہ کا سلسلہ کئی سال بعد تک جاری رہا۔ بی، اے کے پہلے سال تک، فٹ بال وغیرہ کی عادت اب اور بھی چھوٹ چکی تھی، اور پیدل ہوا خوری کی مشق کبھی چند ہفتوں سے زیادہ نہ چلی۔ کھانے پینے کا معیار بجائے صحت بخشی کے، محض اس کا ذائقہ سمجھا۔ نقصان اور خرابی کا نزلہ سب سے زیادہ آنکھوں پر گرا۔ آنکھیں کمزور پہلے ہی سے تھیں، مسلسل بد احتیاطیوں سے کمزور تر ہو گئیں، کم روشنی میں پڑھنا، لیٹ کر پڑھنا، کتاب بہت قریب سے پڑھنا، لیمپ بالکل آنکھوں کے سامنے رکھ کر پڑھنا وغیرہ وغیرہ، آنکھوں کی دور بینی بالکل جاتی رہی۔ دوربین عینک کی عادت عمر کے ۱۵ ویں سال سے پڑ گئی بے احتیاطیاں جاری رہیں۔ ۱۹۲۹ء سے جب سن کل ۳۷ سال کا تھا، رات میں مطالعہ قطعاً چھوڑ دینا پڑا! اب ۱۹۶۷ء میں کہنا چاہیئے کہ آنکھیں بڑی حد تک جواب دے چکی ہیں۔ پانی دونوں آنکھوں میں آ رہا ہے، اور دھڑکا ہر وقت لگا ہوا ہے کہ دیکھتے دیکھتے کامل بینائی کس وقت رخصت ہو جاتی ہے اور پھر آپریشن کا نتیجہ بھی دیکھئے کیا نکلتا ہے۔ اللھم احفظنا بول کر لکھنے لکھانے کی عادت ذرا بھی نہیں، خط رفتہ رفتہ اتنا چوپٹ ہو گیا ہے کہ اپنا لکھا آپ نہیں پڑھ پاتا ہوں، اور لکھتا جو کچھ بھی ہوں زیادہ تر

محض اٹکل سے۔ حروف دیکھ کہاں پاتا ہوں۔

آنکھ کے بعد ہی بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر نمبر دانتوں کا آتا ہے، اکّا دکّا گرنا ۳۵ یا ۳۷ سال کی عمر سے شروع ہو گئے تھے، یہاں تک کہ اب کئی سال سے مُنہ دانتوں سے بالکل خالی ہو گیا ہے، لیکن بحمداللہ کھانے پینے میں ایسی دقّت نہیں ہوتی جیسی کہ پہلے سمجھتا تھا دانتوں کی خرابی کی ذمّہ داری بھی اپنی ہی غفلت و حماقت پر ہے، جوانی بھر مسواک کرنا یا خوب کلیاں کر کے مُنہ صاف کرنا جانا ہی نہیں، مدتوں رات کو پان مُنہ میں لے کر سونے کی عادت ڈال رکھی تھی ——— شریعت نے روح کے بعد جسم کا بھی خیال کسی درجہ میں ضرور رکھا ہے، اور اس نے جو مسواک، اور دانتوں کی صفائی کی تاکید اس درجہ رکھی ہے، یہ اب آخر اس سن میں کُھلا کہ بے معنی نہیں۔

بال ۲۵ سال کے سن میں سفید ہونا شروع ہو گئے تھے، اور اس میں بھی بڑا دخل اپنی اس حماقت کو تھا کہ فیشن پرستی کی رَو میں انگریزی تیل بازار کے بنے ہوئے طرح طرح کے سر میں چپڑنا شروع کر دیئے تھے، اور پھر تو سن قدرتاً سفید روئی کا آگیا، اب ۶۷ء بالوں کی حد تک بگلے کا پَر بن گیا ہوں۔ اور سر، داڑھی، مونچھوں میں شاید خوردبین ہی کی مدد سے کوئی بال سیاہ دکھائی دے۔ بھنویں تک سفید ہو چلی ہیں۔

تمباکو سے قطعاً محترز رہا، پان بعض بعض زمانے میں بہت کھائے، خصوصاً شادی کے معاً بعد ان کی ایک خیالی لذت دوستوں نے دل میں خواہ مخواہ بٹھادی تھی، چائے کی لت فیشن پرستی کی بنا پر ۱۴ء سے اپنے ہاتھوں لگالی۔ رفتہ رفتہ اس میں اتنی زیادتی کی کہ دن رات میں بارہ، چودہ پیالیوں کی نوبت آگئی۔ خیر کئی سال بعد ہوش آیا۔ اور اب معمول ۵ پیالیوں کا رکھا ہے، ۲ صبح کو اور دو سہ پہر کو، اور وہ بھی گھری

کے بجائے بالکل ہلکی۔

جوانی بھر صحت عموماً خراب ہی رہی، نزلہ زکام کے ڈر سے ٹھنڈا پانی مدتوں نہیں پیا، اور معمولی پانی بھی ناک بند کرکے پیا۔ چند سخت بیماریاں بھی یاد ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں حیدرآباد میں تھا کہ APPENDICITIES (ورم امعائے معدہ) میں مبتلا ہوکر بہت ہی زائد تکلیف اٹھائی۔ ایک طبیب حاذق حکیم امتیاز الدین تھے، ان کی مسیحائی نے آپریشن سے بچالیا۔ ۱۹۲۸ء میں تپ میعادی میں بھی ایسی ہی تکلیف اٹھائی۔ اس کے بعد بھی تین مرتبہ تپ شدید (نزلاوی و محرقہ) میں مبتلا ہوا ہوں، علاج عموماً یونانی پسند کرتا ہوں لیکن ضرورت پڑجانے پر صاحب فہم، ڈاکٹر اور ہومیوپیتھ کے بھی علاج سے انکار نہیں، کئی کئی طبیب یونانی اور ایلوپیتھ و ہومیوپیتھ ایسے ہوئے ہیں جن کے علاج کے بڑے خوشگوار تجربے رکھتا ہوں۔ سب کے نام گنانے سے اب کچھ حاصل نہیں۔ یوں بھی مرکب دوائیں (معجون ماء اللحم، مربے، شربت) وغیرہ ہمدرد (دہلی) اور دارالشفائے مصطفائی (میرٹھ) کے اکثر استعمال کرتا رہتا ہوں۔

۱۹۳۴ء میں جب عمر کے ۴۲ ویں سال میں تھا، اور انگریزی تفسیر کا کام شروع ہوئے ڈیڑھ سال گزر چکا تھا، صحت بہت زیادہ گر گئی اور اثر قلب تک پہنچ گیا، علاج بہتیرے کیے، نفع خاطر خواہ نہ ہوا، لکھنؤ میں ایک دُور کے رشتہ کے ماموں، مولوی حاجی محمد نسیم صاحب دیوانی کے نامور ایڈوکیٹ تھے، اور بڑے مذہبی آدمی۔ ایک روز میری عیادت کو آئے اور بڑے اخلاص کے انداز میں مجھے نصیحت کی کہ سرے سے ورزش نہ کرنا اور صحت کی طرف سے غفلت برتنا، تو خودکشی ہی کی ایک قسم ہے اور خودکشی لاکھ تدریجی ہو، بہرحال معصیت ہے۔ میں ان کی مخلصانہ موعظت سے متاثر ہوا، اور انھوں

نے مجھے عہد لیا تھا کہ آئندہ سے ورزش کرتا رہوں گا، چنانچہ صبح پیدل ہواخوری قبل فجر تین، چار میل کی شروع کردی، اور اسی میں کچھ دُور دوڑ، اور اچک پھاند بھی اسی میں شریک و مشیر ایک نادان مخلص اور رہے، کسی قسم کی احتیاط لنگوٹ بندی وغیرہ کی نہ کی، قدرۃً نقصان ہوا اور عظم اُنثیین پیدا ہوگیا، جب نقصان بیّن محسوس ہولیا، جب جاکر اصلاح حاصل کی، مگر جتنا نقصان ہوچکا تھا، اس کی تلافی کی کوئی صورت نہ تھی۔

صبح کی ہواخوری اس کے بعد بھی عرصہ تک جاری رہی، رفتہ رفتہ گھٹ کر میل سوا میل کی رہ گئی، اب وہ بھی نہیں بن پڑتی۔ اگست ۶۷ء میں ناغے اس کثرت سے ہو رہے ہیں کہ کہنا چاہیے کہ معمول ترک ہی ہوگیا ہے، بس کسی ہی کسی دن نکلنا ہوتا ہے، بس خلوت ے معدہ کے وقت، قبل فجر، یا دوپہر میں قبل ظہر، البتہ ڈھائی ڈھائی سو بار ہاتھ، خالی مگدر کی طرح ہلا لیتا ہوں۔ اس سے اوپر کے پٹھوں کی ورزش کچھ تھوڑی بہت ہو جاتی ہے۔

معمولات یہ رہتے ہیں:۔

صبح سویرے ہلکی چائے کی بڑی مقدار، اور ناشتہ (انڈا، بسکٹ، مکھن، پنیر، توس، ادل بدل کر)

بعد ظہر کوئی ۱/۲ ۲ پھر ہلکی چائے، موسمی پھل، آم، خربوزہ، کھجور وغیرہ کے ساتھ کبھی بھنا پسا ہوا چنا، گرمیوں میں شربت ستو وغیرہ۔ بعد مغرب، کھانا، عموماً، گوشت، دال، ترکاری یا ساگ، بہ طور چٹنی پیاز، ادرک مستقل طور پر۔

ہاں لکھنؤ کے حکیم ڈاکٹر عبدالعلی ندوی مرحوم نے شب میں دو تولہ چنا بھگو کر صبح اس کا زلال شہد کے ساتھ پینے کو بتایا تھا، اس پر بھی عمل ہے۔ جاڑے میں دو تین ہفتہ مار اللحم بھی استعمال میں رہتا ہے۔

عام صحت، معدہ وغیرہ کی اب کئی سال سے (یعنی جوانی کے بعد سے) اچھی رہنے لگی ہے، کھاتا رغبت سے ہوں، مسلمانوں کی پُرتکلف غذائیں پلاؤ، بریانی وغیرہ دل سے پسند ہیں، لیکن روزافزوں گرانی مدت سے اس شوق کی راہ میں حائل ہوگئی ہے۔ کھانے کا شوقین ہوں اور خوراک کی مقدار بھی اچھی خاصی ہے۔ لیکن بحمداللہ حریص کسی مرغوب ترین ولذیذ ترین کھانے کا بھی نہیں، یعنی ایسا کہ وہ جس قیمت کا بھی ملے اور صحت کا جو حال بھی ہو، اس پر ٹوٹ پڑوں، اپنی جیب کا خیال بحمداللہ ہر حال میں رہتا ہے۔

باب (۴۳)

عام معیشت

لباس لڑکپن بھر وہی رہا، جو اودھ کے متوسط الحال شریف گھرانوں میں رائج تھا۔ مہین کرتا، یا قمیص پاجامہ (گرمیوں میں کبھی ڈھیلے پائنچوں کا غرارہ دار) اوپر اچکن یا شیروانی، جاڑوں میں بنیائن، مرزئی، شلوکا، سوئٹر، اورکوٹ، یا چسٹر، ٹوپی گرمیوں میں دوپلّی، سردی میں اونی کشتی نما یا گول (فیلٹ) کالج میں آیا تو شوق کوٹ پتلون کا ہوا، اور کچھ دن پہنا بھی، مگر کوٹ بند گلے کا، بغیر کالر اور ٹائی کے۔ والد مرحوم کو یہ شوق پسند نہ تھا۔ ان کا خوف خود ایک رُکاوٹ بنی رہی۔ گریجویٹ ہو جانے اور والد مرحوم کے انتقال کے بعد انگریزیت اور بڑھی اور اب باقاعدہ سوٹ (کالر اور ٹائی کے ساتھ) پہننے لگا، اور کبھی کبھی انگریزی ٹوپی بھی لگائی، مگر ہیٹ نہیں بلکہ شام کی فیلٹ ہیٹ، سفید رنگ کی۔ اس زمانہ میں اسی کا فیشن تھا، پوشش سے بڑھ کر شوق نمائش کا تھا، یعنی پہننے کا اتنا نہیں، جتنا لوگوں کو دکھانے کا!

جون سنہ ۱۶ء میں شادی ہوئی، اس کے بعد مشرقی بلکہ لکھنوی قسم کی شوقینی کا دَور ہوا۔ بال بنے ہوئے خوشبودار تیل میں ڈوبے ہوئے، کپڑے عطر میں بسے

ہوتے، ریشمی قمیص، ریشمی شیروانی، ٹوپی سر پر ترچھی رکھی ہوئی، پاجامہ چوڑیاں پڑا ہوا وغیرہ۔

یہ خوش لباسی کا شوق دو ہی تین سال بعد ہند و فلسفہ و تصوّف کی نذر ہو گیا۔ راہبانہ جوگ کے مطالعہ نے اس کے لئے کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی ۱۹۲۱ء آیا تو گاندھی کی تحریک سادگی و کھدر پوشی کی شروع ہوئی، ایک طرف اس تحریک کا اثر، تو دوسری طرف کھدر پوش اور اسیر فرنگ محمد علی کی ذات کے ساتھ والہانہ عقیدت چارپائی پر لیٹنا اسی دن سے ترک کر دیا اور ساتھ ہی کھدر بھی پہن لیا، پھر کھدر بھی کیسے موٹے اور کھردرے قسم کا، اعزہ و احباب ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے، اور ایک عرصہ تک صرف لمبے کرتے پر قناعت رکھی، پھر رنگین کھدر کی عبا شروع کر دی، اور سر پہ گول اور اونچی کھدری ٹوپی، نیچی کشتی نما گاندھی کیپ سے ممتاز کرنے والی، محمد علی کیپ' پیر میں بجائے جوتے کے چپل اور گلے میں ایک لمبا سا کپڑا بطور گلو بند یا انگوچھے کے۔ اور جاڑوں میں روئی دار مرزئی یا لبادہ اس وقت سے مستقل لباس ہو گیا۔ خفیف سی ترمیم کے ساتھ۔ نقدی ساری کی ساری واسکٹ کی وسیع جیبوں میں ہی رہتی ہے اس کے لئے کوئی الماری یا بکس وغیرہ نہیں۔ ضرورت سے جہاں زائد ہوئی فوراً بنک میں منتقل کر دیتا ہوں۔ اور بنک میں حساب چلتو کھاتے (کرنٹ اکاؤنٹ) میں رکھتا ہوں کہ سود کا سوال ہی نہ پیدا ہو۔ لوگ شروع شروع میں اس وضع قطع پر ہنسے، رفتہ رفتہ یہی دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ اور خیر اُس وقت تو بہت سے دکھائی دیتے تھے، البتہ ۱۹۶۷ء میں تو کیا، ۳۰، ۳۲ سال، ادھر سے کسی کو بھی اس وضع قطع میں نہیں دیکھتا ہوں، بالکل منفرد رہ گیا ہوں۔

خوش لباسی سے اب قطعی بیزاری ہوگئی ہے، موٹے پرانے، پیوند لگے ہوئے کپڑوں سے کوئی شرم نہیں آتی، سفر و حضر، دعوتوں، پارٹیوں، سب میں یہی ہیولا قائم رہتا ہے، گو بیوی بچیاں کبھی کبھی اس پر منہ بناتی رہتی ہیں ـــــ گرمی ہی کی طرح سردی کا بھی موسمی اثر بحمداللہ بہت زیادہ محسوس نہیں کرتا ہوں، معمولی کمبل، رزائی، یا ہلکا سا لحاف کافی ہوتا ہے۔

اچھے کھانے کا شوق اب بھی قائم ہے، گو بحمداللہ قابو ایک حد تک اس شوق پر بھی رکھتا ہوں، پلاؤ و بریانی، قورمہ، شامی کباب، مُرغ، مچھلی، انڈا، فیرینی، بالائی مکھن پنیر سب ہی لذیذ، نمکین و میٹھے کھانوں کا شوق رکھتا ہوں۔ علیٰ ہذا، آم، خربوزہ، انار، سیب، کھجور، انناس، پھلوں، حلووں، مربوں کا لیکن بحمداللہ عام غذا دال، سالن، خشکہ یا چپاتی ہی کی رہتی ہے اور اپنی حیثیت اور اپنی جیب پر نظر ہر وقت رہتی ہے ترکاریوں میں شلجم، لوکی، گاجر، اور ساگوں کو محبوب رکھتا ہوں۔ بڑی رغبت خمیری روٹی سے ہے، جس زمانہ میں خرچ کی تنگی ہوتی ہے غذا کا معیار اور بھی سادا اور ہلکا کر دیتا ہوں۔ اور نوبت قرضوں کی نہیں آنے پاتی ـــــ کچھ دنوں مجاہدہ کر کے غذا کی تقلیل اور سادگی دونوں بہت بڑھا دی تھیں اور صرف بھنے ہوئے چنے اور اُبلی ہوئی ترکاری پر بسر کرنے لگا تھا

مکان اور سواری میں بھی راحت، آسائش، کشادگی برابر پیش نظر رہتی ہے۔ گو بحمداللہ آرائش و نمائش سے برابر بچا رہتا ہوں۔ دریاباد کا مکان پہلے ہی سے وسیع و آرام دہ تھا اس میں بھی بہت کچھ اضافہ اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے کر دیا، اور کتابوں کے لئے الماریاں بھی خدا معلوم کتنی بنوالیں۔ لکھنؤ کے مکان کی صورت یہ ہوئی کہ ۱۳ء

میں ہم لوگ کرایہ کے مکان میں رہ رہے تھے کہ ایک بیوہ لاولد خوش حال حقیقی خالہ زاد بہن نے (جو رضاعی خالہ بھی ہوتی ہیں) ایک بڑی وسیع حویلی خریدی، لیکن تنہا اس لق و دق مکان میں ان سے رہتے نہ بن پڑا۔ ہم لوگوں کو اصرار شدید کر کے اپنے مکان میں اٹھا لائیں، اور اس کا ایک معقول حصہ ہم لوگوں کے لئے مخصوص کر دیا، ۲۵، ۳۰ بعد جب ان کا انتقال ہو گیا، مکان (موسومۂ خاتون منزل) ان کے حقیقی بھائی کے قبضہ میں آیا۔ مالی دقتیں انھیں اسی وقت سے شروع ہوئیں یہاں تک کہ جب ان کا بھی انتقال ۱۹۴۴ء میں ہو لیا اور مکان کی ملکیت ان کے لڑکے قدیر الزماں سلمہٗ کی طرف منتقل ہوئی، تو چند ہی سال کے اندر زمین داری قانونًا ختم ہو گئی اور قدیر سلمہٗ کا ذریعہ معاش ہی کہنا چاہیئے بند ہو گیا۔ اب مجبورًا اسی لق و دق حویلی کے ٹکڑے ٹکڑے فروخت کرنے پڑے، یہ بھی خرچ کے لئے کب تک کافی ہوتے۔ رفتہ رفتہ نوبت صدر عمارت کی آنے لگی، ایسے حال میں جولائی ۱۹۶۶ء میں ۱۷ ہزار میں حویلی کا ایک معقول حصہ میں نے خرید لیا اور اسے بیوی کے نام پھر بیوی نے لڑکیوں کے نام ہبہ کر دیا۔ یہ خطۂ مکان بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور ماشاء اللہ نواسوں، نواسیوں کی موجودہ تعداد کے لحاظ سے بہت تنگ اور ناکافی ہے لیکن سر دست اس سے بڑے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اس وقت اگست ۱۹۶۷ء تک ہم لوگ خاتون منزل کے اپنے اسی قدیم حصہ پر قابض ہیں، لیکن اب خدا معلوم کس وقت اسے چھوڑ کر اُس نو خرید مکان میں منتقل ہو جانا پڑے۔ قیام اس وقت جولائی ۱۹۶۷ء تک بدستور اسی قدیم مکان میں ہے، اور نو خرید مکان کا حصہ اب تک بالکل ادھ بنا پڑا ہے۔ اور ہزاروں روپیہ لگ جانے کے بعد بھی کوئی امید تکمیل کی نہیں ہے۔

میرا اپنا مستقل قیام دریاباد میں رہتا ہے لیکن سال میں دو تین مہینے تو باقساط لکھنؤ ہی میں گزرتے ہیں، اور بیوی اور بچیوں کے قیام کا بڑا زمانہ لکھنؤ ہی میں گزرتا ہے ـــــ کسی ایک لڑکی کا قیام میرے ساتھ لازمی ہے، گھر کے انتظامات زیادہ تر اسی کے سر رہتے ہیں، بیوی سے جذباتی تعلق تو اب تک جوں کا توں ہے، لیکن عملی، انتظامی حصہ ان سے متعلق بہت کم رہ گیا ہے۔

مکان ہی کا ضمیمہ مکان کا فرنیچر بھی ہے، پلنگ، تخت، میز، کرسی، دری، قالین وغیرہ، ضرورت بھر کی ہمیشہ رکھتا ہوں، آرایش ونمایش سے یہاں بھی گریز ہے۔ کرسیاں تعداد میں کافی ہوں لیکن یہ نہیں کہ بیش قیمت اور فیشن کے بالکل مطابق ہوں اور یہی حال کھانے کے برتنوں کا ہے، تعداد میں کافی ہوں اور جالی دار سرپوش اور ڈھکنے بھی ہوں تاکہ مکھیوں سے امن رہے، لیکن یہ ہرگز نہیں، میز ڈائننگ روم کے مطابق ہو، یا برتن ڈنر سٹ کے ہوں۔ آرائش وآسائش کے درمیان بنیادی فرق، زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح یہاں بھی ملحوظ رہتا ہے۔

والد مرحوم کی زندگی تک ۱۹۱۲ء گاڑی، گھوڑا موجود رہا ۱۸ء میں جب حیدرآباد جا کر رہا تو وہاں بھی چھوٹی لینڈو رکھی، دریاباد آکر رہتا ہوا تو کچھ روز بعد یہاں بھی تانگہ، گھوڑا عرصہ تک رکھا۔ جب گرانی کے مصارف ناقابل برداشت ہو گئے، تو علٰحدہ کر دیا۔

بچپن سے گھر میں نوکروں چاکروں کی ایک پوری پلٹن دیکھی تھی، باہر بھی اور اندر بھی۔ رفتہ رفتہ کچھ تو زمانے کے اقتضا سے اور کچھ اس لئے بھی کہ خود اپنے ہاں

خوش حالی نہیں رہی تھی، اس تعداد میں بہت کمی ہوتی گئی۔ تا آں کہ اب بالکل گنی چنی تعداد رہ گئی ہے، نوکر چاکر اگر محض اجیر ہوں، یعنی باہر کے ہوں تو ان کی محنت کا معاوضہ محض نقد و جنس انھیں دے دینا ہو تو معاملہ پھر بھی غنیمت ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بڑی تعداد خانہ زادوں کی، یعنی گھر کے پروردوں کی تھی، یعنی جن کی نانیاں، دادیاں، نانا، دادا بھی ہمارے ہاں کے تھے، بلکہ بعض کی مائیں اور بہنیں تو ہم ہی لوگوں کی رضاعی مائیں اور بہنیں تھیں، ایسوں کے حق و حقوق عام خدمت گاروں سے دس گنے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ ان کے حقوق پورے تو خیر کیا ادا ہوتے، اس کا چوتھائی بھی اگر ہوئے ہیں تو بھی بڑی بات ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ، مار پیٹ، گالم گلوج کی عادتیں پشتوں سے پڑی چلی آ رہی ہیں، انھیں یک لخت کیسے چھوڑ دیا جائے، خصوصاً جب کہ ادھر سے بھی غفلت، کام چوری، بدخواہی، بلکہ خیانت کے بھی تجربے بار بار ہوتے رہیں۔

بہ حیثیت مجموعی معاشرت ایسی ہے، جیسے قصبات میں اوسط درجہ کے زمینداروں کی ہوتی ہے، اور زمین داری ختم ہو جانے کے بعد بھی نیم رئیسانہ حیثیت عرفی وہی قائم ہے۔ لکھنؤ جب جاتا ہوں تو متوسط درجہ کی خوش حالی کے ساتھ رہتا ہوں۔ لڑائی، جھگڑا، فساد، مقدمہ بازی ہماری معاشرت کا، کیا قصباتی اور کیا شہری ایک لازمی جزو بن گئی ہے، اللہ نے اس لعنت سے محفوظ رکھا، برادری والوں، بستی والوں سب سے سلامت روی کے ساتھ گزر رہی ہے یہاں تک کہ غیر مسلم ہم وطنوں سے بھی۔ اور یہ صلح و سازگاری کی فضا، اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

باب (۴۴)

چند مخصوص عادات و معمولات

کچھ مخصوص عادتیں اور معمولات ہر ایک کے ہوتے ہیں، اپنی چند ایسی چیزیں قلم بند کیے دیتا ہوں۔

اپنی صورت اکثر لوگوں کو اچھی ہی لگتی ہے، اس لئے آئینہ بھی خوب دیکھے جاتے ہیں، اپنا حال اس کے بالکل برعکس ہے، اپنی صورت بدترین سمجھتا ہوں، اسی لئے آئینہ کبھی نہیں دیکھتا ہوں، کہیں ریل کے سفر میں یا راستہ گلی میں گزرتے ہوئے کوئی بڑا آئینہ اتفاقاً سامنے پڑ جائے تو بات دوسری ہے۔ اپنی بے ہنگم داڑھی چہرے پر پھیلی ہوئی اور بھی وحشت افزا ہے لیکن اپنی صورت کی ناپسندیدگی داڑھی رکھنے کے دور سے قبل کی ہے، اس کے بعد قدرۃً اپنی تصویر کھچوانا ہمیشہ ناپسند کرتا ہوں، شرعی پہلو سے قطع نظر طبعی طور پر بھی، اور جب کبھی پاسپورٹ وغیرہ کی ضرورت سے کھچوانا پڑی تو بڑی ہی کوفت محسوس کی، باقی جلسوں، پارٹیوں وغیرہ میں تو تصویر کبھی کبھی کھنچ ہی آتی ہے، یا دو ایک تصویریں عین جوانی کے زمانہ کی، یعنی شادی کے وقت کی ہیں، اور ایک آدھ اس سے بھی قبل یعنی اسکولی زمانہ کی۔

کپڑے کا شوق (باب معیشت میں لکھ چکا ہوں) اب بالکل نہیں رکھتا کھانے

کا شوقین اب بھی ہوں، مٹھائی سے رغبت پہلے بہت زیادہ تھی، اب بھی ہے، عورت سے بھی طبعی شوق رکھتا تھا، قوت کا گھٹنا تو تقاضائے عمر سے ایک امر طبعی ہے باقی اصل قابو اس پر جب سے آیا، جب سے از سر نو مسلمان ہوا، ستمبر ۱۹ء میں جب سن ۲۷ سال کا تھا، کوچہ فسق میں قدم رکھنے کی آخری تاریخ تھی، اصل اور موثر علاج ہر بدکاری کی طرح اس میں بھی بس خوف خدا ہی ہے۔

پڑھنے کا شوق بھی سرشت میں داخل ہے، وظیفہ وغیرہ زبانی جب جب پڑھے کچھ ہی دیر بعد نیند آنے لگی یا طبیعت اُکتا گئی، گو نیند کتاب دیکھتے دیکھتے بھی آجاتی ہے لیکن کتاب اس حال میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ ذرا سی جھپک کے بعد تازہ دم ہو جاتا ہوں، کتاب جب مل جائے تو پھر پروا کسی سے ملنے جلنے کی نہیں رہتی، عزیزوں قریبوں سے بھی، اب ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ جی لگنے کی باتیں تفسیر و متعلقات قرآن ہی کی ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد نمبر لغت و اثریات کا آتا ہے، اور انگریزی کتابوں میں تاریخ قدیم (مصر، عرب وغیرہ) یا پھر مختلف انسائیکلوپیڈیائیں۔ ایک زمانہ میں خاص موضوع مطالعہ سائیکالوجی تھا۔ اُردو میں رطب و یابس سب ہی پڑھ ڈالتا ہوں۔ قرآن مجید، لغت، تاریخ اور کلام شعرا۔ کالج چھوڑنے پر اُستاد کیمرن نے ایک سرٹیفکٹ میں یہ لکھا تھا کہ "میں اپنے علم میں کسی دوسرے طالب علم کو نہیں دیکھا جس نے ان سے بڑھ کر لائبریری سے کام لیا ہو" ——— کتابوں کے حرص اور ہوکے میں مجھے اپنی مثالیں تو صرف دو ہی نظر آئیں، ایک مولانا سید سلیمان ندوی اور پھر اُن سے اتر بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق۔

ایک زمانہ میں خیال فرنچ زبان سیکھنے کا آیا، مدتوں اس پر وقت صرف کیا

مگر چوں کہ بالکل بلاقاعدہ تھا اس لئے حاصل کچھ بھی نہ ہوا، اس کے کئی سال بعد پھر شوق جرمن زبان سیکھنے کا ہوا (ایک بار اس کی نوبت زمانہ طالب علمی میں بھی آئی تھی) اور دو تین سال کے اندر جرمن پڑھ لینے کی مشق اچھی خاصی حاصل ہوگئی تھی۔ پھر وقت نہ نکال سکا اور وہ مشق سب جاتی رہی۔ فرنچ کا شوق بھی ادھیڑ سن کے شروع میں ہوا تھا اور جرمن کا تو اس کے بھی کئی سال بعد ادھیڑ سن کے آخر میں [۵]۔

اچھے شعر سننے کی جگہ اچھے گانے کا بھی شوق رکھتا ہوں، گو ادھر سالہا سال سے سننے کا اتفاق ہی کہاں ہوا۔ اور کچھ تھوڑی بہت پرکھ بھی۔ البتہ اس شوق کو دبائے ہوئے رکھتا ہوں۔ اچھی آواز کو سن کر کبھی وجد میں آجاتا ہوں اور کبھی رو پڑتا ہوں، قوالی کئی سال تک سنی اور اس زمانہ میں گریہ بہ کثرت ہوا کرتا تھا، خود بھی ترنم سے شعر پڑھ لیا کرتا ہوں، خصوصاً مثنوی وغیرہ۔ پبلک کے سامنے کبھی پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن گھر کے لڑکیوں، لڑکوں کے سامنے بار بار پڑھ چکا ہوں ——— ترک سماع کے لئے بڑا مجاہدہ کرنا پڑا، اب ایک عادت سی پڑ گئی ہے۔

لڑکپن سے جوانی تک تھیٹر بہ کثرت دیکھے، رقص سے کوئی دلچسپی کبھی نہ ہوئی۔ سنیما کئی بار دیکھے، لیکن شوق و رغبت سے کبھی نہیں، اور آخر زمانہ میں تو بڑی ہی کراہت کے ساتھ دیکھتا تھا اور ہر وقت دھڑکا یہ لگا رہتا کہ اگر کہیں اسی عالم میں بلاوا

---

۵ اسی سال کی عمر کے بعد عبرانی زبان سیکھنے کا خیال آیا اور اپنی والی بہت کوشش اس کی ابتدائی کتابیں منگانے کی کی، اسرائیل بار بار خط لکھے جواب نہ ملا۔ بالکل ہی ابتدائی یعنی حرف شناسی کی جو کتاب مل سکی وہ دیکھ لی۔

آگیا تو کیسی گزرے گی، اب اسے بھی چھوڑے ہوئے کوئی پندرہ سال تو ضرور ہی ہو چکے ہوں گے۔

روزے ایک زمانہ میں عاشورہ محرم، عشرہ ذی الحجہ اور پندرہویں شعبان وغیرہ اکثر رکھ لیا کرتا تھا۔ اور اب رمضان ہی کے ہو جاتے ہیں تو یہی بڑی بات ہے، نمازیں الٹی سیدھی کسی طرح پڑھ لیتا ہوں اور جب فرض ہی میں حضور قلب سے سراسر محروم ہوں تو چاشت وغیرہ میں اس کا کیا سوال۔ تہجد میں پوری بارہ رکعتیں تو شاذ و نادر ہی کبھی نصیب ہوئی ہوں گی، بس اللہ میاں جو کچھ بھی اس کا اجر دیں کہ نمازیں جان کر ناغہ نہیں کیں، قرآن مجید کی سورتیں، لڑکپن میں تھوڑی بہت حفظ تھیں جیسی ہر مسلمان گھرانے کے ہر فرد کو ہوتی ہیں، آخر جوانی میں اور بہت سی یاد کرنا چاہیں، خصوصاً آخری پاروں کی، کچھ تو اللہ میاں نے یاد کرادی ہیں اور باقی اپنی بدہمتی سے یوں ہی رہ گئیں، اوراد و وظائف سے طبیعت کو کچھ زیادہ مناسبت نہیں، مواظبت سہل وظیفوں کی بھی نہ ہو سکی، پاس انفاس وغیرہ کے نام ہی سنتا رہا، توفیق اس کی بھی نہ ہوئی کہ کلمہ طیبہ تک ہی کا ورد پابندی سے جاری رکھ سکوں۔ ایک کلمہ اللّٰھم سخّرنی لک کا ورد بھوپال کے بزرگ شاہ محمد یعقوب مجدی سے سُن کر بہت ہی پسند آیا، عادت اگر اس کی پڑ جائے تو بڑی بات ہے۔

اپنی کتابوں پر تبصرے، عام اس سے کہ مخالفانہ ہوں یا مادحانہ پڑھنے کی عادت مدت سے ترک ہے۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ دونوں صورتوں میں اس کا اثر اچھا نہیں پڑتا، مدح سے نفس خوامخواہ خوش ہوتا ہے اور اعتراض سے خوامخواہ ملول۔

ہاں تبصروں، تنقیدوں کا خلاصہ کسی نہ کسی سے سن ضرور لیتا ہوں کہ واقفیت قائم رہے ــــــ آہ، خودبینی وخودنمائی کا وہ زمانہ جب اپنی کتابوں پر مداحانہ ریویو دوسروں سے لکھوایا کرتا تھا اور انھیں چھپا ہوا دیکھ کر کتنا خوش ہوتا تھا۔ اور جب یہ معاملہ کتابوں پر تبصرے ساتھ ہے، تو جو خوش عقیدہ اپنے حسن ظن سے کام لے کر خود مصنّف کی ذات پر مدحیہ خاکے لکھ ڈالتے ہیں، ان کا حکم ظاہر ہی ہے، کبر نفس اور خودپرستی کے قدآدم آئینے!

افطار کے وقت غذا میں تقلیل کرتا ہوں، تاکہ ایک تو تراویح کے وقت تکان نہ ہو، دوسرے سحری کے وقت معدہ میں گنجائش ہو، سحری میں اچھا خاصہ کھا لیتا ہوں، سحری بالکل آخری وقت میں کرتا ہوں کہ اس کے بعد ہی نماز فجر کے لئے اٹھ کھڑا ہوں تراویح گھر ہی پر سنتا ہوں، ایک پارہ روز رکھ کر پورے مہینے میں ختم ہو، سننے والے ۱۰، ۱۵ کی تعداد میں جمع ہو ہی جاتے ہیں ــــــ نماز کی امامت سے بہت گھبراتا ہوں اس کی ایک وجہ ضعف مثانہ ہے، سردی میں علی الخصوص پیشاب بڑی کثرت سے ہوتا ہے اور کبھی کبھی بے اختیار قطرہ نکل پڑتا ہے امامت خوش دلی کے ساتھ صرف نماز جنازہ کی کرلیتا ہوں اور طمع رکھتا ہوں کہ جس طرح مجھے دوسروں کے حق میں دعائے خیر کی توفیق ہو رہی ہے دوسرے مومنین میرے لئے بھی کثرت سے دعائے خیر و استغفار کردیں۔

طبیعت زیادہ ملنے جلنے کی خوگر نہیں، اور عقلاً و تجربتہً بھی زیادہ میل جول میں برائیاں ہی زیادہ نظر آتی ہیں، پھر بھی خشک مزاج نہیں ہوں اور لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملتا ہوں، اور حقیر سے حقیر آدمی سے بھی ملنے اور اس کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے میں

بحمد اللہ کوئی عار نہیں محسوس کرتا ـــــ کوشش میں لگا رہتا ہوں کہ بڑے اور چھوٹے ہر ملنے والے سے کوئی نہ کوئی سبق سیکھوں اور ہوسکے تو اسے بھی کچھ سکھاؤں۔

بہت چھوٹے بچوں، یعنی شیر خواروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، جب بچہ تین چار سال کا ہولیتا ہے اور کچھ بولنے اور چلنے لگتا ہے جب دلچسپی شروع ہوتی ہے لڑکیوں سے مانوس بہت جلد ہو جاتا ہوں، عموماً لڑکے جب ذرا اور بڑے ہولیتے ہیں تو ان سے بے تکلف ہوکر اور خوب کھل کر بات چیت کرنا پسند کرتا ہوں اور ان کی آئندہ فلاح و اصلاح کے لئے ہر طرح کی باتیں، ان کا بے تکلف دوست بن کر ان کے کان میں ڈالتا رہتا ہوں۔

زبانی بحث و مباحثہ سے بہت گھبراتا ہوں، اس کی ایک وجہ تو طبعی شرمیلا پن ہے، زبان بے دھڑک کھلتی نہیں ہے، دوسرے اپنی اشتعال پذیری سے بھی ڈرتا رہتا ہوں، معلوم نہیں غصہ میں کیا کچھ زبان سے نکل جائے ـــــ غصہ کی بات آگئی تو سن لیجئے کہ خلقتہً میں بڑا غصہ ور تھا اور اس وقت بجائے اس کے کہ کوئی مخلص ملامت یا نصیحت کرتا، الٹی اس کی داد ملتی تھی اور ذکر تحسین سے کیا جاتا، اب بھی غصہ ور ہوں تو اللہ کے فضل سے اور حضرت تھانوی کے فیض صحبت سے اس کی کیفیت اور کمیت دونوں میں بہت کمی آگئی ہے، پھر بھی خدا معلوم کیا کیا کر گزرا ہوں، خصوصاً نوکروں، چاکروں کے معاملہ میں، ناظرین سے استدعا ہے کہ جب اس مقام پر پہنچیں تو از راہ لطف و کرم میرے حق میں استغفار ضرور کریں، مجھے اپنے لئے ڈر سب سے زیادہ اسی پہلو سے معلوم ہوتا ہے۔

مزاج میں ایک طرف بخل بھی ہے اور دوسری طرف اسراف بھی، اللہ دونوں

بلاؤں سے نجات دے۔

غصہ ور ہونے کے ساتھ ایک زمانے میں بڑا ہنسوڑ بھی تھا۔ اب نہ ہنسی بہت زیادہ آتی ہے اور نہ کسی بات پر دل ہی بہت زیادہ خوش ہوتا ہے۔ کھانے پینے کے اوقات و معمولات پہلے کسی باب میں لکھ آیا ہوں۔ دریاباد میں کسی کے گھر جا کر کھانا بہت کم کھاتا ہوں، لوگ عام طور پر یہیں کھانا بھیج دیتے ہیں۔ میں جا کر صرف حاضری دے آتا ہوں۔ گھر پر بھی کھانا عموماً تنہا کھاتا ہوں، سہ پہر کو مغرب سے کوئی پون گھنٹہ قبل باہر برآمدہ میں نکل آتا ہوں، یہ وقت ملاقات کا عام ہوتا ہے۔ زیادہ لوگ تو آتے نہیں، بس دو چار آجاتے ہیں، باتیں بھی کرتا جاتا ہوں اور اخبار بھی پڑھتا جاتا ہوں۔ اخباری ڈاک بڑی ہی کثرت سے آتی ہے سب کہاں تک دیکھ سکتا ہوں، چند مخصوص روزنامے، ماہ نامے پڑھ لیتا ہوں، باقی یوں ہی بے پڑھے رہ جاتے ہیں، رسالے کسی نہ کسی کو دے دیتا ہوں۔ اخبارات ردّی میں چلے جاتے ہیں، گو ردی کا فروخت کرنا دل پر بڑا بار رہتا ہے۔

کسی کی جائز سعی و سفارش میں دریغ نہیں کرتا، گو حتی الامکان اس کا لحاظ رکھ لیتا ہوں کہ جس کے نام سفارش نامہ جا رہا ہے، خود اس پر بھی بار نہ پڑے۔ اپنے ذاتی معاملات میں بھی اسی دنیا میں رہ کر اس میں پوری طرح پڑ کر اور گھیر کر، دوسروں کے بارِ احسان سے کامل سبک دوشی ممکن کیوں کر ہے۔ بس اس کا اہتمام رکھ لیتا ہوں کہ جس کسی کو لکھوں بھی تو زیادہ سے زیادہ اپنی خودداری اور مخاطب کے رکھ رکھاؤ دونوں کا لحاظ رکھ کر۔

باب (۴۵)

مؤثر، محسن، عزیز شخصیتیں

بچپن سے اب تک اپنی سیرت و کردار پر اثر انداز چھوٹی بڑی جتنی بھی شخصیتیں ہوئی ہیں سب گو گنانے پر آؤں تو خود ایک کتاب تیار ہو جائے، اس لمبی فہرست کو چھوڑ کر ذکر صرف انھیں کا کروں گا، جن کا اثر پائدار اور نمایاں رہا ہے۔ یہ فہرست بھی اچھی خاصی طویل ہوگی ـــــ موثر ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ شخصیت کسی معنی میں بڑی بھی ہو، اپنی تاثر پذیر طبیعت نے بعض دفعہ بہت ہی حقیر شخصیتوں کا بھی اثر قبول کیا ہے۔

گھریلو زندگی میں ماں باپ اور بڑے بھائی، ابتدائی مولوی یا ماسٹر اور بچپن کی دائی کھلائی کا اثر پڑنا بالکل قدرتی تھا ان کا اور رشتے کے دوسرے بھائیوں وعزیزوں کا تذکرہ شروع کے ابواب (باب۲ دوتا باب۵) میں آچکا ہے۔ بعض ماسٹروں اور استادوں کا ذکر بھی شروع ہی کے بابوں میں آچکا ہے۔ اپنی ابتدائی قلمی زندگی میں بھی قلب و دماغ جن جن سے متاثر ہوا ان کا بھی ذکر اپنے اپنے موقع پر گزر چکا ہے۔

مستقل طور پر ادبی، عملی زندگی پر اثر ڈالنے والوں کے نام اگر گنانا چاہوں تو ذیل کے نام تو بہر حال لینے پڑیں گے۔

(۱) محض زبان کی حد تک، مرزا محمد ہادی رسوا، رتن ناتھ سرشار، ریاض خیر آبادی

اور کسی درجہ میں ابوالکلام آزاد، اور محمد حسین آزاد، اور خواجہ حسن نظامی۔

(۲) ادبی و معنوی حیثیتوں سے مولانا شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد دہلوی، سر سید احمد خان اور کسی درجہ میں خواجہ غلام الثقلین اور راشد الخیری۔

دورِ الحاد میں میرے گرد سب سے بڑے یہ رہے ہیں۔ جان اسٹورٹ مل، ہربرٹ اسپنسر، ٹامس ہنری ہکسلے، اور دورِ الحاد کے باہر، الگزنڈر بین (BIN) اور سب سے بڑھ کر امریکا کا پروفیسر ولیم جیمس۔

الحاد اور از سر نو اسلام کے عبوری دور میں بڑی رہ نمائی ان سے ملتی رہی:۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی، مولانا محمد علی، مولوی محمد علی ایم اے لاہوری (امیر جماعت احمدیہ لاہور) ڈاکٹر بھگوان داس (بنارس) مسز اینی بسنٹ، گاندھی جی، اور کسی درجہ میں ٹیگور، تلک اور آربندو گھوش۔

روحانی عقیدت چند سال تک ان لوگوں سے زور کے ساتھ رہی۔ مولوی عبدالاحد کسمنڈوی، مولوی عابد حسین فتح پوری، اور مولانا حسین احمد مدنی (ان سے تو باضابطہ بیعت بھی کرلی) اور کسی درجہ میں حضرت اقبال اور مولوی حاجی محمد شفیع بجنوری (متوفی اکتوبر ۱۹۵۱ء ۸ ذی الحجہ ۷۰ھ بہ مقام مکہ معظمہ)

کالج کے ساتھیوں میں سب سے زیادہ تاثر ڈاکٹر سید محمد حفیظ متوفی (۱۹۶۳ء) سے رہا، برسوں ان کی رفاقت رہی اور مالی و غیر مالی دونوں حیثیتوں سے مدتوں ان کا ممنون کرم رہا، مگر ساتھ ہی بیچ بیچ سخت بے لطفی اور رنجش بھی ہوتی رہی۔ ایک اور ساتھی خان بہادر ظفر حسین خاں (متوفی ۱۹۶۰ء) بھی بھولنے والے نہیں، اور اسی طبقہ میں مولوی

مسعود علی ندوی بھیاروی (متوفی ۱۹۷۶ء) بھی آتے ہیں، مولانا عبدالباری ندوی کا معاملہ سب سے الگ ہے، بڑے ہی گہرے اور مخلصانہ بلکہ عزیزانہ تعلقات ان سے برسوں رہے، اور اب بھی بار بار کی رنجشوں کے باوجود کہنا چاہیئے کہ مخلصانہ ہی ہیں، میں نے ان سے بہت کچھ لیا اور شاید تھوڑا بہت دیا بھی۔ مخلصوں کی فہرست حد شمار سے باہر ہے، نمونہ کے طور پر یہاں گنجائش صرف ایک ہی نام کی ہے یعنی مخلصی محمد عمران خان ندوی بھوپالی۔

معاصرین میں پہلے مولانا سید سلیمان ندوی اور اس کے سالہا سال بعد مولانا سید مناظر احسن گیلانی سے دل و دماغ دونوں بہت متاثر رہے، دونوں سے تعلقات دوستانہ سے بڑھ کر عزیزانہ ہو گئے۔ دونوں سے خدا معلوم چھوٹی بڑی کتنی چیزیں لیں، اور کتنی اور لینے کی حسرت ہی باقی رہ گئی۔ دونوں کی وفات میرے لئے واقعی حسرت آیات ہوئی، دونوں کی مفارقت سے دل و دماغ میں ایک سناٹا چھا گیا —— تیسرا نام اسی صف میں حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (رائے بریلوی) کا یاد آگیا۔ مخلصانہ تعلقات میں یہ بھی کسی عزیز قریب سے کم نہ تھے، اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا ابوالحسن علی ندوی کو اللہ مدتوں زندہ سلامت رکھے، بڑی گہری دینی و ملّی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اور محسن شخصیتوں کی فہرست مکمل نہیں ہو سکتی جب تک یہ نام بھی اس میں نہ شامل کر لئے جائیں۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق، افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی۔ مولوی سید امین الحسن بسمل موہانی، نواب سالار جنگ حیدرآبادی، نواب علی یاور جنگ حیدرآبادی، مہاراجہ محمود آباد (سر علی محمد خان) نواب اکبر یار جنگ، سر سعید الملک ——

والیٔ چھتاری، ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان، ہوش یار جنگ (ہوش بلگرامی) سر مرزا اسماعیل میسوری، امین الملک ڈاکٹر ذاکر حسین خان صدر جمہوریہ ہند۔

اور عزیز شخصیتوں میں ان دونوں فرنگی محلیوں کو تو بہرحال سر فہرست رکھنا پڑے گا۔ مولوی صبغۃ اللہ شہید مرحوم، اور مولوی جمال میاں سلمہ اللہ، اور ان کے بعد ہی یہ بھی نام درج کرنے ہوں گے۔ سید جالب دہلوی، انیس احمد عباسی کاکوروی، حکیم برہم گورکھپوری۔

سیاسی زندگی میں کئی سال تک ان لوگوں کی زندگی بڑی اپیل کرتی رہی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سید محمود، شعیب قریشی، چودھری خلیق الزماں، چودھری صاحب اور عبدالرحمٰن سندھی (ایڈیٹر مارننگ نیوز) اور بہادر یار جنگ کی فکر اسلامی کا اب تک بہت قائل ہوں۔ بہادر یار جنگ مرحوم اس عموم میں مرتبۂ خصوصی رکھتے تھے، اخلاص، للہیت کے ساتھ فہم و تدبر اور سوجھ بوجھ کا اتنا اجتماع نادراً ہی دیکھنے میں آیا ——— جسٹس کرامت حسین، خواجہ غلام الثقلین اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا بھی اثر پبلک زندگی میں ایک عرصہ تک محسوس کرتا رہا۔ تاثر صرف بڑوں تک محدود نہیں، ہم سنوں اور کم سنوں سے بھی خاصہ اثر لیتا رہا۔ مثلاً دینی اور علمی حیثیت سے مولوی عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم، ڈاکٹر میر ولی الدین حیدرآبادی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدرآبادی ثم فرنسادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، اور مولانا اویس ندوی نگرامی، مولانا محمد طیب صاحب (دیوبند) مولانا امین احسن اصلاحی، اور مولانا مودودی۔

اور ادبی حیثیت سے رشید صدیقی، شوکت تھانوی، خواجہ محمد شفیع دہلوی ثم کراچوی اور سب سے بڑھ کر "آوارہ" (سید آل عبا مارہروی)

علمی و تصنیفی دنیا میں محسن اول مولانا شبلی نعمانی ہیں، لکھنا پڑھنا جو کچھ بھی آیا، کہنا چاہیئے کہ انہیں کی ذات سے آیا پہلے ان کی تحریریں پڑھ پڑھ کر، اور پھر ان کی صحبت میں بیٹھ کر بہت کچھ لیا، بہت کچھ سیکھا۔ ان کے قلم سے بھی، ان کی زبان سے بھی، تصنیفی زندگی میں اگر کسی کو استاد کہہ سکتا ہوں تو انھیں مرحوم کو۔ ان کے ایک خالہ زاد بھائی، مولانا حمیدالدین فراہی تھے، علم و فکر کے دریا، تقویٰ اور حسن عمل کے پیکر، عربی ادب کے فاضل متبحر، اور قرآنیات کے نکتہ شناس، اوقات نماز کی پابندی کا اس شدت سے اہتمام میں نے اپنی زندگی میں دو ہی شخصوں میں پایا۔ ایک یہی مولانا فراہی، دوسرے میر اکبر الہ آبادی دیکھنے میں جج عدالت اور شاعر اور حقیقۃً ایک حکیم عارف، میرے بچپن اور الحاد کے شباب میں بڑی حکمت و لطافت کے ساتھ ہی چپکے چپکے تبلیغ اسلام اور روحانیت کی کرتے رہے۔

سب کے احسانات اپنی جگہ پر، لیکن حقیقۃً میری سیرت سازی میں سب سے زیادہ مُعین و موثر دو شخصیتیں ثابت ہوئیں، ان دونوں نے کہنا چاہیئے کہ زندگی کا رخ ہی موڑ دیا، ان دونوں کا فیض صحبت نہ نصیب ہو جاتا تو خدا معلوم کہاں کہاں اب تک بھٹکتا پھرتا۔

پہلا نام تو ہندوستان کے مشہور لیڈر مولانا محمد علی کا ہے، یہ میرے گویا محبوب تھے ان کا نام بچپن سے سُننے میں آ رہا تھا، اور ان کی انگریزی مضمون نگاری اور انشا پردازی کی دھاک شروع سے دل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ عمر میں مجھ سے چودہ سال بڑے تھے، شخصی تعارف اخیر سنہ ۱۹۱۲ء میں ہوا، محبت و عقیدت دُور ہی دُور سے بڑھتی رہی۔ ستمبر سنہ ۲۱ء میں جب یہ دوبارہ اسیر فرنگ ہوئے اور کراچی میں سزایاب، تو زبان و

دماغ پر ان کی اخلاقی و روحانی عظمت کا کلمہ رواں تھا۔ اور ان کی ذات سے شیفتگی درجہ عشق تک پہنچ چکی تھی، ۲۳ء کے آخر سے ختم ۳۰ء تک قرب و اتصال کے موقع کثرت سے حاصل رہے اور عشق میں ترقی بھی ہوتی رہی، ان کی نہ کوئی بات دل کو بُری لگتی نہ ان پر کسی حیثیت سے بھی تنقید کرنے کو جی چاہتا، یہی جی میں رہتا تھا کہ ان کے قلم اور ان کی انگلیوں کو چوم چوم لوں۔ اسلام اور رسول اسلام سے اس درجہ شیفتگی، اللہ کے وعدوں پر اس شدت سے اعتماد، یہ اخلاص، یہ للّٰہیت، تصنع و منافقت سے اس درجہ گریز، حق کے معاملے میں عزیزوں، قریبوں، بزرگوں تک سے بے مروتی اور پھر ایسی فہم و ذکا، علم و آگہی، غرض میرے لئے تو ایک بے مثال شخصیت تھی۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

دوسری شخصیت ان سے بھی اہم تر اور مفید تر جو میرے نصیب میں آئی، وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تھی، مدتوں ان سے شدید بدظنی میں مبتلا رہا، اور اس بدظنی کے بڑھانے میں بڑا حصہ خود حضرت ہی کے بعض مریدوں معتقدوں کا تھا، مدتوں یہ سمجھتا رہا کہ یہ ایک متشدد و خشک مولوی ہیں، برطانیہ نواز اور نصرانیوں کے دوست۔ جب وصل بلگرامی نے ان کے وعظ پڑھنے کو دیے تو پہلی بار آنکھیں کھلیں اور پھر جب مراسلت کے بعد نوبت دید و زیارت کی آئی، تو کتنے ہی کمالات ظاہری و باطنی کھُل کر رہے، علم و تفقہ، تصوف و شریعت کے جامع، حسن عمل کے ایک زندہ پیکر، اور ارشاد و اصلاح کے فن کے تو بادشاہ۔ وقت کے دوسرے مشائخ کو ان سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔

تو بہار عالم دیگری، زکجا بایں چمن آمدی!

شیخ سعدیؒ اگر آج ہوتے تو عجب نہیں کہ اپنا نسخہ گلستاں بہ غرض اصلاح ان کی خدمت میں پیش کرتے۔ حضرت غزالیؒ ہوتے تو عجب نہیں کہ احیاء علوم الدین کی تصنیف میں استناد و استفادہ ان سے سطر سطر پر کرتے رہتے۔ جولائی ۲۸ء میں سلسلہ مکالمت و مجالست کا شروع ہوا اور کہنا چاہیئے کہ آخر عمر شریف تک جاری رہا، اور سلسلہ مراسلت اس کے علاوہ۔ ۱۹۲۳ء سے جو کچھ اس ناکارہ سے دین کی خدمت بن پڑی اور اپنے رذائل نفس سے جس درجہ میں بھی شفا اپنے ظرف و بساط کے مطابق مل سکی، کہنا چاہیئے کہ وہ سارا فیض اسی بارگاہ کا ہے۔ بزرگ اور عابد زاہد بزرگ اور متعدد دیکھنے میں آئے لیکن مصلح، مُزکی، مُربی کوئی ایسا دیکھنے میں نہ آیا —— محمد علی اگر میرے محبوب تھے تو اشرف علی میرے مقتدا و مطاع۔ محبت کے مرکز اگر وہ تھے، تو عقیدت کے مرجع یہ!

باب (۴۶)

چند مظلوم و مرحوم شخصیتیں

زندگی بھر میں حق ادا کسی کے بھی کر پایا ہوں، بڑوں، چھوٹوں، برابر والوں میں شرمندگی نہیں کس سے ہے؟ صفات ستاری و غفاری اگر آڑے نہ آجائیں تو حشر میں آنکھیں چار کر کے سامنا کسی ایک بھی سابقہ والے کا نہیں کر سکتا، پھر بھی چند ہستیاں تو خصوصیت سے ایسی ہوئی ہیں، جن کے معاملہ میں حق تلفی اتنی نمایاں اور سنگین رہی ہے کہ جب ان کی یاد آجاتی ہے تو جسم میں جھرجھری سی آنے لگتی ہے، اور آنکھیں فرط ندامت سے زمین پر گڑ کر رہ جاتی ہیں۔ احاطہ اور استقصاء اپنے ایسے مظلوموں کا کہاں کر سکتا ہوں، یہی غنیمت ہے کہ دو چار نام حافظہ میں ناقابل محو ہونے کی حد تک ثبت ہو چکے ہیں، سب سے پہلا شکار اس بدبخت کی خیرہ سری کا تو خود والد ماجد مرحوم رہے۔ میں ۲۰ سال کا ہو چکا ہوں ۱۲ء میں ان کی وفات ہوئی، اور گریجویٹ ہو چکا تھا، مضمون نگاری میں خاصہ نام پیدا کر چکا تھا۔ غرض ذمہ دار زندگی پوری طرح شروع کر چکا تھا، لیکن والد ماجد کی خدمت و اطاعت کی طرف سے آنکھیں کم بخت بند کی بند ہی رہیں۔

پندرہ، سولہ سال کے سن تک تو حال غنیمت رہا، اور عام انگریزی خواں نوجوانوں کی طرح لشتم پشتم گزر ہوتا گیا۔ سولہ، سترہ برس کے سن سے، جب سے "عقلیت"

"آزادی" و آزاد خیالی کا سودا سر میں سمایا، معمولی بزرگ داشت بھی طبیعت پر بار ہونے لگی۔ نماز، روزہ سب چھوٹا، یہی ان کی تکلیف اور سوہان روح کے لئے کیا کم تھا کہ براہ راست نافرمانیاں بھی شروع کر دیں، تفصیلات درج کرنے سے کچھ نہ حاصل نہ ناظرین کا کوئی نفع۔ خلاصہ یہ کہ عمر کے آخری ڈھائی تین سال مجھ نالائق کی طرف سے تکلیف ہی میں گزرے۔ ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخسرین۔

بزرگ، دوستوں بلکہ محسنوں میں بھی کم سے کم تین شخص تو ضرور ایسے گزرے ہیں، جن کے حقوق کسی درجہ میں بھی ادا نہیں ہوئے بلکہ انھیں اذیت ہی پہنچتی رہی —— ان میں سے ایک علی گڑھ کے رکن رکین اور بعد کو یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ہیں، بچارے نے ہمیشہ میرے اوپر لطف و عنایت کی نظر رکھی، مجھے اس وقت بلا کر اپنے ہاں ملازمت دی، جب میرا کوئی پوچھنے والا نہ تھا، اور افسر و ماتحت کے بجائے برتاؤ بھی مجھ سے بالکل مساویانہ رکھا۔ میں نے ان کے اخلاص کی کچھ قدر نہ کی اور میری طرف سے انھیں گوناگوں تکلیفیں ہی پہنچتی رہیں۔ آج جب اپنی طوطا چشمی کا خیال آتا ہے تو شرم سے کٹ جاتا ہوں لیکن ان کے حلم و شرافت سے توقع یہی ہے کہ حشر میں بھی وہ بجائے انتقام کے عفو و درگزر ہی سے کام لیں گے —— دوسرا نام فرنگی محل کے مشہور عالم اور صاحب طریقت مولانا قیام الدین عبدالباری (متوفی ۱۹۲۶ء) کا ذہن میں آتا ہے۔ ان کی طرف سے برتاؤ مجھ سے ہمیشہ شفقت و عنایت کا ہی رہا۔ میں اپنی نادانی و کج فہمی سے ان کے مخالفین کے کہنے سننے میں آگیا، اور جو طریقے انھوں نے مولانا کی تضحیک و تفضیح کے اختیار کئے ان میں ان کا مشیر بلکہ آلہ کار بنا رہا، مولانا بڑے صاحب حوصلہ و عالی ظرف تھے، یقین ہے کہ حشر میں بھی وہ اپنے اس نالائق خرد کے مقابلہ میں اسی کا ثبوت

دیں گے ـــــ تیسرا نام اگرچہ ان دونوں سے کم درجہ پر اسی سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد (ایڈیٹر الہلال) کا ہے، ان کی اذیت و دلآزاری میں مَیں نے ۱۲ء ۱۳ء میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ـــــ ان تینوں صورتوں میں ہر بار یہی ہوا کہ میں دوسروں کی روایتوں کے بھروسے پر رہا، اور خوامخواہ اتنی بدگمانیاں قائم کریں، ورنہ بالذات مجھے تینوں میں سے کسی صاحب سے بھی شکایت نہ تھی۔

ملازم یا خدمت گار اتنی زندگی میں میرے پاس کئی ایک رہے، زیادہ تر گھر ہی کے پروردہ۔ زمانہ لڑکپن اور جوانی کا میں نے وہ پایا، جہاں بچاروں کے کوئی انسانی حقوق تھے ہی نہیں اور ان کا شمار بس ایک طرح کے معزز جانوروں میں تھا، آنکھ کھول کر برادری بھر میں یہی منظر دیکھا اور پھر میں تو گرم مزاج و تند خو بھی تھا۔ قدرۃً اس سلسلے طبقہ کے ساتھ برتاؤ ناگفتہ ہی رہا۔ کس کس سے معافی کیا کہہ کہہ کر مانگوں؟

سب سے زیادہ مدت رفاقت حاجی محب علی (متوفی جون ۱۹۵۱ء) کے ساتھ گزری۔ یہ میرے داؤ یعنی مُرضعہ کے شوہر کی دوسری بیوی کے اولاد تھے، اور اس طرح میرے سوتیلے رضاعی بھائی تھے، لڑکپن میں نادانیاں کس سے نہ ہوتیں، ان سے بھی ہوئیں، لیکن میری سختیاں اس وقت بھی ان کے قصوروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھیں، اور پھر جوانی سے تو انھوں نے میرے ساتھ اخلاص، دیانت اور ہوا خواہی کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ حج بھی میری خوش دامن کے روپیے سے میرے ساتھ ہی کیا چند ماہ انتڑیوں کی دق کے شدائد جھیل کر ماہ مبارک رمضان ۱۳۷۱ھ کے اخیر عشرہ عین افطار کے وقت جان جاں آفریں کے سپرد کی۔ بچپن بھر تو خیر، ان بچارہ پر مار پیٹ بھی خوب

ہوا کی لیکن آگے چل کر بھی وہ برتاؤ مجھے نصیب نہ ہوا، جو ان کے حسن خدمات کے لحاظ سے واجب تھا۔ خدانخواستہ مرحوم نے حشر میں کہیں انتقام کا مطالبہ کر دیا تو میرا کیا حشر ہو کر رہے گا!

مدتوں میری خدمت میں ایک نو مسلم شخص شعبان علی نامی رہے، مجھ سے سن میں دو تین سال بڑے ـــــ اپنے بالکل بچپن میں کہیں سے لاوارث ہو کر میرے ہاں آگئے تھے، اور میرے ہی سر (حسب ورواج خاندان) چپکا دیئے گئے۔ "میاں لوگوں" کے ہاں خدمت گاری اس وقت لفظاً و عملاً غلامی کے مترادف تھی، وہی سب ان پر بھی گزرتی رہی۔ آج ان وحشیانہ سختیوں کا خیال کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شریعت اسلامی تو کجا، مغربی تہذیب میں بھی اس جابرانہ برتاؤ کی کوئی سند جواز نہیں، لڑکپن تو خیر کسی طرح گزر ہی گیا، جوان ہو کر یہ ہم لوگوں کے بڑے مخلص و وفادار ثابت ہوئے، لیکن ہم لوگوں کی جابرانہ و قاہرانہ حکومت میں کیوں کمی آنے لگی تھی۔ اور سب سے بڑا جابر و قاہر تو میں خود بنا ہوا تھا، ان کے حقوق میں وہ وہ شیطانی خیانتیں کیں کہ صفحہ کاغذ پر انھیں منتقل کرنے کی ہمت کسی طرح نہیں۔ اخیر میں ہمارے ہاں سے مجبوراً الگ ہو کر گئے اور کچھ ہی روز بعد ۱۹۱۹ء میں عین بقرعید کے دن شام کو عالم بقا کو سدھار گئے۔ روایت یہ سننے میں آئی کہ کسی ظالم ناخدا ترس نے ان کی خوش شکل بیوی سے سازش کر کے انھیں زہر دے کر ختم کر دیا۔ اگر یہ روایت درست ہے تو ۱۰ ذی الحجہ کی تاریخ تو یوں بھی مبارک ہوتی ہے، ان کی موت شہادت کی موت ہوئی۔ اللہ اس مظلوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، اپنے کرتوتوں کو جب یاد کرتا ہوں تو نفرت اپنے سے ہونے لگتی ہے ـــــ تسلی اور ڈھارس کا سامان تو کچھ ہے وہ صرف اتنا ہے کہ جس زمانہ کا یہ ذکر ہو رہا ہے، وہ عین میرے الحاد و

لامذہبی کا دور تھا۔ از سر نو مسلمان تو اور اس کے بعد ہوا ہوں۔ حج کے موقع پر میدان عرفات میں، اپنے ان گناہوں کی مغفرت کی دعا کر چکا ہوں اور مرحوم کی روح سے رو رو کر معافی مانگ چکا ہوں ـــــ خدا ترس ناظرین سے اس موقع پر بھی التماس دعا ہے ربّنا ظلمنا انفسنا، ربّنا ظلمنا انفسنا، ربنا ظلمنا انفسنا۔

گھر کا پروردہ ایک لڑکا قدرت نامی گیارہ بارہ برس کا ہمارے ہاں ۱۳ء یا ۱۴ء میں تھا۔ ایک روز شام کے وقت کسی معمولی سے قصور پر میں نے اسے خوب مارا، قدرتؔ بچارہ چیختا گیا اور میں پیٹتا گیا، اس کے بعد سے وہ ایسا غائب ہوا کہ پھر کچھ پتا ہی نہ چلا، عجب نہیں کہ کہیں اور جا کر انتقال کر گیا ہو۔ اور میں کوئی ایسی صورت تلافی مافات کی نہ نکال سکا ـــــ درگاہی عرف محمد معین جو کئی سال سے صدق کے گویا دفتری ہیں، اور میرے مخلص و خیر خواہ رہ چکے ہیں، اور تیغ علی خان ساماں (حاجی محب علی کے چھوٹے بھائی) بھی مدتوں میرے جبر و ستم کے تختۂ مشق رہ چکے ہیں۔ اللہ ان سب کے دلوں میں رحم ڈال دے کہ مجھ سے کسی طرح کے بھی انتقام کے طالب نہ ہوں ـــــ اس وقت میری خدمت میں کئی سال سے انھیں خانساماں کا چھوٹا لڑکا نثار علی ہے اور اب سیانا ہو چکا ہے، بہ حیثیت مجموعی اس سے خوش ہوں لیکن بہر حال انسان ہی ہے، جب تکلیف دیتا ہے تو اس کے حق میں خاصہ جابر بن جاتا ہوں۔

اپنی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے۔ سابقہ والوں کی حق تلفیاں، سب کی عموماً اور زیر دستوں و ملازموں کی خصوصاً۔ اور جب اس پہلو پر سوچنے کی توفیق ہوتی ہے، تو دل لرز کر رہتا ہے۔ اپنے وصیت نامہ میں لکھے جاتا ہوں کہ ترکہ کے وہ ثلث جس میں وصیت جاری ہو سکتی ہے، اس کا نصف انھیں خدمت گاروں کے حوالہ کر دیا جائے۔

علاوہ ان سے معافی مانگنے کے، کہ تلافیٔ مافات کی صورت کسی حقیر درجہ میں تو نکل ہی آئے۔

اپنی والی تکرار بھی جب توفیق مل جاتی ہے اس حدیث نبوی کی بھی کرتا رہتا ہوں۔

اللّٰھُمَّ انی اتخذ عندك عھدًا
لن تخلفنیه فانما بشرًا فایما
مومن آذیته او شتمته او جلدته
او لعنته فاجعلها له صلوٰۃ و
زکوٰۃ وقربة تقربه بها الیك

اے اللہ میں آپ سے وعدہ لیتا ہوں،
جسے آپ ہرگز نہیں توڑیں گے کہ میں بھی
آخر بشر ہی ہوں سو جس کسی مسلمان کو بھی میں
تکلیف دوں یا اسے بُرا بھلا کہوں یا اسے
ماروں پیٹوں یا اسے بد دعا دوں تو تو اس سب
کا اس کے حق میں رحمت و پاکیزگی بنا دیں،
جس سے آپ اس کو اپنا مقرب بنا لیں۔

ان اوراق کے پڑھنے والے جو اس اوراق نویس سے نسبت اخلاص رکھتے ہیں، ان سب سے اس موقع پر التماس دُعائے خیر ہے۔

باب (۴۷)

اولاد

اولاد کا سلسلہ شادی کے سال کے اندر ہی شروع ہوگیا، حالاں کہ اس سن (۲۴ سال) میں اولاد کی کوئی تمنا تھی اور نہ کوئی قدر، بلکہ قدر تو اس کے بہت زمانے کے بعد، ساری جوانی گزر جانے پر، کوئی پچاس سال کے سن سے شروع ہوئی ــــــ قدرۃً اس وقت بچوں کی طرف کوئی التفات ہی نہ تھا، بلکہ دلی خواہش یہ تھی کہ ابھی اولاد کا سلسلہ رکا رہے، دلھن اپنے حسن شہر آشوب کی رعنائیوں کے ساتھ سالہا سال بس دلھن ہی بنی رہے، اور حمل، زچگی، رضاعت کے جھمیلوں سے بچی رہے ــــــ عورت کے جذبات اس باب میں مرد سے کتنے مختلف ہوتے ہیں۔ اور ماں کی مامتا اپنے جسم کے بناؤ سنگھار کی خواہش پر کیسی غالب رہتی ہے! حمل قرار پاتے ہی دیکھتے دیکھتے کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے، اور وہ پچھلا رنگ روپ، قد و قامت کی دل کشی و رعنائی، اور بعض اعضاء کی جاذبیت سب کافور ہو جاتی ہے۔

یہاں بھی یہی ہوا، بلکہ معمول عام سے کچھ زائد ہی، اس لئے کہ حمل، خدا معلوم کیونکر اور کن اسباب سے بجائے ایک بچے کے، توام بچوں کا قرار پایا، حمل کی ساری مدت طرح طرح کی اذیتوں میں گزری اور اس میں بڑا دخل ناواقفیت و ناتجربہ کاری اور

اٹھرپن کا تھا۔ پہلی ولادت جولائی ۱۷ء میں ہوئی۔ یاد کر لیجئے کہ قیام اس وقت تک لکھنؤ میں تھا (دریاباد میں نہیں) میری "صاحبیت" کے تقاضے سے گھر پر بجائے حسب رواج کسی ہندوستانی قابلہ کے یورپین لیڈی ڈاکٹر بڑی گراں قدر فیس پر بلائی گئی۔ ایک بچہ پیدا ہوتے ہی رخصت ہو گیا۔ اس کی تجہیز و تکفین دوسرے عزیزوں نے کی، مجھ ملحد کو بھلا اس سے کیا واسطہ تھا۔ دوسرا زندہ رہا، اس کا نام حضرت اکبر الہ آبادی کے نام پر اکبر رکھا۔ ۱۳ مہینے کا ہو کر ستمبر ۱۸ء میں وہ بھی جاتا رہا۔ ماں کا روتے روتے بُرا حال ہو گیا۔ میں سنگ دل ملحد ان کی تشفی کیا کہہ کر کرتا۔ تجہیز و تکفین کسی چیز میں شریک تک نہ ہوا۔

اولادوں کا سلسلہ جاری رہا، کئی ایک ہوئیں، دو ایک پیٹ بھی گرے، اس سے ماں کی صحت جو اچھی پہلے بھی نہ تھی، بہت ہی گر گئی۔ اور طرح طرح کے تکلیف دہ عارضے پیدا ہو گئے، چھوٹی بڑی بہت سی چیزیں جو بعد کو معلوم ہوئیں، اگر پہلے سے علم میں آجاتیں تو نوبت ان اذیتوں کی نہ آتی۔ لیکن کیسے علم میں آجاتیں، مُربّیِ حقیقی کی تکوینی مصلحتوں کو باطل کون کر سکتا تھا؟ لڑکے کی ولادتیں دو بار ہوئیں، لیکن قسمت میں صرف لڑکیوں کا باپ ہی ہونا لکھا کر لایا تھا، زندہ کوئی نہ رہا، ایک لڑکی شفقت نامی جون ۲۲ء میں لکھنؤ میں چھ مہینے کی ہو کر گزر گئی اور ماں کو ہر تازہ واقعہ کی طرح اس کا بھی شدید صدمہ رہا۔ لیکن میں اب دوسرا ہو چکا تھا۔ تجہیز و تکفین کی ہر منزل میں شریک رہا، ننھا سا جنازہ اپنے ہاتھوں پر لے کر چلا۔ قبر میں اتارنے میں بھی شریک رہا، ماں کو بھی اپنے مقدور بھر تسکین دی ـــــ صرف ایک نقطہ نظر کی تبدیلی سے زندگی خود کتنی بدل گئی تھی۔ کتنی خوش گوار ہو گئی تھی، توحید رسالت کے عقیدے نے شقاوت دل سے دُور

کر دی تھی، اور اولاد سے فطری محبت پیدا ہوئی یا نہیں بہر حال اس کے عقلی مقتضار پر تو عمل ہونے ہی لگا تھا!

آخری ولادت جنوری ۳۳ء میں ہوئی، اور اس کے بعد سے یہ سلسلہ بند ہوگیا۔

اولاد کا ارمان زندگی کے کسی دور میں بھی نہیں رہا، لیکن اب کیا بتایا جائے کہ اس بندش و انقطاع کا صدمہ دل کو کتنا ہوا، اولاد نہ ہونا اور چیز ہے، اور اولاد نہ ہو سکنا بالکل اور چیز!

امید اور اس کا قائم رہنا ایک بڑی چیز تھی، گویا اب اس سے ہمیشہ کے لئے محرومی ہو گئی! ہائے اب کبھی وہ زمانہ لوٹ کر نہ آئے گا، اب نہ کبھی حمل کی خبر سننے میں آئے گی، نہ کبھی زمانۂ حمل کی احتیاطیں ہوں گی، نہ کبھی وضع حمل کا انتظار، نہ کبھی زچہ خانہ کی تیاریاں اور اہتمام، نہ کبھی ہوشیار قابلہ یا لیڈی ڈاکٹر کی تلاش ہو گی، اور نہ کبھی زچگی کے قبل و بعد کی خاطر داریاں اور خوشیاں! ہر ہر جز بۂ ان میں سے ہمیشہ کے لئے گیا، اور اب کبھی نہیں آئے گا!

عورت کا حُسن و شباب بھی دنیا کی ہر مادّی نعمت کی طرح کتنا عارضی، زود فنا، پُر فریب ہوتا ہے، اور اپنے ایک گمنام شاعر دوست، امیر علی رقم لکھنوی مرحوم نے کتنا سچا مضمون باندھا ہے ؎

تھی یہ حقیقت مجاز، اب یہ کھلا ہے جاکے راز
سب ہے فریب آب و گل، حسن و جمال کچھ نہیں

بہر حال زندہ اولادیں ماشاء اللہ چار ہیں (اگست ۶۷ء) اور چاروں لڑکیاں،

چاروں کی شادیوں سے مدت ہوئی فراغت ہو چکی، اور تین ان میں سے صاحب اولاد ہیں، داماد کوئی بھی باہر سے تلاش نہ کرنا پڑا۔ چاروں میرے حقیقی بھتیجے بھی ہیں، اور بڑی حد تک میری ہی تربیت پائے ہوئے ——— اللہ کے یہ بھی مخصوص انعاموں میں سے ایک انعام میرے نصیب میں آیا۔ ورنہ لڑکی کے لئے رشتہ تلاش کرنے میں جو دقتیں پیش آ رہی ہیں وہ ہر ایک پر روشن ہیں، یہاں تلاش کا کوئی سوال سرے سے پیدا نہ ہوا اور نہ عقد کے وقت کوئی خاص تقریب ہی منانا پڑی، بس جب اپنا سُبیتہ دیکھا عزیزوں اور مخلصوں کے ایک مختصر مجمع میں نکاح پڑھا دیا، البتہ پہلی بار پلاؤ، باقی تین مرتبہ مٹھائی ذرا بڑے پیمانہ پر، بستی میں اور لکھنؤ میں برادری میں تقسیم کر دی۔

بڑی لڑکی کا نام رافت النساء، ولادت اگست ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ میں ہوئی، ولادت کے وقت ماں کو بڑا ہی کرب رہا۔ عزیز لکھنوی نے تاریخ ولادت کہی، ماشاءاللہ نیک، عبادت گزار، اطاعت شعار، سلیقہ مند ہے، لیکن نحیف الجثہ و پست قامت، لڑکپن بھر بیماریوں کی پوٹ بنی رہی، اب بھی سخت گراں گوش ہے، اور آنکھوں کی بھی اکثر مریض بچپن میں قرآن شریف ناظرہ بہت جلد ختم کر دیا تھا، اردو تعلیم خاصی، کچھ شد بد فارسی و عربی کی بھی۔ نماز بڑا جی لگا کر پڑھتی ہے، نماز عشا میں یہ خشوع و خضوع اور نمایاں رہتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں کسی طرح روپیہ جمع کر کے حج سے بھی مشرف ہو آئی اور سفرنامہ بھی لکھ ڈالا ——— عقد میرے بڑے بھتیجے حکیم عبدالقوی (گھریلو نام آفتاب)، بی۔ اے "مولوی" "عالم" "منشی فاضل" وغیرہ کے ساتھ ۱۹۳۷ء میں ہوا۔ طبیہ کالج دہلی سے فاضل الطب و الجراحت بھی کیا، علاوہ لکھنؤ میں مطب کے، صدق اور صدق بک ایجنسی کی منیجری بھی کرتے ہیں، لیکن مناسبت لکھنے سے زیادہ ہے، مسلم لیگی روزنامہ تنویر میں لکھتے رہے ہیں

اور بھی کئی اخباروں کے اداریہ نویس رہے، اب بھی ہیں، ہر جمعہ کو دریاباد قبل دوپہر آجاتے ہیں اور سنیچر کو صبح لکھنؤ واپس چلے جاتے ہیں۔

منجھلی کا نام حمیرا، خاتون ہے۔ ولادت مئی ۱۹۲۳ء میں لکھنؤ میں ہوئی، اُردو تعلیم و مطالعہ اچھا خاصہ، عربی، فارسی کے ساتھ انگریزی میں شد بُد اور بہت ہی اپنی ماں سے مشابہ، منتظم وسلیقہ شعار، میری سب سے زیادہ مزاج شناس اور ہر صلاح، مشورہ، انتظام میں میری شریک ــــــ عقد میرے منجھلے بھتیجے حبیب احمد قدوائی، ایم اے (اسسٹنٹ یوپی سکریٹریٹ لکھنؤ) کے ساتھ ۱۹۳۹ء میں ہوا، اس وقت (اگست ۶۷ء) تک ماشاءاللہ دو لڑکیوں اور چار لڑکوں کی ماں بن چکی ہے۔ سال کا بیشتر حصہ دریاباد ہی میں میرے ساتھ گزرتی ہے۔ بڑی ہمت کر کے اور خالص مذہبی جذبہ کے ماتحت بڑے لڑکے عبدالرافع کو عمر کے دسویں سال حافظ قرآن کرادیا۔

سنجھلی زُہیرا خاتون (اور یہ نام حضرت تھانوی کا رکھا ہوا ہے) ولادت مارچ ۱۹۳۱ء میں دریاباد میں ہوئی، رنگ روپ صورت شکل میں سب بہنوں پر فائق، خدا داد وغیور ہونے میں بھی سب سے بڑھی ہوئی، تعلیم منجھلی بہن کی سی پائے ہوئے، اور میری بہت زیادہ ہم مزاج ــــــ عقد میرے سنجھلے بھتیجے محمد ہاشم قدوائی ایم اے، پی ایچ ڈی (علی گڑھ) سے اکتوبر ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ اس وقت تک ماشاءاللہ دو لڑکوں اور تین لڑکیوں کی ماں ہے۔ بڑا لڑکا عبدالرب (ربّانی) کم سنی میں بی اے کر چکا اب ایم اے کے پہلے سال میں ہے۔

چوتھی زاہدہ خاتون، ولادت ۳۳ء میں دریاباد میں ہوئی، تعلیم میں اپنی بہنوں سے آگے، لاغر نحیف الجثہ اپنی بڑی بہن کی طرح، اور اب ایک عرصہ سے زیادہ بیمار رہنے لگی

ہے بلکہ تشویش ناک حد تک ـــــــ عقد میرے چھوٹے بھتیجے عبدالعلیم قدوائی ایم' اے کے ساتھ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ اس وقت تک ماشاء اللہ دو بچوں اور تین بچیوں کی ماں۔

چاروں لڑکیاں ماشاء اللہ مذہبی ہیں، اور میری اطاعت شعار، اور سلیقہ مند، اور پردے کی پابند اس وقت تک ہیں ہی۔ لڑکوں ہی کی طرح میں لڑکیوں سے بھی خوب گھل مل کر رہتا ہوں، ہر طرح کی تربیت کرتا اور انھیں دنیا کی اونچ نیچ بجھاتا ہوں زمانہ کے ہر فتنے سے آگاہ باخبر کرتا ہوں۔ رسالوں، کتابوں، اخباروں کے تراشوں، اور زبانی گفتگو میں زندگی کے ہر پہلو ان کے سامنے لاتا ہوں۔ اس میں گو ایک حد تک بے حیا بننا اور رسمی شرم و حیا کے معیار سے ہٹنا پڑتا ہے، لیکن ان لوگوں کو بصیرت خوب ہو جاتی ہے، اور ہر فتنہ سے مقابلہ کے لئے پختگی پیدا ہو جاتی ہے، لکھنؤ میں ان کی قریب کی بہنیں، بھاوجیں "اعلیٰ" اور "اونچی" سوسائٹی کی عادی ہیں، یہ ان سے محبت و عزیز داری کے تعلقات پورے رکھے ہوئے، ان کی روشن خیالیوں سے الگ ہیں۔

میرا گھر کہنا چاہیئے کہ دریاباد اور لکھنؤ میں بٹا ہوا ہے گھر کا انتظام یوں رہتا ہے کہ اکثر ایک لڑکی ضرور میرے پاس دریاباد میں رہتی ہے اور ہر ایک کی باری کچھ مہینوں کے بعد بدل جاتی ہے، بڑی اور منجھلی کے شوہر مستقلاً لکھنؤ میں رہتے ہیں اور چھوٹی کے شوہر بھی ابھی تک عملاً لکھنؤ ہی میں ہیں، تیسری لڑکی البتہ اکثر علی گڑھ جاتی رہتی اور سال کے چھ مہینے وہیں صرف کرتی ہے۔ باقی کے شوہر جہاں جہاں ان کی بیویاں ہوتی ہیں جلد جلد اپنی آمد و رفت رکھتے ہیں۔

اولاد کو قرۃ العین آنکھ کی ٹھنڈک کہا گیا ہے، میرے حق میں تو یہ اللہ کی نعمت واقعی

اب تک ایسی ہی ہے۔ ان میں آپس میں بھی بحمد اللہ ابھی تک بڑا میل ملاپ ہے، اور میری خانگی زندگی بڑی عافیت سے گزر رہی ہے۔ باقی عافیت اصلی تو بجز جنت کے اور کہاں نصیب ہو سکتی ہے، دنیا بہر حال دنیا ہے، داماد بھی لڑکیوں ہی کی طرح مسلمان اور اطاعت شعار ملے ہیں، اور بڑی مسرت اس کی ہے کہ (اس وقت تک کے لحاظ سے) اپنے بعد جو نسل چھوڑے جا رہا ہوں، وہ بے دینوں، ملحدوں، فاسقوں کی نہیں، بلکہ اللہ کی توحید کا اقرار کرنے والوں اور محمدؐ کی رسالت کی گواہی دینے والوں کی ہے، آئندہ اور اس کے بعد کی نسل کو سنبھالے رکھنا اور دولت ایمان پر قائم رکھنا اس قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے۔

باب (۴۸)

مخالفین و معاندین

مخالفوں سے تب شخصی و نجی زندگی میں مفر نہیں تو پبلک زندگی میں آنے کے بعد ان کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو جانا بالکل قدرتی ہے۔ یہ کلیہ ایسا ہے جس سے مستثنیٰ دو چار کاملین بلکہ انبیاء مرسلین بھی نہیں، جہاں مریدوں، معتقدوں میں مومنین کا بڑا گروہ پیدا ہوا وہیں اعداء و معاندین بھی اسی درجہ و مرتبہ کے پیدا ہوتے گئے ـــــ ہر صدیقؓ کے مقابلہ میں ایک ابوجہل اور ہر علی مرتضیٰؓ کے جواب میں ایک ابولہب!

اپنی تنگ ظرفی اور کمزوری کی رعایت سے الحمدللہ کہ مخالفین کی تعداد اپنی پبلک زندگی کے ہر دور میں نسبتہً کم ہی رہی اور مخلصوں، معتقدوں، حسن ظن رکھنے والوں کا شمار ان کے مقابلہ میں کہیں زائد۔ مہینے میں ایک دو خط کبھی گمنام اور کبھی نام سے سب وشتم سے لبریز اگر کبھی آ گئے تو ان کی کیا حیثیت ان بیسیوں خطوں کے مقابلہ میں جو حسن ظن سے لبریز ہر مہینے وصول ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس تحریر کے وقت تک نہ صرف ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں، بلکہ بیرون ہند بھی کئی کئی ملکوں میں مخلصوں اور محبوں کی تعداد اچھی خاصی موجود ہے۔ ایسی کہ ان کا خیال کر کے بار بار دل میں محجوب بھی ہو جاتا ہوں، اور ذاتی و نجی زندگی میں تو کہنا چاہیے کہ کسی مخالف کا وجود ہی نہیں، یہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے ورنہ

کون ہے جو خانگی و خاندانی مخالفتوں کی وبائے عام سے بچا ہوا ہے!

اختلاف رائے و خیال بالکل قدرتی ہے، اور جب تک انسان میں فہم و بصیرت اور مذاق کا اختلاف قائم ہے، ایسے اختلاف کا مٹنا ممکن نہیں، بلکہ بالکل ممکن ہے کہ ایسا اختلاف بھائی بھائی، باپ بیٹے، میاں بیوی اور مخلص ترین عزیزوں، دوستوں، محبوں کے درمیان بار بار ہو جائے، تو ایسے اختلاف کا ذکر ہی نہیں۔ اس طرح کے بحث و مباحثہ خدا معلوم شروع سے اب تک کتنے پیش آچکے، اور اب بھی جاری ہیں، فلاں ادارے کی فلاں ملی پالیسی پر نکتہ چینی کرنی پڑی۔ فلاں عالم کے فلاں نظریے سے بھی اختلاف ناگزیر رہا۔ "وَلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ" تو اللہ کا بنایا ہوا قانون تکوینی ہے اور عجب نہیں کہ موجب برکت و رحمت ہو۔ لیکن ایک مختصر گروہ ایسا بھی پبلک زندگی کے ہر دَور میں یاد پڑتا ہے جس کا اختلاف دینی، سیاسی، علمی، ادبی، ملی مسائل تک محدود نہیں، بلکہ جن کی نظر میں شاید میرا وجود ہی ایک مستقل جرم ہے، طنز، تعریض، تحقیر، تنقیص، تضحیک، تفضیح کا ہر حربہ ایسے حضرات کے نزدیک جائز، بلکہ مقصد کے حصول کے لئے شدید مبالغہ آمیزی، اور افترا پردازی تک سے دریغ نہیں، اور بالکل ممکن ہے کہ میں خود بھی کسی کے مقابلہ میں اسی حد تک اپنے آپ سے گزر گیا ہوں اور مجھے پتا بھی نہ چلا ہو ـــــ نیتوں کا احتساب تو بس عالم الغیب ہی کے حضور میں ہوگا۔

سوچنے سے اس وقت دو صحافیوں کے نام یاد پڑ رہے ہیں (ایک مقیم کلکتہ اور دوسرے بھوپالی) جن میں سے ایک پاکستانی ہو گئے تھے، اور دونوں اب انتقال کر چکے ہیں، اور چوں کہ مسلمان تھے اس لئے مغفور بھی ہو گئے ہوں گے، لیکن جس حد تک میرے مجرم تھے، میرے ہی معاف کرنے سے ان کی معافی ہوگی۔ اور دو صاحب

اسی ٹائپ کے دہلی کے بھی ہوئے ہیں، جن میں سے ایک بڑے ممتاز اہل قلم تھے، دوسرے محض صحافی، یہ دونوں بھی مرحوم ہو چکے ہیں اور خدا کرے کہ قبل وفات اپنے اس "زورِ قلم" پر پشیمان ہو چکے ہوں۔

ایک آدھ غیر مسلم پرچہ کو چھوڑ کر، زندہ حضرات میں میرے شدید ترین دشمن لاہور کے ایک معلوم و معروف صحافی ہیں، جو شاید میری موت کی تمنا میں ہر وقت رہتے ہیں، اور اپنے پرچہ میں کئی سال قبل میرا ذکر "قبر میں پیر لٹکائے ہوئے" کی حیثیت سے کر چکے ہیں۔ اپنے پرچہ میں بدزبانی اور تہمت طرازی کا پورا ترکش خالی کر چکے ہیں[۱]، اس بے بنیاد جرم میں کہ میں مولانا ابوالکلام کا شدید دشمن ہوں! حالاں کہ مرحوم سے میری جو مخالفت تھی، وہ صرف الہلال کے شروع زمانے کی تھی، ۱۳ء ۲۱ء میں اور ۱۸ء میں تو وہ ختم بھی ہو چکی تھی —— دعا ہے کہ حشر میں جب ان کا سامنا ہو، تو ان سے بجائے مطالبۂ انتقام کے اپنے دل میں اتنی وسعت پاؤں کہ عفو و درگزر سے کام لے لوں!

خود میرے قلم، زبان اور ہاتھ سے خدا معلوم کتنوں کو اذیت پہنچ چکی ہوگی، عجب نہیں جو قدرت نے بعض ظالموں کو مجھ پر مسلّط کر کے خود میرے مظالم کے کفارہ کا ذریعہ انھیں کو بنا دیا ہو۔ بہرحال اتنی سطریں بھی ڈرتے ڈرتے اور بڑی ہچکچاہٹ کے بعد ہی لکھی ہیں، اور نیتوں کا حال عالم الغیب ہی پر روشن ہے۔

---

[۱] یہ صاحب بھی مولانا کی زندگی میں انتقال کر گئے (حکیم عبدالقوی)

باب (۴۹)

عام نتائج و تجرباتِ زندگی کا نچوڑ

کتاب، بلکہ کہنا چاہیئے کہ کتاب زندگی کا مشکل ترین باب یہی ہے، ۵۷ سال کی زندگی کا خلاصہ تجربات میں کیا لکھا جائے اور کیا چھوڑا جائے ؟ جی میں تو بے اختیار یہی آرہا ہے کہ داستان زندگی (آہ، کہ کتنی لذیذ، اور آہ کہ کتنی تلخ، دونوں ایک ہی وقت میں) کُل کی کل بغیر ایک حرف چھوڑے دہرادی جائے ـــــ داستان زندگی کے دہرانے میں لگتا ایسا ہے کہ جیسے زندگی خود اپنے کو دہرا رہی ہے! سوچنے بیٹھے تو اپنی زندگی قابل صد نفرین و مستحق ملامت، اور نہ سوچیئے تو جان عزیز سے بڑھ کر عزیز، لذیذ کوئی شے ممکن نہیں!

سب سے پہلی بات تو یہ خیال رکھنے کی ہے کہ طبعی تقاضا و شوق اور چیز ہے اور ہوس اور چیز، بہ قول حضرت اکبر الہ آبادی

کہنے کی ایک حد ہے بکنے کی حد نہیں

جو فرق کہنے اور بکنے میں ہے وہی طبعی تقاضے اور ہوس میں ہے ع

وہ راہبر کی ہدایت، یہ رہ گزر کا فریب

طبعی تقاضوں کی تکمیل کی جا سکتی ہے، لیکن ہوس کی آگ بجھانے کے لئے کوئی

حدو نہایت نہیں، ہوس رانی جتنی بھی کیجیے گا، طبیعت بجائے آسودہ ہونے کے حریص سے حریص تر ہوتی جائے گی، آگ بجھنے کے بجائے بھڑکتی ہی جائے گی، ضرر و زیاں صریح واقع ہوتا جائے گا، لیکن طبیعت کو اُس کا احساس ہی سرے سے جاتا رہے گا ـــــ نفس امارہ بڑا منطقی، بڑا فقیہ واقع ہوا ہے ہر نفس پرستی، ہر ہوسناکی اور اس سے پیدا ہونے والے ہر ضرر و زیاں کی کوئی نہ کوئی خوب صورت سی تاویل و توجیہ ہر بار کرے گا اور ھل من مزید کے نعرے لگاتا ہوا آپ کو برابر مغالطہ میں بتلا اور دھوکے میں اُلجھائے رہے گا! لازم ہے کہ ہر خواہش نفس پر حاکم طبیعت کو نہیں، عقل کو رکھئے اور عقل کی حاکمیت کا نفاذ بڑی سختی سے کرتے رہیے، ہیجان نفس کے وقت (عام اس سے کہ وہ ہیجان غصہ کا ہو، حُب جاہ کا ہو، حرص مال کا ہو، شہوت جنسی کا ہو) عقل تک اندھی اور مغلوب ہو جاتی ہے! ایسے موقع پر دست گیری شریعت سے پائیے، اور پناہ احکام خداوندی میں ڈھونڈھیے نفس کو بے لگام کسی حال میں بھی نہ ہونے دیجیے، اس شورہ پشت گھوڑے سے آپ ذرا بھی غافل ہوئے اور اس نے آپ کو زمین پر دے پٹکا! ـــــ غصہ اور شہوانیت، یہ نفس کے دو بے پناہ حربے ہیں، اور انسانیت کے دشمن قاتل! اگر ان پر نوعمری ہی میں قابو پالیا گیا، انھیں عقل اور اس سے بڑھ کر شریعت کے تحت میں لے آیا گیا، جب تو خیر ہے، ورنہ اگر یہ سنپولیے بڑھ کر اژدھے ہو گئے تو کوئی صورت ان کے عذاب سے نجات پانے کی نہ رہے گی، سن کے ساتھ ساتھ ان کی گرفت بھی سخت سے سخت تر ہوتی جائے گی، انسان خمیازہ اٹھائے گا، پچھتائے گا، جھنجھلائے گا، پھر بھی بس پھڑ پھڑا کر رہ جائے گا، ان کے پنجہ سے رہائی کی کوئی صورت آسان نہ ہوگی!

روپیہ کی محبت بھی بڑی بُری بلا ہے، سن کے ساتھ ساتھ یہ گھٹتی نہیں، بلکہ حرص وہوس عموماً بڑھ ہی جاتی ہے، اور وجہ جواز میں ذہن نئی نئی ضرورتیں گڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ ضرورت اس وقت سال پر شروع ہی سے قابو پا لینے اور اپنے کو قناعت کا خوگر بنا لینے کی ہے، یہ جس نے نہ کیا، اسے تلخیاں قدم قدم پر پیش آتی رہیں گی لیکن روپیہ کی محبت اور شے ہے اور اس کی قدر اور۔ روپیہ کی محبت تو بے شک ہرگز نہ پیدا ہوتے پائے، لیکن روپیہ کی قدر ضرور ہو، یہ نہ ہوا تو دوسرا مرض اسراف کا پیدا ہو کر رہے گا۔ بخل و اسراف دونوں مرض ایک ہی درجہ کے ہیں اور دونوں بڑے سخت۔ ان کے حملے سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی واحد صورت یہ ہے کہ قلب کو ایک طرف حُب مال سے خالی رکھا جائے، اور دوسری طرف روپیہ کی ناقدری سے۔

دل کو ریا و نمائش سے خالی اور اخلاص سے لبریز رکھنا بھی کوئی آسان و معمولی چیز نہیں، بڑی ریاضت اور بڑے مجاہدوں کے بعد ہی یہ دولت ہاتھ آ سکتی ہے۔ اور پھر بھی ہر وقت ڈگمگا جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ وَلَا یُلَقّٰھَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْم ـــــ ایک بڑا دخل اس میں صدق دل سے دعا مانگنے کا ہے اور اسباب و ذرائع شہرت سے اپنے کو دُور رکھنے کا ہے، نفس عاشق ہے جاہ کا، اور انسان ایک حد تک خوشامد پسند طبعاً ہوتا ہے۔ راہ اخلاص کا سب سے بڑا راہزن، مدّاحوں، معتقدوں، مریدوں کا گروہ ہوتا ہے، ہر وقت کی داد و تحسین، رضا جوئی حق کا گلا گھونٹ دیتی ہے تفسیر قرآن تک کے بظاہر سو فی صدی خالص دینی کام کو جب سوچتا ہوں اور اپنے پر جرح کرتا ہوں کہ اگر داد و تحسین خلق مسرت نفس اور مالی منفعت وغیرہ سارے خارجی خیالات کو منتزع کر لیا جائے، جب بھی یہی اہتمام وانہماک کام کے لئے باقی رہے گا۔

تو ضمیر کچھ کانپ سا اٹھتا ہے!

'علم' بہ معنی لکھائی پڑھائی، کتابوں کی ورق گردانی کے شوق کا مرض بچپن سے رہا ہے' اب بھی طالب علم ہی ہوں' ہر وقت اپنے گرد ایک کتب خانہ چاہتا ہوں، بغیر کتابوں کے وقت کاٹنا دشوار ہو جاتا ہے، بارہا شوق مطالعہ کے آگے دوسرے طبعی جسمانی شوقوں کو مغلوب کر چکا ہوں، لیکن پھر بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس سے ہوتا کیا ہے' اور اس سے حاصل کیا، جب تک یہ دُھن تمام تر رضائے حق کی خاطر نہ ہو، دنیا میں بالفرض اردو کا نامی مصنّف اور گرامی اہل قلم کہہ کر پکارا بھی گیا، تو حشر میں یہ القاب کیا نفع پہنچائیں گے، اور حیات ابدی کے حصول میں یہ کیا کام آئیں گے!

والدہ ماجدہ کی خدمت تو خیر تھوڑی بہت پھر کچھ بن پڑ گئی، لیکن والد ماجد کی خدمت کی توفیق تو ذرا بھی نہ ہوئی بلکہ فساد عقائد و فساد عمل دونوں کے باعث ان کی اخیر عمر میں ان کے لئے سوہان روح ہی بنا رہا۔ اور جب از سر نو مسلمان ہوا، تو وہ مرحوم راہیٔ جنت ہو چکے تھے، رہے دوسرے اعزہ و احباب اور سابقہ والے، تو کسی کے بھی حق ادا نہ کر سکا۔ اور عبادت کا حال تو اور بھی ابتر۔ نمازوں میں بہ جز ٹکر لگانے کے اور کیا کیا، اور روزہ میں بجز بھوکا رہنے کے، اور حج بھی الٹا سیدھا، خدا معلوم کس طرح کر کے بس ایک چھدا سا اُتار آیا۔ غرض نہ اِدھر کا نہ ادھر کا۔ سوچتا ہوں کہ اپنا حشر کیا ہونا ہے۔ لا الٰہ الا انت سبحانک اِنّی کنت مِن الظالمین۔ سوا اس کے کہ وہ ارحم الراحمین اپنے ارحم الراحمینی کا کرشمہ دکھا دے، یا اپنے رحمت عالم پیمبر اور دوسرے شافعین کو شفاعت کا اشارہ کر دے! شادی عمر کے ۲۴ ویں سال اپنی پسند و محبت

پیدا ہو جانے کے بعد کی، اور وہی عشق بہت سے اتار چڑھاؤ بڑے ہی پیچ وخم کے بعد آج تک قائم ہے ـــــــ عشق کا لفظ غلط استعمال ہوا "فریب آب وگل" کا نام عشق رکھنا، حقیقت اور لغت دونوں پر ظلم کرنا ہے۔ اور اسی کھوکھلے عشق کا حاصل حصول بقول اکبر ؎

کار جہاں کو دیکھ لیا میں نے غور سے
اک دل لگی ہے سعی میں حاصل ہیں کچھ نہیں!

دل لذت اُٹھانے پاتا بھی نہیں کہ خود لذت چھلاوہ بن کر نظر سے غائب ہو جاتی ہے!

بڑے ہی تلخ تجربوں اور خوب ہی ٹھوکریں کھانے کے بعد یہ پُر زور وصیت سارے ناظرین سے ہے کہ دنیا سے دل ہرگز نہ لگائیں، اور اس کے مکر وفریب میں نہ آئیں جس کے صدہا چہرے اور بے شمار نقابیں سہی لیکن انسان بہر حال جسم وجسد کے ساتھ ہی اس خاکدان میں بھیجا گیا ہے، اس حکمت کی بھی رعایت رکھنا لازمی ہے، دنیا کو برتئے مگر دل نہ لگایئے، تو آخرت ہی سے لگاتے رہئے، اکبر ہی کے لفظوں میں ؎

غافل نے اِدھر دیکھا' عاقل نے اُدھر دیکھا

دیکھئے، ابھی کتنی اور میعاد کاٹنا ہے، دل تو اُسی مژدہ جاں بخش کے سننے کو تڑپ رہا ہے کہ

ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

اپنے حق میں تو بس ایک ہی اور آخری دعا یہ ہے کہ بلاوا اس وقت آئے جب یہ ناکارہ اور آوارہ قلم، دین کی خدمت میں مشغول ہو، اور کسی عدو اللہ کے ہفوات کا

جواب دے رہا ہو، یا اپنے محبوب کی کسی ادا کی معرفت کی دعوت دے رہا ہو!
پڑھنے والے، رخصت! اس عالم ناسوت میں آخری سلام، ملاقات ،
بہ فراغت واطمینان ان شاء اللہ بس اب جنت ہی میں ہوگی!

تتمّہ

زندگی کا زبردست حادثہ

اصل کتاب کا مسودہ مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا، نظرثانی بار بار ہو چکی تھی کہ زندگی کا وہ مرحلہ پیش آگیا، جس کے لئے تیار ہمیشہ رہنا چاہیے، مگر نفس کبھی تیار نہیں ہونے دیتا۔

دسمبر ۶۸ء تھا کہ بیوی اپنے میکے باندے کو گئیں، جاتی ہی رہتی تھیں، میکے اور میکے والوں کو دل و جان سے عزیز رکھتی تھیں، اور اب کی جانا تو ایک خوشی کی تقریب میں جانا تھا، ان کے بھائی مرحوم (شیخ مسعود الزماں بیرسٹرایٹ لا باندا) کی دو پوتیوں کی شادی تھی، اور بھتیجے انوارالزماں صدیقی (ایڈوکیٹ) کی یہ لڑکیاں تھیں، وہ انھیں اپنی ہی اولاد کی طرح عزیز تھے۔ دسمبر کی ۷، تاریخ تھی کہ دریاباد سے کئی ہفتوں کے پروگرام پر روانہ ہوئیں، گھر سے اسٹیشن تک تانگہ پر چلیں اور میں انھیں کچھ دُور تک دیکھتا رہا۔ پردے کے اوپر سے ان کی پیشانی کا حصہ نظر آرہا تھا ——— کون کہہ سکتا تھا کہ یہ نظارہ آخری بار کا ہے۔

خدا حافظ، رخصت کے وقت اب کی بھی حسب عادت، دونوں کی زبان پر آگیا تھا۔ کفن کا کپڑا آب زمزم سے دُھلا ہوا توجہ سے اپنے ساتھ لائی تھیں، چلتے وقت

لڑکیوں سے تاکید کے ساتھ کہا کہ کفن ضرور ساتھ رکھ دینا، بھول نہ جانا میں نے خوش ہوکر داد دی کہ یہ ہمیشہ چاہیے، خصوصاً جب کہ سفر لمبا ہو، لکھنؤ اتریں، اور اپنی بڑی ہی چہیتی بہن سے ملیں، اور خوش خوش بہن بھاوج کے قافلہ کے ساتھ باندے پہونچیں، میں عین نکاح کے دن باندے پہونچا اور تیسرے دن ۳۱ر دسمبر کے سہ پہر کو واپس روانہ ہوا، چلتے وقت ان کے پاس بیٹھا تھا کہ بولیں "بس اب جاؤ، دیر نہ کرو، خدا حافظ"۔ طے یہ پایا کہ ابھی کچھ روز یہ یہاں رہ کر اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ لکھنؤ واپس آئیں گی۔ میں دریاباد پہلی جنوری کے سہ پہر کو مع حمیرا (منجھلی لڑکی) کے پہونچ گیا۔ ۲ر جنوری کو حسب معمول باہر کے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا (غالباً قرآن مجید ہی کے سلسلہ کا)، اور وقت کوئی گیارہ ساڑھے کا ہوگا کہ یک بیک موٹر کے آنے اور رُکنے کی آواز آئی، دل میں معاً آیا کہ خدا خیر رکھے یہ بلا اطلاع واجازت مجھ سے ملنے موٹر پر کون آسکتا ہے؟ اور سکنڈوں کے اندر اپنے چھوٹے داماد بھتیجے عبدالعلیم سلمہ کی روتی آواز کان میں پڑی۔ اب شک یقین سے بدل گیا، اور دل نے کہا کہ کوئی ایسا ہی سخت حادثہ ہوگیا ہے اور یہ مجھے لینے موٹر پر آئے ہیں، سوچنے کی دیر تھی کہ وہ روتے ہوتے کمرے میں داخل ہوگئے، اور اتنا کہہ سکے کہ جو خبر لے کے آئے ہیں وہ آپ سے کس طرح بیان کریں" دل پر جو کچھ گزری، اس کا علم تو بس عالم الغیب، ہی کو ہے، یہ معلوم ہوا کہ جیسے بجلی گر پڑی، مگر زبان سے بلا کسی توقف وتامل کے یہی نکلا کہ الحمد للہ، تمھارے کہے بغیر ہی میں سمجھ گیا، اللہ جس وقت کسی مسلمان کو بلاتا ہے وہی اس کے لئے بہترین وقت ہوتا ہے، ساتھ میں منجھلی لڑکی زہیرا بھی آئی۔ دم بھر کے بعد اندر مکان سے حمیرا، روتی پیٹتی آئی اور میرے گھٹنہ پر جھک گئی۔ دل پر صبر کا پتھر رکھ کر اس سے بھی کہا کہ "بس صبر کرو، جو کچھ بھی ہوا، اچھا ہی ہوا، ساری تعلیم وتربیت اسی

وقت کے لئے تھی، بس چلنے کی تیاری کرو۔

اتنے بڑے گھر کو بند کرنا، سب چیزیں اٹھا کر رکھنا، وہ بھی انتشار حواس کے عالم میں، آسان نہ تھا، لیکن بہر حال دونوں لڑکیوں نے ہمت اور صبر سے کام لیا، خاندان کی اور لڑکیاں بھی مدد کے لئے آگئیں اور جوں توں آدھ گھنٹے میں کام ختم کر، اور مکان میں قفل ڈال، لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ موٹر دریاباد سے مجھے لانے کے لئے حامدہ حبیب اللہ (مرحومہ کی بڑی ہی چہیتی بھانجی) نے دے دی تھی۔ لکھنؤ جب پہنچا تو پھاٹک ہی پر مولانا علی میاں ندوی، مولانا محمد اویس ندوی، اور مولوی ہاشم فرنگی محلی اور دو ایک صاحب اور مل گئے۔ ان مخلصوں اور اللہ کے نیک بندوں کو دیکھ کر رقت اور زیادہ طاری ہوئی۔ یہاں سے باندے تک کے لئے ہاشم سلمہ نے لاری کا انتظام کیا تھا، گھر کے اندر آیا، تو کہرام مچا ہوا تھا۔ خیر نماز ظہر پڑھی، لاری کو سرکاری اجازت نامے کے جھمیلوں میں بڑی دیر ہوئی، خدا خدا کر کے تین بجے کے بعد گاڑی روانہ ہو گئی، اپنی لڑکیوں، لڑکوں، نواسوں کے علاوہ خاصی تعداد عزیز مردوں عورتوں کی تھی، لاری آمد و رفت کے لئے کئی سو پر طے ہوئی تھی۔

باندے کا راستہ، شیطان کی آنت کی طرح دراز، ختم ہونے ہی پر نہیں آرہا تھا، عصر و مغرب کی نمازیں اُتر اُتر کر پڑھیں، آنکھوں کے آنسوؤں کے ساتھ دعاؤں اور قرآنی آیتوں کا سلسلہ جو دریاباد سے شروع ہوا تھا۔ دھڑکا یہ لگا ہوا تھا کہ ہمارے پہنچتے پہنچتے کہیں تدفین نہ ہو چکی ہو —— سسرال کا سفر تو لطف و دلچسپی کا ہوتا ہے، یوں استقبال ہوگا، یہ خاطریں ہوں گی، جوانی سے اب تک ہر بار یہی ہوتا رہا تھا آج خیال کیا آرہا تھا؟ کتنی ویرانی ہوگی! کیسی وحشت برس رہی ہوگی؟ ہنس ہنس کر

ملنے کے بجائے ہر ایک روتا ہوا ملے گا اور دیکھئے وہ بھی جو دیکھنے کو ملے، ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ ۲۰ گھنٹے انتظار کے بعد، اکتا کر کہیں میت کو لے کر نہ جا چکے ہوں! ——— خدا خدا کر کے ۱۰ بجے شب میں گھر پہنچا ——— کہاوت میں گویا آدھی رات کو!

مکان آج بھی.... گیس کی لالٹینوں سے ایک بقعۂ نور بنا ہوا اور لوگ آج بھی چل پھر رہے ہیں، مگر سب منہ لٹکائے ہوئے! کس غضب کی اداسی و ویرانی ہے! ابھی پرسوں ہی تو یہاں سے گیا تھا، کتنا پُر رونق اسے چھوڑ کر! اللہ اللہ کرتا ہوا اندر داخل ہوا، یہ در و دیوار، یہ چوکھٹ سب ہمیشہ میرے لئے کتنے دل چسپ رہ چکے تھے، ایک ایک اینٹ، ایک ایک ذرہ سے میرا یارانہ ۵۰، ۵۲ سال پرانا ہے! آج سب نے کیسا منہ میری طرف سے پھیر لیا ہے، شادی کا گھر ابھی پرسوں تک تھا، اور میرے لئے تو ہمیشہ ہی شادی کا گھر رہا ہے! اسی حیثیت سے اس کو جانا۔ دیکھا کہ ایک بغلی دالان میں جنازہ رکھا ہوا ہے ——— ٹھیک اسی جگہ ایک بچی ۷۰ سال قبل پیدا ہوئی تھی، یہیں ان کا غسل دیا گیا اور وہیں ایک نئے قسم کا لباس عروسی پہنے ہوئے، جسے دنیا کفن کے نام سے یاد کرتی ہے، پلنگڑی پر پورے سکون و وقار کے ساتھ آرام فرما ہے۔

ابھی پرسوں نرسوں ہی اسی دالان میں اسی جگہ بیٹھ کر لڑکیوں کے ساتھ ان سے بھی خوب باتیں رہی تھیں! ہا! دنوں میں نہیں گھنٹوں کے اندر کیا انقلاب ہو گیا! کون کہہ سکتا تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے!

حکم آیا خموشی کا تو رہی حشر تلک چپ
ہیبت ترے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے!

میں بد نصیب، رات میں روشنی کے باوجود اپنے ضعف بصارت کے باعث چہرہ

بھی واضح طور سے نہ دیکھ سکا، رنگ روپ کچھ نہ معلوم ہوا، صرف اتنا نظر آیا، جوانی ہی کے چہرہ کی طرح بھرا ہوا اور گول ہے، ضعیفی کے زمانے کا سا پچکا ہوا اور دُبلا نہیں ہے دوسروں کا بیان ہے کہ چہرے پر مسکراہٹ اور رونق بھی تھی۔

اب جمعرات کا دن گزر کر رات کے دس بج چکے تھے، معلوم یہ ہوا کہ کل شب میں اچھی طرح بات چیت کرتی، قریب گیارہ کے لیٹیں، بارہ بج کر کچھ منٹ پر بڑی لڑکی (کہ دہ؟ ساتھ تھی) کو اُٹھا کر کہا کہ سانس پھول رہی ہے، یہ شکایت رات کو اکثر ہو جایا کرتی تھی' اور کچھ منٹ میں طبیعت ٹھیک ہو جایا کرتی، اب کی بھی یہی سمجھی، اتنے میں کلمہ شہادت دوبار پڑھا۔ بھتیجے ڈاکٹر اشرف الزماں گھر ہی میں تھے، جگا کر لائے گئے، انھوں نے کوئی گولی کھانے کو دی، بیٹھی ہوئی تھیں، گولی ہاتھ میں تھی کھانے کا ارادہ کر رہی تھیں۔ اگالدان کی طرف اشارہ کیا کہ اسے لاؤ، اور جسم ایک طرف کو جھکنے لگا کہ جیسے کسی کو گہری نیند آرہی ہے، ڈاکٹر اشرف دوڑتے ہوئے اپنے کمرے کو گئے کہ انجکشن لے کر میں ابھی آیا، اللہ کا فرشتہ ان سے بھی قبل پہونچ گیا، جب وہ واپس دوڑتے ہوئے آئے تو جسم کو دیکھ کر روتے ہوئے بولے کہ اب دوا کا وقت گزر چکا ہے، سارے عزیز جاگ چکے تھے، رونے پیٹنے کے ساتھ کلمہ کی آوازیں بھی ہر زبان سے گونج رہی تھیں ـــــ غسل، تکفین وغیرہ ہر چیز اسی طرح جیسے ایک مومنہ کی ہونی چاہیئے تھی ہوئی۔ آب زمزم سے دُھلا ہوا کپڑا جو کفن کے لئے ساتھ لائی تھیں اور جو تقریباً ۱۴ سال سے ساتھ تھا، اب کام آیا، ایک غسالہ کا بیان ہے (دوسروں کی تصدیق کے ساتھ) کہ حالت غسل میں نمایاں مسکراہٹ چہرہ پر دیکھی، جو کچھ دیر قائم رہی، اور چہرہ بھی خود بخود قبلہ رو ہو گیا۔ جی بہت چاہا کہ چہرہ

ابھی کچھ دیر اور دیکھنے کو ملے، لیکن کیا کرتا، ۲۲ گھنٹے یوں ہی گزر چکے تھے، کب تک روکے رکھتا، جیسی آواز بھی ممکن ہوئی، پکار کر کہا "بس اب دیدار جنت ہی میں ان شاء اللہ ہوگا" یہ کہا اور پلنگڑی کو خود بھی ہاتھ لگایا اور ڈولے کو کاندھا دیتا ہوا چلا، کون جانتا تھا کہ یہ منظر بھی پیش آکر رہے گا، اس منزل سے بھی گزرنا ہوگا! میرے لئے موٹر کا انتظام تھا، قبرستان پہنچے تو دیکھا کہ جگہ اپنی عبادت گزار ماں کے بالکل پہلو میں ملی ہے، اور پائنتی اپنا معصوم چھوٹا بچہ ہے! نماز بھی خود ہی پڑھائی۔ ایسے ناوقت اور شدید سردی کے موسم میں نمازیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی، کئی صفیں تھیں، نماز میں دعائیں تو ظاہر ہے کہ وہی پڑھیں جو ماثور و مسنون ہیں، البتہ تحت الشعور میں الفاظ کچھ اس طرح کے زبان پر آتے رہے۔

"الٰہی تیری بندی تیری طلب پر حاضر ہوگئی، اس کے اعمال واطوار تجھ پر خوب روشن ہیں، صرف اتنا عرض کرنے کی اجازت ہو، ۵۲، ۵۳ سال کا رفیق جانتا ہے کہ بندی ترے حکم پر صابر وشاکر بہرحال رہی اور تیرے رسولؐ کے نام کی عاشق تھی، مجھے اور میرے والوں کو خوش کرنے میں برابر لگی رہی، اور میرے معاملہ میں اس سے جتنی کوتاہیاں دانستہ یا نادانستہ ہوئیں ان سب کو دل سے معاف کرتا ہوں، تجھ سے بڑھ کر شفقت ورحمت کا معاملہ کرنے والا آقا اور کون ہو سکتا ہے، اب تو جانے اور تیری یہ بندی"!

قبر میں اب کیا کہا جائے کہ کس دل سے اُتارا، زبان سے تو صرف یہ نکلا بسم اللہ وباللہ وعلیٰ ملت رسول اللہ اور آیت کریمہ منہا خلقناکم وفیہا نعیدکم

ومنہا ان خرجکم تارۃً اخریٰ۔

نمازِ عشا اس کے بعد گھر آکر پڑھی ـــــ ہائے، کیا رات آج کی رات بھی تھی ایک رات وہ بھی تھی جون ۱۶ء کی جب یہ نعمت پہلی بار ملی تھی، اور ایک رات آج کی ہے جب یہ نعمت واپس لے لی گئی! کریم و حکیم کی بخششیں اور کرم اور حکمتیں کون جان سکتا ہے! ـــــ شاعری اور خیال بندی ختم ہوئی، اب سامنا ٹھوس حقیقتوں کا ہے!

آج سے اپنی موت کا انتظار سا اس لئے شروع ہو گیا کہ برزخ میں پھر ایک بار یہی نعمت ان شاء اللہ نصیب ہو گی، اس سے کہیں زیادہ جمال و کمال کے ساتھ! اور اب اس کے ختم ہونے کا اندیشہ کبھی بھی نہ ہو گا! ـــــ مولا کو انعام و اکرام و بندہ پروری کے کتنے ڈھنگ معلوم ہیں ؎

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد
انچہ در وہمت نیاید آں دہد

دوسرے دن صبح قبر پر جا کر خوب رویا اور مناجات بہ آواز بلند کی کہ لڑکیاں اور مرحومہ کے بھتیجے بھی ہمراہ تھے، سب سُن سکیں، خاصی دیر تک یہ مجلس گریہ قائم رہی۔

ہنسی اس دن سے آنا تو جیسے غائب ہی ہو گئی۔ آج یہ سطریں آخر جولائی میں لکھ رہا ہوں، کم سے کم چھ مہینے کے عرصہ میں ایک بار بھی نہیں آسکی ؎

دیر میں یا حرم میں گزرے گی
عمر اب ترے غم میں گزرے گی!

الہ العالمین! دل پر اور آنکھوں پر تو نے قابو نہیں دیا ہے، دل پر جو کچھ گزر رہی

اور برابر گزر رہی ہے، سب تجھ پر روشن ہے، آنکھوں سے آنسو بہتے رہے اور اب بھی وقتاً فوقتاً بہتے رہتے ہیں، تجھ سے مخفی نہیں، البتہ زبان پر اختیار تو نے دیا ہے، اور بازپُرس اسی پر رکھی ہے، تو تیرے فرشتہ اور تو خود گواہ ہے کہ خبر صاعقہ اثر کان میں پڑتے ہی اس نامہ سیاہ کی زبان پر کیا آیا؟ صرف "الحمدللہ" اور معاً یہ فقرہ کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو بُلاتا ہے، وہی اس کے لئے بہتر وقت ہوتا ہے اور اب تجھ سے یہی التجا ہے کہ جب ترے حضور میں ہم دونوں حاضر ہوں تو ایک دوسرے کے مجرم ہوں نہ ترے مجرم ہوں، محض عفو و کرم کے بھکاری بن کر آئیں اور اپنی جھولیاں گوہر مُراد اور عطیہ مغفوریت سے بھر کر واپس ہوں!

اب عمر مستعار کی مدت ہی کتنی! لیکن بہرحال جتنی بھی ہو وہ ترے دین کی خدمت اور تیرے ہی یاد میں گزرے، مرحومہ کی یاد ہزار قوی اور شدید سہی، تیری یاد اس پر غالب رہے، اور تیرے احکام کی پابندی میں کوئی غم وحزن حائل نہ ہونے پائے۔ مرحومہ کے بعد سے ہنسی چہرے پر ایک بار بھی نہیں آنے پائی، اب ہنسی آئے بھی تو اسی وقت جب تری رحمت کے فرشتے اس رُوح کو اپنے ہمراہ لئے جا رہے ہوں!

منقول از صدق جدید ۱۴؍ جنوری ۱۹۷۸ء

"حادثۂ وفات"

(حکیم عبدالقوی دریابادی)

کل تک جس کی بیماری کا حال ناظرینِ صدق اور مدیر یا نائب مدیر کے قلم سے مختلف عنوانوں کے تحت بے چینی سے پڑھتے اور صحت کے لئے گڑگڑا کر دعائیں مانگتے رہتے تھے۔ آج اس کے حادثہ وفات کی تفصیل (وفات کی چند سطری خبر پچھلے ہفتہ کے صدق میں درج ہو چکی ہے) اشک بار آنکھوں اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھنی پڑ رہی ہے۔ کل تک زبان و قلم جسے مدظلہ کہنے اور لکھنے کے خوگر تھے آج اس کو مرحوم اور رحمۃ اللہ لکھنا اور کہنا پڑ رہا ہے ؎

صورت از بے صورتی آمد بروں

باز شد انا الیہ راجعون

مدیر صدق جدید مولانا عبدالماجد دریابادی تو اُردو کے صفِ اول کے ادیب تھے جس موضوع پر قلم اٹھاتے، اولاً اس کا عنوان البیلا اور بعض اوقات بالکل اچھوتا رکھتے، پھر اس کے تحت جو کچھ لکھتے وہ ادب و انشا کے اعتبار سے شاہکار ہوتا، لیکن

ماتمی و تعزیتی مضامین میں خصوصاً ان کے عنوانات میں انھیں امتیاز خصوصی حاصل تھا۔ والدہ ماجدہ کی وفات ہوئی تو تعزیتی مضمون کا عنوان "ماں کے قدموں پر" رکھا۔ ہمشیرہ محترمہ کی رحلت پر "ہمشیرہ کی رخصتی" بڑے بھائی کے انتقال پر "ناز بردار بھائی" اور رفیقۂ حیات کے دنیا سے یکایک رخصت ہونے پر "بوڑھی محبوبہ" کے عنوانات رکھے۔ آج اس تعزیتی مضمون کو لکھتے وقت اس قسم کا کوئی سجھ میں نہیں آرہا ہے۔ سیدھے سادے عنوان "حادثۂ وفات" پر قناعت کرنا پڑ رہی ہے۔

عم محترم پر فالج کا حملہ ۱۴ر مارچ ۱۹۷۴ء یوم جمعہ کو دن گزر کر بعد مغرب اس وقت ہوا تھا جب کہ وہ معمول کے مطابق کھانا کھا رہے تھے۔ علاج اولاً ڈاکٹری ہوا۔ ڈاکٹر وجیہ الدین اشرف کے علاج سے مرض کی شدت میں کمی ہوئی۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ بعد لکھنؤ آنے پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا ہومیوپیتھک علاج شروع ہوا۔ مرض کا حملہ داہنی طرف تھا لیکن اس کے دو ڈھائی ہفتہ کے بعد صدق کے لیے دو چار نوٹ کسی نہ کسی طرح لکھنے لگے۔ مرض میں ایک حد تک نفع ہو کر پھر کہنا چاہیئے کہ وہ ایک حال پر ٹھہر سا گیا۔ اسی میں ۱۹۷۴ء گزرا اور ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء بھی۔ قیام کبھی دریاباد میں رہتا اور کبھی لکھنؤ میں۔ اس اثنا میں ایک بار دارالمصنفین (جس سے مرحوم کا تعلق بہت قدیم تھا، اور اس کے ابتدائی ممبروں میں اب صرف یہی زندہ رہ گئے تھے) جلسہ انتظامیہ میں شرکت کے لئے اعظم گڑھ اور اس کے بعد ایک بار مسلم یونی ورسٹی کے جلسہ کانووکیشن میں (جہاں انھیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دی جانے والی تھی) شرکت کے لئے علی گڑھ کا سفر بھی کیا اور بعض چھوٹے چھوٹے سفر بارہ بنکی اور بڑے گاؤں

کے بھی کیے۔ آخری بار رمضان دریاباد میں گزارے اور پورا قرآن مجید مہینہ بھر تراویح میں باوجود انتہائی ضعف کے بلاناغہ سنا۔ حافظ عبدالعلی ندوی دریابادی نے ان کو آخری بار قرآن مجید سنانے کی سعادت حاصل کرکے ان کی بڑی دعائیں حاصل کیں۔ عید کے چند روز بعد وہ دریاباد سے (جہاں کا قیام وہ کسی حال میں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے) بڑی حد تک مستقل قیام کے قصد سے لکھنؤ آئے، یہاں وسط اکتوبر ۱۹۷۶ء میں دفعتہً شب میں گر پڑنے کے باعث کولھے کی ہڈی ٹوٹنے کا سانحہ پیش آیا۔ اس صدمہ نے ان کی صحت پر اور بُرا اثر ڈالا۔ بلوچ پورہ لکھنؤ کے ہڈی کے علاج کے ماہر ڈاکٹر ابرار احمد قریشی صاحب نے حادثہ کے دوسرے ہی دن بڑی چابکدستی سے ہڈی جوڑ کر پلاسٹر چڑھا دیا اس وقت سے وفات تک مولانا کی ساری دنیا ایک کمرہ اور ایک کمرہ میں بھی ایک پلنگ نہیں چوبی تخت تک محدود ہو کر رہ گئی۔ دائیں طرف پلاسٹر لگا تھا اس لیے صرف بائیں طرف کروٹ لے سکتے تھے اور تکیہ کے سہارے کسی حد تک بیٹھ سکتے تھے۔ اس حال میں اکتوبر کا بقیہ مہینہ گزرا۔ نومبر گزرا اور دسمبر بھی گزرا۔ پڑے پڑے اجابت کا نظام مختل ہو گیا۔ پیشاب کی بھی اکثر زیادتی رہی۔ ۹ردسمبر کو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا حکیم احمد زماں صاحب قاسمی (کلکتہ)، یونس سلیم صاحب وغیرہ جو ایک شادی میں شرکت کے لئے لکھنؤ آئے تھے، مولانا کی عیادت کے لئے آئے ان سے مولانا نے بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا کہ اب میری زندگی اسی ایک تخت تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ تھوڑا بہت لکھنے کا جو کام کسی نہ کسی طرح صدق کے لیے کر لیتے تھے اس حادثہ پا کے بعد اس کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اور اب اپنے قلم سے دستخط تک کرنے میں سخت زحمت ہونے لگی۔

شروع دسمبر میں ماہانہ پنشن کے فارم پر دستخط بڑی ہی مشکل سے کر سکے۔ بعد دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کی مجلس انتظامیہ کا ایجنڈا موصول ہوا جس میں ممبران کا انتخاب بھی تھا۔ اس فارم پر دستخط اردو میں کرنا تھے۔ باربار کوشش کے بعد بہ مشکل ایسے دستخط کر سکے جن کا پڑھنا بہت دشوار تھا۔ اپنی اس بے بسی و معذوری پر قدرتاً بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ اس سے قبل باوجود صدق میں مرض کے باعث قلم رکھ دینے کا اعلان کر دینے کے بعد بھی اکتوبر ۱۹۷۶ء تک کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ لکھنے میں غیر معمولی تعب محسوس کرتے تھے اور بسا اوقات جملے نامکمل رہ جاتے تھے اور غلط لفظ (خصوصاً ملتے جلتے الفاظ کی صورت میں) قلم سے نکل جاتے تھے۔ جن کی تصحیح و تکمیل اس نااہل کو کرنی پڑتی تھی۔ اس لیے کہ وہ دوبارہ اپنی لکھی تحریر کو پڑھنے سے بالکل قاصر تھے۔ یہی حال خطوں کا تھا۔ خطوط ہر قسم کے زیادہ تر مفصل و طویل طرح طرح کے استفسارات پر مشتمل آتے تھے، ان کا مختصر جواب وہ اپنے قلم سے لکھ کر اپنی منجھلی صاحبزادی سے صاف کراتے یا اصل تحریر کے نیچے وہ اس کی عبارت (جس حد تک پڑھی جا سکتی) نقل کر دیتیں لیکن ہڈی ٹوٹنے کے بعد یہ تحریری سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

دونوں آنکھیں اصل مرض سے قبل بہت کمزور ہو چکی تھیں خصوصاً دائیں آنکھ۔ جنوری ۱۹۷۶ء میں میڈیکل کالج لکھنؤ میں ماہر چشم ڈاکٹر گرگ نے دائیں آنکھ پر نزول الماء کا آپریشن کیا اور اس سلسلہ میں پرائیوٹ وارڈ لے کر مولانا کو کچھ عرصہ میڈیکل کالج کے اسپتال میں رہنا پڑا۔ اسپتالی زندگی پر اور اپنی آنکھ کے آپریشن کے بارے میں اپنے خاص رنگ میں صدق میں کچھ لکھیں گے۔ افسوس کہ دماغی قویٰ کے روز افزوں انحطاط کے باعث اس ارادے پر اور اس قسم کے اور بہت سے تحریری ارادوں کو پورا نہ کر سکے۔

افسوس اور حسرت کے لہجہ میں بار بار فرماتے تھے کہ کون کہہ سکتا تھا کہ اب میرے لیے چند سطریں بھی لکھنا اتنی دشوار ہو جائیں گی۔ جشن ندوۃ العلماء کے سلسلہ میں جب ان کے وہ دو خطبے جو انھوں نے ندوہ کے طلبۂ قدیم کے جلسوں میں صدر مجلسِ استقبالیہ اور صدر جلسہ کی حیثیت سے پڑھے تھے۔ کتابی شکل میں مولانا علی میاں کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوئے تو اس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد بڑی حسرت سے فرمایا کہ آج کون یقین کرے گا کہ میں بھی کبھی ایسے مضمون لکھتا تھا۔

فالج میں مبتلا ہونے کے بعد بھی انھوں نے اپنے معمولات کی پابندی جہاں تک بن پڑا جاری رکھی۔ روزانہ بعد عصر ملاقات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ شروع کے شدید علالت کے چند دنوں کو چھوڑ کر پنج وقتہ نماز باجماعت کی پابندی جاری رکھی، کئی ماہ تک زمانہ قیام دریاباد میں گھر والی مسجد میں اور زمانہ قیام لکھنؤ میں گھر سے قریب ماموں بھانجے والی قبر کی مسجد میں نماز مغرب باجماعت پڑھتے رہے اور نماز جمعہ بھی انھیں دو مساجد میں ادا کرتے۔ لیکن آخر کے چند ماہ میں پیشاب کی غیر معمولی زیادتی اور اس کے روکنے پر قادر نہ ہو سکنے نیز بڑھتی ہوئی کمزوری کے باعث یہ حاضری بھی ترک ہو گئی۔ گھر میں پنج وقتہ نماز باجماعت کا سلسلہ ہڈی ٹوٹنے کے وقت تک جاری رہا۔ دریاباد میں جمعہ کی نماز میں ہی پڑھاتا تھا۔ جب مولانا وہاں ہوتے تو ان کی رعایت سے نماز و خطبہ میں بہت ہی اختصار سے کام لیتا۔ آخری بار ماہ رمضان میں قیام دریاباد میں رہا اس کے بعد عملاً مستقل قیام کی نیت سے لکھنؤ آ گئے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی مدت مرض میں بڑے عرصہ تک بلکہ کہنا چاہیئے کہ آخر تک معالج رہے۔ درمیان میں مقیم ڈاکٹر وجیہ الدین اشرف کا علاج رہا اور بالکل آخر کے چند دنوں میں تھوڑا علاج ڈاکٹر ایس کے گرگ (جو ہم لوگوں کے فیملی

ڈاکٹر کی حیثیت رکھتے تھے) کا ہوا۔

آخر دسمبر میں غالباً فالج کا نیا حملہ ہوا اور اس کا اثر زبان پر خاص طور سے پڑا اور ساتھ ہی دماغی قوتیں جن میں روز بروز ضعف آتا جا رہا تھا۔ ضعف تر ہوگئیں اور اب جو کچھ گفتگو فرماتے تھے اس کا بڑا حصہ سمجھ میں نہ آتا تھا اور اکثر دوسروں کی بات بھی سمجھ نہ پاتے تھے۔ اس صورت حال کے نتیجہ میں قدرتاً ناگواری اور جھنجھلاہٹ ہوتی تھی بعض اوقات ملنے والوں کے پہچاننے سے قاصر رہتے۔ وفات سے چند روز قبل سنجھلی صاحبزادی (اہلیہ ڈاکٹر ہاشم قدوائی) علی گڑھ سے آئیں جنھیں وہ بہت چاہتے تھے لیکن افسوس ان کو بالکل پہچان نہ سکے حالاں کہ بار بار انھیں بتلایا بھی جاتا رہا۔

قبض کی شکایت ادھر آئے دن رہنے لگی تھی۔ لیکن اس آخری حملہ سے کچھ دن قبل تو کئی کئی روز مطلق اجابت نہ ہوتی اور وفات سے پانچ روز قبل سے دواؤں کے باوجود اس کا سلسلہ بالکل بند رہا۔ تین دن قبل بالکل غفلت طاری ہوگئی۔ آخری الفاظ جو ان کی زبان سے نکلے اور سننے والوں کی سمجھ میں آتے خدا حافظ اور اللہ کے تھے۔ اس زمانہ میں نمونیا (ذات الجنب) کا اثر بھی اچھا خاصا ہوگیا۔ وفات سے چند روز قبل سینچر کو ہڈی کے معالج ڈاکٹر ابرار قریشی نے پلاسٹر کھول دیا تھا۔ کئی ہفتہ سے مولانا اس کے کھولنے کی تمنا ظاہر کر رہے تھے تاکہ چل سکیں اور گھبراہٹ۔ وا لجھن کے عالم میں بار بار چلنے کی خواہش ظاہر کرتے۔ افسوس جس وقت پلاسٹر کھلا وہ اس درجہ غافل ہو چکے تھے کہ اس کا علم واحساس بھی انھیں نہ ہو سکا۔ اس بے ہوشی یا غفلت کا سلسلہ کم وبیش تین دن رہا۔ ان دو دنوں میں غذا بالکل ترک رہی۔ دوا بھی برائے نام ہی

حلق تلے اُتر سکی۔ اس سے قبل جو انجکشن دیے جاتے تھے اس کا بھی کوئی اثر ظاہر نہ ہوا وفات کی شب میں بعد مغرب ڈاکٹر قریشی صاحب نے دیکھ کر نا اُمیدی کا اظہار کیا اور نبض کی حالت نیز دوسری کیفیات و علامات دیکھ کر مجھے بھی ان کا ہم خیال ہونا پڑا۔ بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو پوری مایوسی اس سے قبل ہی مجھ پر طاری ہو چکی تھی۔ وفات سے ایک دن قبل حسن اتفاق سے مولانا محمد طیب صاحب لکھنؤ شدت علالت کی اطلاع پاکر عیادت کے لیے تشریف لائے لیکن افسوس اس وقت مولانا بالکل غافل تھے۔

اس غفلت کے عالم میں بار بار ہاتھ کان تک اُٹھاتے اور اس کے بعد نیچے لاکر نماز کی طرح نیت باندھ لیتے۔ یہ کیفیت کہنا چاہیے کہ وفات سے کچھ قبل تک رہی۔ دو بجے طبیعت زیادہ ناساز گار دیکھ کر مجھے جگایا گیا۔ برادر عزیز محمد ہاشم اور عبدالعلیم تو کہنا چاہیئے کہ ساری رات جاگتے ہی رہے تھے۔ سوا چار بجے روح راہئ جنت ہوئی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم سب کے لیے یہ سانحہ گو اب غیر متوقع ذرا بھی نہ تھا بہت ہی سخت تھا۔ والد صاحب کی وفات کے بعد وہی اب ہمارے سب کے سرپرست اور افسر خاندان تھے۔ مولانا علی میاں ندوی کو رائے بریلی اطلاع دی گئی اور مولانا کو نماز جنازہ پڑھانے کے لیے رائے بریلی سے لایا گیا۔ وفات ایسے وقت ہوئی کہ مقامی اخبارات میں خبر شائع ہونے کا کوئی امکان نہ تھا تاہم عزیزی انیس قدوائی نے بڑی مستعدی سے ایسا سامان کر دیا کہ صبح سے آل انڈیا ریڈیو سے خبر صاعقہ اثر نشر ہونا شروع ہو گئی —— قیام گاہ خاتون منزل میں تعزیت کے لیے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ندوہ سے مولانا کا جو تعلق تھا اس کے پیش نظر اس کے طلبہ بڑی تعداد میں

پہونچ گئے۔ مولانا کی بڑی تمنا تھی کہ غسل مولانا منظور نعمانی صاحب دیں لیکن وہ بیچارے ایک عرصہ سے علیل و معذور رہتے تھے، مولوی محمد ہاشم فرنگی محلی آگئے اور انھوں نے غسل کے سارے مراحل علی احمد ہاشمی اور کارکن صدق محمد معین کی معیت میں انجام دئے۔ ساڑھے گیارہ بجے کفن پہنا کر جنازہ باہر لایا گیا ——— اس کے بعد بارہ بجے کے قریب یوپی کے وزیر اعلیٰ مسٹر نرائن دت تیواری اور وزیر اوقاف عزیز الرحمٰن صاحبان بھی آگئے۔ اس کے بعد جنازہ مولانا کے حسب وصیت دارالعلوم ندوہ روانہ ہوا۔ نماز ظہر کے بعد مولانا علی میاں کے آنے پر نماز جنازہ ندوہ کے وسیع میدان میں، ہزاروں کے مجمع کے ساتھ ادا ہوئی۔ اس کے بعد جنازہ بس پر رکھا گیا بس نماز مغرب سے ذرا قبل وطن مالوف دریاباد ضلع بارہ بنکی پہونچا۔ حادثہ کی اطلاع صبح کی ٹرین سے عزیزی عبدالقیوم کو دی جاچکی تھی، انھوں نے قصبہ میں اور آس پاس کے دیہات میں اس کا اعلان کرا دیا تھا اور قبر وغیرہ تیار کرا رکھی تھی۔ تدفین میں شرکت اور اس سے قبل آخری دیدار میت اور کاندھا دینے کے لیے اتنا بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا کہ دریاباد میں اس سے قبل کسی کی تدفین پر نہیں دیکھنے میں آیا تھا۔ بستی کے ہندو مسلمان، بوڑھے اور جوان سبھی دریاباد کے نام کو ملک اور ملک کے باہر روشن کرنے والے اس آفتاب کے روپوش ہونے پر گریہ کناں نظر آرہے تھے۔ جوار کے لوگ بھی بڑی تعداد میں آگئے تھے، وزیر اوقاف جناب عزیز الرحمٰن صاحب لکھنؤ میں جنازہ مشایعت ندوہ تک کرنے کے بعد دریاباد بھی تدفین میں شرکت کے لیے آگئے تھے۔ مجمع کی کثرت کے باعث جنازہ میں بانس لگا دیئے گئے تھے اور جنازہ مکان سے مڈل اسکول کی وسیع فیلڈ میں لے جایا گیا، جہاں دریاباد کے مرد بزرگ حافظ غلام نبی صاحب نے نماز جنازہ

پڑھائی۔ اس کے بعد مکان سے متصل مولانا کو سپرد خاک کیا گیا۔ قبر میں اُتارنے کی سعادت احقر اور محمد معین کے حصّے میں آئی۔ مٹی دینے والوں کا ہجوم دیر تک رہا۔ اسی مقام پر دفن کرنے کی وصیت مولانا نے فرمائی تھی، زندگی میں ایک بار جب مولانا علی میاں دریاباد تشریف لائے تھے تو مولانا نے مدفن کی مجوزہ جگہ جو مولانا کے کمرہ سے کہنا چاہیئے کہ متصل ہی تھی فرمایا تھا کہ اس مزار کا "مجاور" حقیقی معنوں میں یہی ہوں۔

حادثہ کا اثر راقم السطور کے قلب و دماغ پر اس قدر ہے کہ یہ بے ربط تحریر بھی کس مشکل سے سپرد قلم کرسکا ہوں۔ اب تک تعزیت کے خطوط کی بارش جاری ہے اور تین چار دن تک ماتمی تاروں کا تار بندھا رہا۔ سب سے پہلا تعزیتی تار مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا آیا۔

تدفین شب جمعہ میں ہوئی، اسی شب میں بستی کی ایک خاتون نے مولانا کو خواب میں دیکھا کہ جیسے وہ تندرستی کے عالم میں ان کے محلہ میں ان کے مکان کے قریب ٹہل رہے ہیں، اس نے حسرت سے پوچھا کہ آپ کی تو وفات ہو چکی ہے۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ قبر تو میری یادگار ہے۔ میں تو زندہ ہوں۔ اس بیماری میں مولانا کی خدمت کی سعادت سب سے زیادہ ان کی منجھلی صاحبزادی (اہلیہ حبیب احمد) نے حاصل کی۔

اللہ تعالیٰ ملت کے اس خادم مفسر قرآن کے مراتب بلند عطا کرے۔

منقول از صدق جدید ۱۴ر جنوری ۱۹۷۸ء

وصیت نامۂ ماجدی

عم محترم مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق جدید جن کو کل تک قلم مدظلہ لکھتا تھا اب صدق میں پہلی بار رحمۃ اللہ علیہ لکھنا پڑ رہا ہے۔ ان کا وصیت نامہ کئی سال قبل کا آخری بار لکھا ہوا بعض ٹکڑوں کو جو بعض خانگی حیثیت ترکہ وغیرہ کی رکھتے ہیں چھوڑ کر باقی بجنسہ شائع کیا جا رہا ہے ——— (حکیم عبدالقوی)

کلماتِ وصیّت

(۱)

پیدائش وسط مارچ (غالباً ۱۵ر مارچ) ۱۸۹۲ء کی ہے۔ مطابق شعبان ۱۳۱۰ھ۔ وصیت نامہ لکھ ڈالنے کا خیال مئی ۱۹۵۲ء مطابق شعبان ۱۳۷۱ھ میں پیدا ہوا۔ چنانچہ خوب خیال ہے کہ روتی ہوئی آنکھوں اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک مسودہ گھسیٹ دیا اس وقت سن ساٹھ سال کا تھا۔ پانچ سال بعد اسے کالعدم کر کے فروری ۱۹۵۷ء ر رجب

سنہ ۱۳۷۶ھ) میں دوسرا قلم بند کر دیا۔ عمر نے طوالت کھینچی۔ تیسری بار نظر ثانی اور ترمیم کے بعد نوبت ۲؍مئی سنہ ۱۹۶۰ء کو لکھنے کی آئی۔ یہ مسودہ بھی فرسودہ ہو گیا۔ آج ۶؍ستمبر سنہ ۱۹۷۲ء (۲۷؍رجب سنہ ۱۳۹۲ھ) کو یہ مسودہ چوتھی بار لکھ رہا ہوں۔ اب اپنی عمر کے اسّی ویں سال میں ہوں بہ حساب سال شمسی۔

بھائی صاحب نے دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء میں دفعتاً انتقال کیا۔ دل توڑنے کو یہی صدمہ کیا کم تھا کہ محبوب بیوی شروع جنوری سنہ ۱۹۶۹ء میں اپنے میکے باندے میں بالکل دفعتہً سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔ اس نے تو جھ کو بالکل ہی بجھا دیا چناں چہ آج تک ہنسی اس کے بعد ہونٹوں پر نہیں آئی ہے اور اب امید اور انتظار اس کا رہنے لگا ہے کہ دیکھئے کب اس مرحومہ کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔

(۲)

جنازہ پڑھانے کے لیے نمبر اول پر مولانا علی میاں ندوی کو رکھتا ہوں وہ نہ ملیں تو مولانا فارقلیط[۲] (ایڈیٹر الجمعیۃ) مولانا محمد اویس ندوی[۳] نگرامی ورنہ پھر کسی صالح مسلمان کو سہی۔ دریاباد والوں میں حافظ غلام[۴] نبی بھی اچھے ہیں۔ مدفن کے لیے اصل تمنا یہ تھی (حرمین شریف کے بعد) جگہ کسی مسجد کے عین دہلیز کے نیچے ملتی بلا علامت قبر کے گویا زمین دوز تاکہ نمازی اس کے اوپر سے گزرتے رہتے لیکن اس تمنا کا پورا ہونا مشکل ہی ہے اس لیے دو تین جگہیں تجویز کیے دیتا ہوں۔

---

[۱] مولوی عبدالمجید صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر [۲] مولانا محمد عثمان فارقلیط جو سنہ ۱۹۷۶ء میں مرحوم ہو چکے۔
[۳] یہ بھی چند ہی ماہ قبل سفر آخرت پر روانہ ہو چکے [۴] دریاباد میں دوسری نماز جنازہ انھیں حافظ جی نے پڑھائی

(۱) والدہ ماجدہ کے قبر کے پائینتی مگر وہاں جگہ اب کہاں ہے (۲) اپنے مکان سے متصل حضرت مخدوم آب کشؒ کی درگاہ کے اندر اپنے احاطہ کی دیوار سے متصل (۳) اس پُرانے قبرستان میں جو میاں نسیم نعمانی کے مکان سے متصل ہے انھیں کی دیوار سے لگ کر قبر پختہ نہ ہو تو بہتر ہے۔ بارش وغیرہ سے حفاظت کے لئے ٹین کی چادریں ڈالی جا سکتی ہیں۔

قبر پر نام کے بجائے صرف "ایک کلمہ گو" ہو تو بہتر ہے اور بہ طور کتبہ یہ آیتیں ضرور لکھ دی جائیں (۱) وربك الغفور ذو الرّحمة (۲) قل یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله انّ الله یغفر الذّنوب جمیعًا انّه هو الغفور الرّحیم۔

اپنے مخلصین سے طمع اس کی رکھتا ہوں کہ دعائے مغفرت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے اگر ہر روز تین بار سورۂ اخلاص کا معمول بنایا جا سکے تو سبحان اللہ۔ صالحین خصوصاً مولانا محمد زکریا صاحب (سہارن پور) مولانا محمد طیب صاحب دیوبند اور مولانا فارقلیط صاحب (الجمیعۃ والے) سے دعائے مغفرت ضرور کرائی جائے۔

اتفاق سے اگر وقت موعود وطن سے باہر کہیں آجائے تو وہاں سے لاشہ لانے کی زحمت وطوالت خواہ مخواہ نہ گوارا فرمائی جائے۔

[نمبر ۳ کا تعلق خانگی اُمور سے ہے اس لئے اس کو یہاں حذف کیا جاتا ہے]

(۴)

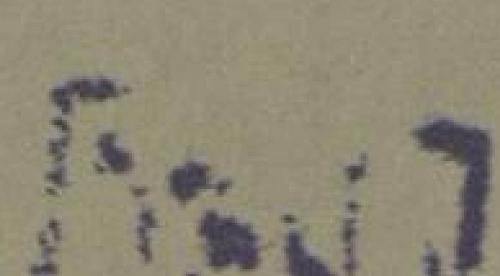
دل میں آرزوئیں ہزاروں ہیں اور حسرتیں بے شمار، اتنا اعتراف تو مجھ جیسے ناشکرے کو بھی کرنا پڑے گا کہ اللہ نے اس عمر تک اپنے ہر طرح کے لطف وکرم سے نوازے رکھا اور

ہر قسم کی نعمت سے سرفرازی دی، اپنے استحقاق و قابلیت سے کہیں بڑھ کر، اپنے کمال ستاری سے خلق میں رُسوا ہونے سے بچائے رکھا آخرت میں تو یہ صفت ستاری کہیں بڑھ چڑھ کر ہوگی وہاں کیسے اپنے فضل و کرم سے محروم رکھے گا۔

سارا بھروسہ سارا ناز، سارا اعتماد بس ایک ذات پر ہے جس نے اپنا نام العفو بھی بتایا ہے اور الغفور بھی، اور الغفار بھی، اور جس نے بے شمار شہادتیں بھی اس کی اپنے سچے رسولؐ کے ذریعہ اُمت تک پہونچا دی ہیں ورنہ اپنے اصل حال کے لحاظ سے تو جی بے اختیار یہی چاہتا ہے کہ زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں اور مخلوق میں سے کسی کو اپنا چہرہ نہ دکھاؤں اتنے دن جیا اور نہ حقوق اللہ کی ادائی کی توفیق ہوئی اور نہ حقوق العباد کی!

عزیزو، مخلصو، رفیقو، بس اب اللہ حافظ یغفر اللہ لنا و لکم انشاء اللہ العزیز ملاقات جس میں کسی قسم کا خلل نہیں پڑے گا اب جنت ہی میں ہوگی۔

[م جہ ل]



مولانا عبدالماجد دریا آبادی جامع الصفات انسان اور پیکر علم و فضل و کمال تھے۔ وہ بیک وقت ایک بلند پایہ صحافی، صاحب طرز انشا پرداز و ادیب، بے مثل طنز و نگار و فلسفی، ممتاز محقق و نقاد، مشہور مترجم اور معروف مفسر تھے۔ مشرقی اور مغربی ادب پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ متعدد علمی و ادبی، سماجی و مذہبی اداروں سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ پندرہ، سولہ برس کی عمر سے لے کر آخر عمر تک تقریباً ساٹھ پینسٹھ سال تک وہ دن رات محنت و لگن کے ساتھ علم و ادب کے سرمائے میں اضافہ کرتے رہے۔ دریا آباد میں مولانا موصوف کا مکان حقیقت میں بیت العلوم اور دانش گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جہاں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر یکسوئی و دلجمعی کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہتے۔ اس کے علاوہ وہ مستقل طور پر اپنے ہفتہ وار اخبار "صدق جدید" میں "سچی باتیں" لکھتے اور حالات حاضرہ پر اس خوبی اور بے خوفی سے تبصرہ فرماتے گویا ان کا گھر جامِ جہاں نما تھا۔ جس کے گوشہ عزلت میں بیٹھ کر مولانا دنیا جہاں کا حال دیکھ لیتے اور "کالم" میں رموز و نکات کے موتی بکھیرتے رہتے، حضرت مولانا کا یہ کالم برِ صغیر پاکستان و ہند کے تقریباً سبھی بڑے بڑے اردو اخبارات نہایت فخر و انبساط کے ساتھ نقل کرتے اور یوں قارئین کی بھاری تعداد عظیم المرتبت مولانا کی شگفتہ اور دل آویز تحریر سے لطف اندوز ہوتی۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا کا حلقہ احباب کتنا وسیع ہوگا۔ ملک اور بیرونِ ملک میں مولانا کے بے شمار جاننے والے اور چاہنے والے موجود ہیں۔ ان میں ہر طبقے، ہر فرقے اور مختلف مکاتیب فکر کے لوگ شامل ہیں۔ سبھی مولانا کا دل کی گہرائیوں سے احترام کرتے اور ان کی دلآویز تحریر سے محظوظ ہوتے ہیں۔

"**آپ بیتی**" مولانا موصوف کی آخری تصنیف ہے جو مولانا کی رحلت کے بعد منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے مولانا کی سوانح حیات بھی کہہ سکتے ہیں لیکن کتاب کے مطالعہ کے دوران آپ دیکھیں گے کہ "آپ بیتی" میں مولانا نے گزشتہ لکھنؤ کی تہذیب اور ثقافت کا تذکرہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ اپنے دوستوں احباب اور معاصرین کے بارے میں ایسی دلچسپ باتیں ایسے دلچسپ دلکش پیرائے میں بیان کی ہیں کہ ایک بار کتاب شروع کرنے کے بعد آپ پوری کتاب پڑھے بغیر نہیں چھوڑیں گے ○

مقبول احمد دہلوی

مدیر خصوصی — ماہنامہ "**حنا**" — لاہور

شاداب بک سنٹر کمرہ ۳۱۷ ع ذوالقرنین چیمبرز، گنپت روڈ، لاہور